مرزا محمد الیاس

بُنیاد پرستی اور تہذیبی کشمکش

مرزا محمد الیاس

حرا پبلی کیشنز
اُردو بازار لاہور

ناشر :- شفیق الاسلام فاروقی
طابع :- میاں محمد محسن
مصنف :- مرزا محمد الیاس
کمپوزنگ :- ہاشمی کمپوزنگ سنٹر اردو بازار لاہور
بار :- اول
تاریخ اشاعت :- نومبر ۱۹۹۳ء
تعداد :- گیارہ سو
قیمت :- ۹۶ روپے

عرض ناشر

عرض مصنف

ـــــــ حصہ اول ـــــــ

تیسرا حصہ

عرضِ ناشر

مغربی تہذیب جسے مسیحی بنیاد پرستی کا نام دیا جانا' زیادہ صحیح ہو گا' قرون وسطی کی صلیبی جنگوں بلکہ اس سے بھی قبل اسلام اور عالم اسلام کے خلاف محاذ آرا رہی ہے۔ جس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف روپ دھارے ہیں۔ جن کی تفصیل کی ان سطور میں گنجائش نہیں' البتہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب ہو یا مسیحی بنیاد پرستی' اسلام اور اسلامی اقدار ان کا بنیادی ہدف رہے ہیں۔

مغربی تہذیب' جس کی باگ ڈور اب امریکہ کے ہاتھ میں ہے' اور مسیحی یورپ اس کا دایاں بازو' روس کے زوال کے بعد اس نے اسلام کے خلاف "بنیاد پرستی" کے نام پر کھل کر سرد جنگ شروع کی ہے۔ اور اگر اسے حق و باطل کی جنگ قرار دیا جائے' تو غلط نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کے دو مندرجہ ذیل کالم پریس میں آ چکے ہیں۔

(1) امریکی انتظامیہ' عالمی صیہونیت اور مسیحی بنیاد پرستی کی گرفت میں

روزنامہ "نوائے وقت" مورخہ 15 جون 93ء

(2) تہذیبی فکری تصادم' آئندہ جنگ کا پیش خیمہ

"ایشیا" لاہور اگست 93ء

ضرورت اس بات کی تھی کہ اس موضوع پر کوئی مبسوط کتاب رائے عامہ کی راہنمائی کے لئے شائع ہو۔ اس ضرورت کو عزیز گرامی جناب الیاس مرزا نے جس محنت اور جذب دروں سے پورا کیا ہے۔ وہ قابل تعریف ہے اور ادارہ ہذا کے لئے یہ بڑا اعزاز ہے کہ مصنف نے بے حد خلوص و محبت کے ساتھ اس گرانقدر کاوش کو شائع کرنے کا حق اسے عنایت فرمایا۔ دعا ہے کہ اس کاوش کو بہ تقاضائے عالمی حالات پوری طرح پذیرائی ہو۔

مخلص

شفیق الاسلام فاروقی

اِنتساب

پڑھنے والے کے نام

مرزا محمّد الیاس
(مصنّف)

عرضِ مصنف

بنیاد پرستی آج کا اہم موضوع ہے اس کے اثرات اور اس کی سرحدوں کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے۔ ایک طبقہ کے لئے ایک رویہ بنیاد پرستی ہے' دوسرے طبقہ کے لئے وہی رویہ عین جائز اور درست ہے جبکہ ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو بنیاد پرستی کو کسی رویئے کے طور پر تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ان حالات میں اس موضوع پر قلم اٹھانا' جبکہ معاملہ بہت زیادہ اہم بھی ہو اور نازک بھی' بجائے خود ایک باہمت کام ہے۔ میں نے اس موضوع پر تحقیق اور مطالعہ کا آغاز 1991ء سے کیا اگرچہ بنیاد پرستی اس سے بہت قبل اسلامی بنیاد پرستی' مسلم بنیاد پرست اور اس نوعیت کے دیگر حوالوں سے مستعمل ہے۔ 1991ء سے آغاز کرنے سے مراد ہرگز نہیں کہ میں نے اس سال سے دنیا میں حالات و افکار کے تغیر و تبدل کو موضوع بنایا ہے بلکہ یہ اس موضوع پر کام شروع کرنے کا سال تھا جواب 1994ء میں تکمیل کے مرحلے تک پہنچا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں بہت ہی اہم مباحث پر بات نہیں کر سکا اور چند ایک مباحث ہی اس کتاب میں آ سکے ہیں۔ لیکن اس کتاب کے مطالعے سے ان مباحث کے بارے میں اشارات ضرور فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ہی کتاب کے قالب میں اس وسیع موضوع کا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں اور کسی حد تک درست بھی نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب پر اہل علم کی طرف سے سیر حاصل بحث ہو گی۔ میں نے اخذ و تجزیہ سے جو کچھ حاصل کیا وہ سپرد قلم کر دیا۔ اس کام میں مجھے کس حد تک کامیابی ہوئی اس کا فیصلہ تو قاری ہی کر سکتا ہے تاہم اس کام میں نئی راہوں کا تعین اور نئے مباحث پر گفتگو کے لئے بہرحال اہل علم ہی رائے دے سکتے ہیں' مجھے امید ہے کہ یہ رائے ضرور ملے گی۔

بنیادپرستی اور تہذیبی کشمکش" کا موضوع اختیار کرتے ہوئے میرے پیش نظر محض ایک کتاب لکھنا کبھی بھی نہیں تھا۔ میں اس بات پر گہرا یقین رکھتا ہوں کہ کتاب کا مصنف کہلانے کے لئے کتاب لکھنا ایک بے معنی اور لاحاصل کام ہے جو جلد ہی

تحلیل ہو جاتا ہے۔ لکھنے والے کو اس بات پر ضرور توجہ دینا چاہیے کہ اس کی تحریر اور تجزیہ سے پڑھنے والوں کے اذہان پر پڑنے والے اثرات کا احساس ہونا بھی ضروری ہے۔ پڑھنے والے کا حق ہے کہ اسے اچھی، مدلل اور راہنما بات ملے تاکہ اسے وہ اپنی زندگی میں شامل کر سکے یا اس کی روشنی میں نئے راستے تلاش کر سکے جو علم و عمل کی دنیا میں اس کی راہنمائی کر سکیں۔

مجھے بخوبی احساس ہے کہ بعض حلقوں کے نزدیک بنیاد پرستی کوئی ایسا موضوع ہی نہیں ہے جس پر سنجیدہ کام کیا جا سکے۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس کتاب کی تیاری، معلومات، کی فراہمی، تبادلہ خیالات کے ذریعہ حالات اور افکار کی وضاحت اور اس نوعیت کے دیگر اہم امور میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ہمارے ہاں ایک طرح کی علمی بے رغبتی بہت اثرات رکھتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب سے دین سے دنیا الگ ہوئی ہے، دین والے دنیا کے علوم کے بارے میں، اس کے رویوں کے بارے میں زیادہ معلومات، زیادہ تردد اور زیادہ جدوجہد کرتے نظر نہیں آتے۔ جو اصحاب کام کرتے ہیں انہیں حلقوں میں تقسیم کر کے ان کے کام کو محدود کر دیا گیا ہے حالانکہ یہ اصحاب کبھی بھی کسی ایک مکتبہ فکر کی ملکیت نہیں ہو سکتے یہ پوری امت مسلمہ کی متاع ہوتے ہیں، فرقے، طبقے، حلقے اور رویئے کے بندھن اور حدود ان کے لئے ایسے ہی ہیں جیسے کھیت کو پانی کی ضرورت ہو اور اس کے گرد موجود پانی کو بندھ باندھ کر کھیتی کو سیراب ہونے سے روک دیا جائے۔ دوسرا رویہ بھی ایسا ہی ہے دنیا کی نمائندگی کا دعویٰ رکھنے والے اصحاب نے دین کو ہر کام میں نشانہ بنانا فرض کرلیا ہے کہ اس کے بغیر اس کی یا ان کی "تحقیق" مکمل نہیں ہو گی اس میں اعتبار کی کمی رہ جائے گی "سیکولر" نہیں بن سکے گی۔ یہ دونوں رویئے معذرت خواہانہ ہیں اور دونوں اپنے اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دوری کو، اس فاصلے کو، اس اجنبیت کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ علمائے دین اور جدید علوم کے ماہرین بالاتفاق اس بات کا اہتمام کریں کہ ہدایت و راہنمائی کا اصل سرچشمہ قرآن و سنت ہے جو امور طے شدہ ہیں

انہیں متنازعہ نہ بنایا جائے' جو مسائل جدید دور کے تقاضوں سے ابھرتے ہیں ان کا حل تلاش کرنے میں نہ تو عالم دین اس میں ہتک محسوس کرے کہ وہ کسی "پروفیسر" یا "مفکر" سے رابطہ کرے اور نہ ہی جدید علوم کی راہنمائی کا دعویٰ رکھنے والے عالم دین سے رابطہ کرنے میں اپنے لئے کوئی خلاف شان جذبہ دل میں رکھیں۔ بصورت دیگر بنیاد پرستی ایک رویہ بنتا جائے گا جو اپنے اظہار کے لئے اس دوئی کو استعمال کرے گا اور نقصانات کا اندازہ اصل خرابی سے بہت ہی کم رہ جائے گا۔

اس وقت "نظریہ" "انسان" "آزادی" "حقوق" "جدوجہد" اور اس نوعیت کی دیگر اصطلاحات کے بہت سے مفہوم موجود ہیں۔ میں نے اس کام میں ان موضوعات کو عام آدمی کے حوالے سے اختیار کیا ہے لہٰذا اسے اسی تناظر میں دیکھا جائے

اس کتاب کا اصل مقصد اہل اسلام کو مغرب یا مغربی تہذیب کی جانب سے اسلام کو مدمقابل قرار دے کر اس سے الجھنے کی راہ کی نشاندہی کرانا ہے اور انہیں یہ باور کرانا ہے کہ وہ اپنے لئے مغرب کے طے کردہ معیار کے بجائے قرآن و سنت کے طے کردہ معیارات اختیار کریں۔ ہمیں مغرب یا مغربی تہذیب سے تصادم نہیں کرنا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بنیاد پرست کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اس لئے محض جذبات میں آ کر' عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے یا کسی بھی حوالے سے اسلام' مسلمان اور اسلامی نظام کے لئے اس اصطلاح کو کسی بھی مفہوم میں قبول کرنا میرے خیال میں درست نہیں ہے۔

اس کتاب کی تیاری کے دوران میں مجھے بہت سے اصحاب کی راہنمائی میسر رہی۔ ان سب کا یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم ان کا شکریہ میرے ذمہ ہے جو اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ میں ساری زندگی ان کا مشکور رہوں گا۔ اس کتاب کی اشاعت کا ذمہ محترم شفیق الاسلام فاروقی صاحب نے اٹھایا۔ انہیں خود بھی اس موضوع سے خاص شغف ہے' وہ اس سے متعلقہ موضوعات پر لکھتے بھی رہتے ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اپنے دیگر کاموں

پر اسے ترجیح دی ہے اور اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی رائے' مشورہ' مباحث اور راہنمائی کا میں ہمیشہ منتظر رہوں گا۔

شکریہ

مرزا محمد الیاس

۱

"بنیاد پرستی" ——— معنی و مفہوم

"بنیاد پرستی" (Fundamentalism) دور حاضر میں احیائے اسلام کی تحریکوں، مسلمانوں میں اصلاحی کوششوں اور اسلام کے بطور نظام زندگی متعارف کرانے کی کاوشوں کے لئے استعمال کی جانے والی اصطلاح ہے۔ اس کا کثرت سے استعمال اور اس کے ذریعے مسلمانوں میں پست اور شکست خوردہ جذبات پیدا کرنا اصل مقصد ہے تاکہ مسلمانوں کو پراگندہ خیال، متفرق اور بے وزن کرکے ان کی عمل کی صلاحیت، قوت فیصلہ اور عالم اسلام کے لئے وسیع تر منصوبہ بندی کے رجحانات کو روکا جاسکے۔ اے آر فرا لیکن برگ بنیاد پرستی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" جب ہم کہتے ہیں کہ احیاء کی تحریکیں ایک خاص نہج پر انقلابی کردار رکھتی ہیں تو ہمارا اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں نہ صرف ایک انداز سے "قدامت پسندی" کے خلاف ہوتی ہیں بلکہ وہ ایک خاص سمت میں انقلابی بھی ہوتی ہیں۔ وہ "ماضی کی طرف لے جانے والے انقلاب" یا ردعمل کی بات کرتی ہیں۔ وہ ایسی صورتحال پیدا کرنا چاہتی ہیں جو پہلے کبھی خیال کی گئی تھی لیکن کبھی وجود میں نہ آئی تھی۔ مزید برآں اگر رومانوی ہوں تو وہ ایسی فعالیت کے لئے کام کرتی ہیں جو کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔ بنیاد پرست ایسی صورتحال کے پیدا کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں جو کسی سنہری دور سے وابستہ تھا۔ ردعمل کا ایسا اظہار دراصل پرجوش قدامت پسندی کی علامت ہے۔ ایسی قدامت پسندی جسے دوبارہ دریافت کرنے کے عمل سے موسوم کیا جاسکتا ہے کہ ایک چیز کو پرانے خیالات کے ساتھ نئے دور میں لایا جائے اور انتہا درجے کی قدامت پسندی کسی ایسے مقصود کو دوبارہ حاصل

کرنے یا حاصل کرنے کی کوشش کرنے کا نام ہے جو کبھی شاندار حیثیت کا حامل رہا ہو۔ قدامت پسندی کسی موجودہ خطرے کو ماضی کے ایک موہوم خیال میں چھپے احساس سے کم کرنے کا نام ہے۔ یہ سلامتی کو لاحق خطرے کی نشاندہی بھی کرتی ہے اور یہی بنیاد پرستی ہے۔ اسے کہا جائے گا کہ "بنیادوں کی طرف واپس لوٹنا"۔ یہ انتہائی انقلابی قدم ہے جسے شدید ردعمل بھی کہا جاسکتا ہے یا جیسے بھی حالات ہوں ان کے مطابق اسے کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ زبردست انقلابی ـــــ یا زبردست متعامل قوت۔" ۱؎

مستشرقین کے مطابق بنیاد پرستی جمہوری قدروں کی بیخ کنی کرنے کا عمل ہے۔ بنیاد پرست قانون کی حکمرانی کا دشمن اور جمہوریت کش کردار کا حامل ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت ایک ایسے دشمن کی تلاش میں رہتا ہے جس کے وجود، افکار و نظریات کے خلاف وہ جنگ کرسکے۔ اپنے زیر اثر انسانوں کو اس جنگ میں شریک کرے اور اس جنگ کا دائرہ بڑھا کر حالات کو جنگل کے دور کے انسان کے حالات کے مطابق ڈھال دے۔ بنیاد پرست ہنگاموں میں خوش رہتا ہے اسے ہر طرف لگی آگ میں ٹھنڈک ملتی ہے۔ وہ آبادیوں کو جلا کر سکھ کا سانس لیتا اور راکھ میں سے اپنے تصورات کے کندن تلاش کرتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کا امن و سکون، مسرت و راحت اسے کانٹوں کی طرح کھٹکتا ہے۔ وہ انسان کو انسان سے اور آرام و آسائش کے لمحوں سے جدا کردینا چاہتا ہے وہ سماج کا ایک ایسا دشمن ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ فساد کا بیج بوتا ہے۔ اپنے چیلے چانٹوں کو اس فصل کو پانی دینے اور اس کی بڑھوتی کے لئے مقرر کرتا ہے۔ ترقی کا دشمن یہ فرد فصل تیار ہونے پر سماج کے تمام بندھوں کو توڑ دیتا ہے اور تخریب کے ایسے عمل کو رواج دیتا ہے جو انسانوں کو گھروں میں بے چین، دلوں میں بے قرار اور روحوں میں اضطراب کے حوالے کردیتا ہے۔ اگر اسے ضروری زمین میسر نہ ہو تو یہ سالوں زمین کے زرخیز ہونے کا انتظار کرتا ہے یوں یہ عرصہ امن و آشتی سے گذرتا ہے لیکن جونہی وہ محسوس کرتا ہے کہ زمین زرخیز ہے، ہل تیز ہے اور بیج تیار ہے تو ذرہ برابر نہیں چوکتا اور حملہ آور ہوجاتا ہے۔

اسلام کے خلاف بنیاد پرستی کی اصطلاح استعمال کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اسلام ترقی کا دشمن ہے۔ آج کی مسلم دنیا اس کی مثال ہے۔ آج کی مسلم دنیا تیز رفتار ترقی کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ مسلم آبادی آج بھی راہنمائی کے لئے ماضی کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ

اپنے مسائل کے حل کے لئے جدید ترین علوم سے فائدہ نہیں اٹھا رہی اور نہ اٹھانا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کا موقف ہے کہ اسلام کے پیروکاروں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ کب کا ختم ہوچکا ہے اور اسلام کا روائتی کردار دوبارہ اختیار کرنا دراصل ترقی کی مخالف قوتوں کا ساتھ دینا ہے۔① اسلام دنیا کے نہ بدلنے پر یقین رکھتا ہے۔ ② اسلام کو حتمی اور برتر دین سمجھا جاتا ہے۔ ③ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کامل نمونہ اور بہترین اسوہ قرار دے کر ان کے کردار کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس بنیادی کردار کے ساتھ اسلام کے پیروکار یا بنیاد پرست اسلام کی دی ہوئی روایات کا احیاء چاہتے ہیں اور موجودہ معاشرے کو ختم کرکے یہاں چودہ سو سال قبل کا روایتی معاشرہ برپا کرنے کے لئے کام کررہے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جس میں ترقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سماجی فلاح' اقتصادی بہتری فضول چیزیں ہیں۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح استعمال کرنے والے مزید کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے ذہن پر ماضی اس قدر سوار رہتا ہے کہ وہ اسے حال بنانے کی کوششوں میں مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کرتا اور انسانیت کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔

مغرب کے خیال میں اسلامی انقلاب دراصل مسلمان علماء کرام کی نفسانی خواہشات کا مظہر ایک ایسا نعرہ ہے جسے بلند کرکے وہ اپنے اردگرد سادہ لوح مسلمانوں کو جمع کرتے ہیں۔ ان کی توانائیوں کو استعمال کرکے طاقتور بنتے ہیں اور اس طاقت کو اپنی حکومتوں کو بلیک میل کرنے کے لئے استعمال کرکے ذاتی مفادات سمیٹتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں سے عدم واقفیت نے مغرب کو صحیح جائزہ لینے کے عمل سے بھی تہی کردیا ہے۔ وہ اسلامی تحریکوں کو مغربی تہذیب کے خلاف ایک ایسا روعمل قرار دیتے ہیں جس کا مقصد محض مغربی تہذیب کی مخالفت اور بیخ کنی کرنا ہے ورنہ خیر کا کوئی پہلو ان کے عمل سے ظاہر نہیں ہوتا۔

امام حسن البنا شہید اور سید ابو الاعلی مودودی علیہ الرحمتہ کی برپا کی ہوئی اسلامی تحریکوں نے مغرب اور اس کے حواریوں کی نیندیں حرام کی ہیں۔ وہ انہیں ایسی قوتیں خیال کرتے ہیں جنہوں نے مسلم معاشروں کے روایتی علماء اور علماء سو کے خلاف مسلمانوں کو اٹھ کھڑے ہونے کا درس دیا ہے۔ مغرب کے خیال میں یہ دو شخصیتیں اپنے دور کے علماء کے کردار سے نالاں تھیں اور ان کا خیال تھا کہ اسلام کے عام فہم تعارف میں یہ علماء سو اور روایتی مولوی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے رائے عامہ کو اسلام کے حقیقی مفہوم سے آگاہ کرنے

کے لئے تجدید و احیائے دین کی جدوجہد ضروری ہے وہ علماء سے اس لئے بھی نالاں تھے کہ ان علماء نے اسلام کو عام آدمی کے لئے ایک مقدس صحیفہ بنا کے رکھ دیا ہے وہ اپنے روزمرہ کے مسائل کے لئے اسلام سے نہیں بلکہ ان علماء سے رجوع کرتا ہے اور جب ان علماء سے اسے متفق علیہ جواب نہیں ملتے تو وہ اسلام سے برگشتہ و بدظن ہونے پر اتر آتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کو عام آدمی تک اس کی زبان اور لہجے میں پہنچایا جائے۔

مستشرقین کے مطابق اسلام میں جہاد ایک ایسا رکن ہے جو مسلمانوں میں دنیا پر غلبے کا جذبہ ابھارتا ہے۔ جو جنت کی حوروں کی یاد دلاتا ہے اور دنیا بھر میں لوگوں کے امن و آشتی کو تہہ و بالا کرنے کا درس دیتا ہے۔ اسلام کی غلط تعبیر کرنے والے ان مستشرقین کے مطابق مسلمان ہر حالت میں جہاد کے لئے کمربستہ رہتے ہیں۔ دنیا کو فتح کرنے کا خواب مسلسل دیکھتے ہیں اور یہی اسلامی احیاء کی تحریکوں کا روح رواں عنصر ہے جس کی بیخ کنی ضروری ہے۔

"بنیاد پرستی" کے علاقوں میں جنوبی ایشیا' شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ مصر کے بارے میں مغرب کا خیال ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جو اسلامی جہاد کا سب سے زبردست مرکز رہا ہے۔ مغرب کے مفکرین نے 1970ء کے بعد سے اب تک مصر کے مطالعے میں جن امور کو توجہ دی ہے ان میں جمال عبدالناصر کے دور میں اسلام اور عرب قوم پرستی میں جنگ 1967ء کی شکست اور اس کے مذہبی و ثقافتی اثرات' سادات کا حکومت میں آنا اور ناصر کا خاتمہ' سادات کی مذہبی اور ثقافتی پالیسیاں اور اس کے دور میں مذہب کی حالت خصوصاً" اہمیت کی حامل ہیں۔

مزید برآں دشمنان اسلام کا خیال ہے کہ احیائے اسلام کی تحریکیں دراصل ایک ایسا ردعمل ہیں جو یورپی اقوام کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے خلاف وجود میں آتی ہیں۔ ان یورپی اقوام میں پرتگال' ہالینڈ' برطانیہ اور فرانس شامل ہیں چونکہ یہی وہ یورپی اقوام ہیں جو نو آبادیاتی قوتوں کی حیثیت سے مسلمان علاقوں میں موجود رہی ہیں۔ اس لئے ان علاقوں سے ہی اسلامی احیاء کی تحریکوں نے تیز رفتار کام کا آغاز کیا ہے۔ عرب کے مرکز میں "محمد بن عبدالوہاب کی وہابی ازم" برصغیر پاک و ہند میں "سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین" اور شمالی نائیجیریا میں "عثمان دان فدیو کی تحریک" ' بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک

اور "سماٹرا" کی تحریک اہم ہیں جبکہ "جمال الدین افغانی کی پین اسلام ازم" تیونس میں خیر الدین اور مصر میں محمد عبدہ' "رشید رضا کی سلفی ازم" حسن البنا کی اخوان المسلمون بھی ان "بنیاد پرست" تحریکوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام کے انقلابی افکار پر کام کرنے والے مسلمان زعماء بھی مغرب نے اسی فہرست میں شامل کئے ہیں جن میں سید قطب شہید اور ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں۔ آخر الذکر سید قطب شہید اور مولانا مودودیؒ کے ان خیالات سے مغرب اور اس کے حواریوں کو سخت چڑ ہے کہ یہ دو اصحاب مغرب کی تہذیب کو اجتماعی جاہلیت قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس کی کوکھ سے اشتراکیت' قوم پرستی' سرمایہ داری' لادینیت اور نام نہاد جمہوری عمل نے جنم لیا ہے۔

یورپ کی اصل کوشش یہ ہے کہ جس "نظام زندگی" کو اس نے اختیار کر رکھا ہے۔ ساری دنیا اسے اختیار کرلے۔ اس کی مزاحمت نہ کی جائے۔ جدید سائنسی ترقی کو انسانیت کی معراج سمجھا جائے اور حقیقت تو یہ ہے کہ یورپ خود کو ایک مجسم نظام کے حوالے سے پیش کرکے جو نمونہ سامنے لاتا ہے وہ بنیاد پرستی کی ان تمام تعریفوں پر پورا اترتا ہے جو اس نے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے تیار کی ہیں۔ انسانی زندگی کی بے و قعتی' خاندانی نظام کی بربادی' سماجی رابطوں کی مادی تعبیر' دولت کی سرمایہ دارانہ تقسیم' اختیارات کا ایک طبقے میں ارتکاز' نسلی و لسانی فسادات' ایک یورپی قوم کی دوسری یورپی قوم پر برتری کی خواہش' ترقی کو خود تک محدود کرکے رکھنا اور ٹیکنالوجی کے ذریعے قوموں کو بلیک میل کرنا' یہ سارے وطیرے یورپ کے ہیں۔

"مشنری کھلم کھلا کہتے ہیں کہ اسلام رجعی اور متاخر ہے کیونکہ اس کے ماننے والے رجعی اور پسماندہ ہیں اور مسیحیت ترقی یافتہ اور مہذب ہے کیونکہ مذہبی دنیا مہذب اور ترقی یافتہ ہے۔)

مستشرقین (یہ وہ مشنری ہیں جنہوں نے اپنے مشنری ہونے پر پردہ ڈالنے کے لئے علمی بحث کا لبادہ اوڑھ لیا) نے کہا کہ رجعیت اور تاخر خود اسلام میں ہے اور اسی نے اپنے ماننے والوں کو تنزل اور پسماندگی میں مبتلا کیا ہے کیونکہ اسلام ترقی کا مخالف ہے' نہ ترقی کرتا ہے نہ ترقی کرنے کی اجازت دیتا ہے (شاید وہ یہ بھی کہتے ہوں کہ اسلام جہالت اور اسباب قوت کے نہ اپنانے کا درس دیتا ہے)

پھر ان کے مسلمان شاگرد فکر' صحافت' ادب اور سیاست کے علمبردار بن کے آئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ہمیں اس غیر ترقی پذیر' رجعی اور متاخر مذہب کو چھوڑ دینا چاہیے تاکہ ہم ترقی کر سکیں۔ تاکہ ہم علم' قوت' ترقی اور حکومت حاصل کرکے یورپ جیسے بن سکیں۔

اسلامی دنیا کی نئی نسلوں میں یہ زہریلا پرچار کیا جاتا رہا تاکہ ایک خاص مقصد حاصل کیا جاسکے۔ کہ ہم متاخر ہیں کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور یورپ تہذیب یافتہ ہے کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

پھر جب زمانے نے پلٹا کھایا تو مشنریوں کے اقوال اوجھل ہوگئے اور خود مشنری پس پردہ چلے گئے کیونکہ وہ اب اپنے مسلمان شاگردوں سے مطمئن ہوگئے تھے کہ وہ ان کی طرف سے اس کام کو سرانجام دیتے رہیں گے "۔ 2

یورپ کے بانجھ پن کی حقیقت بیان کرتے ہوئے سید قطب شہید نے درست لکھا ہے کہ

"جب یورپ کی عقلیت تک مسلمانوں کا واقعی اور تجرباتی طریقہ کار پہنچا تو مغربی فکر بھی علمی اور تجربی بحثوں میں مصروف ہوگئی۔ اس علمی تحقیق کے نتیجہ میں نئے نئے فلکی' جغرافیائی اور طبعی حقائق سامنے آئے۔ جو اس مجموعہ اوہام' دیومالا اور خرافات کے برعکس تھے جن کو کلیسا نے اپنایا ہوا تھا اور جنہیں وہ مقدس حقائق بتاتا تھا۔ حالانکہ ان خرافات کا عیسائی مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ اس زمانے میں پھیلے ہوئے لوگوں کے غیر علمی افکار تھے اللہ کے نازل کردہ نہیں تھے۔ انہی افکار کو کلیسا نے اپنا لیا اور اس طرح ان کی مدافعت کرنے لگا۔ جیسے یہ بھی عقیدہ کا ایک جزو ہوں۔

کلیسا نے اندلس اور مشرق کی اسلامی ثقافت سے پھوٹنے والی اس نئی رو کے بالمقابل نہایت سخت موقف اختیار کیا اور یورپ کے جو سائنس دان اس چشمے سے سیراب ہوئے ان کی تحقیقات کا کلیسا نے نہایت سختی سے مقابلہ کیا اور انتہائی وحشیانہ طریقے پر اپنے اقتدار کو ان کے خلاف استعمال کیا۔ جس کے نتیجہ میں کلیسا اور کلیسا کے اس خدا سے بیزاری پیدا ہوئی جس خدا کے نام پر کلیسا خوب خوب جھوٹ بولتا اور بہتان تراشی کرتا تھا۔ لوگ مذہب کے سائے سے بھی بیزار ہوگئے۔ مذہب کے اعتراف اور اس کے سامنے جھکنے

کے معنی کلیسا کے ظالمانہ اور جابرانہ اقتدار کو تسلیم کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کے ہو گئے۔

اسی وجہ سے بیسویں صدی کے شروع تک مذہب و سائنس میں سخت ترین تفریق قائم ہو گئی۔ لوگوں کی --- اور سائنس دانوں کی بالخصوص --- مذہب بیزاری کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے شیر کو دیکھ کر گدھے بھاگ کھڑے ہوں۔۔۔۔۔۔ بیسیوں صدی کے شروع میں جب لوگ چار صدیوں کے طویل اور پرمشقت بیابانی سفر کے بعد سانس لینے رکے تو انہیں شدت سے روحانی خلا محسوس ہوا تو کسی قدر مذہب بیزاری میں بھی کمی واقع ہوئی۔" ۔3

اسلام کو ترقی اور انسانی فلاح کے دشمن کہنے والوں کے آباد کا نقشہ بھی سید قطب شہید نے کھینچا ہے۔ اس نقشے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام ہی وہ دین تھا جس نے یورپ والوں کو جینا سکھایا ورنہ ان کی حالت تو یہ تھی کہ

"سینٹ ابراہام نے اپنی پنجاہ سالہ مسیحی زندگی میں اپنے چہرے یا پیر پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ راہب الگزنڈر بڑے تاسف اور تحیر سے فرماتے ہیں کہ وہ ایک زمانہ تھا جب ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام سمجھتے تھے اور ایک لوگ ہم ہیں جو حمام جایا کرتے ہیں۔ راہب معلموں کا بھیس بدلے ہوئے پھرتے تھے اور بچوں کو بہلا پھسلا کر اپنے حلقے میں شامل کرتے تھے۔ والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا جو اولاد انہیں چھوڑ کر تارک الدنیا ہو جاتی تھی اس کے نام پر پبلک میں ہر طرف واہ واہ ہوتی تھی۔ پہلے جو اثر و اقتدار بزرگ خاندان یا والد کو حاصل ہوتا تھا وہ اب پادریوں اور راہبوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ پادری رہبانیت کے لئے لڑکے اغوا کرتے تھے۔ سینٹ ایمروز میں اس قسم کے اغوا کی قوت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اسے دیکھ کر مائیں اپنے اپنے بچوں کو گھروں کے اندر بند کر دیتی تھیں۔ تحریک رہبانیت کا اخلاقی نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے کمالات مردانگی و جوانمردی سے متعلق ہیں وہ سب یکسر معیوب قرار پا گئے۔ مثلاً زندہ دلی، خوش طبعی، صاف گوئی، فیاضی، شجاعت، جرات کہ عابدان مرتاض کبھی ان کے قریب بھی ہو کر نہیں گذرے تھے _ دوسرا اہم نتیجہ رہبانی طرز معاشیات کا یہ ہوا کہ خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور دلوں سے اعزاء کا احترام و ادب کافور ہو گیا۔ اس زمانے میں ماں باپ کے ساتھ احسان فراموشی اور اعزاء کے ساتھ قساوت قلبی کی جس کثرت سے نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل

ہے"۔4

جدید ترقی نے ان پادریوں اور ان کے پیروکاروں کی طرز زندگی کو ظاہری طور پر پالش کردیا اور ان کی مادی ترقی نے انسانیت کی آنکھوں کو خیرہ کرنا شروع کردیا لیکن ان کی روایتی مسلم دشمنی مزید مضبوط ہوتی گئی اور انہوں نے مادی ترقی کے زور پر مسلمانوں کو جدید دور میں غلام بنانا شروع کردیا۔ یاد رہے کہ یورپ کے نزدیک دور جدید کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے جب اندلس سے مسلمان نکل رہے تھے اور یورپ کے کبھی نہ غسل کرنے والے باشندے غسل کی برکات سے آگاہ ہورہے تھے۔

آج جبکہ مہذب دنیا ان کی مادی ترقی کے سامنے سربسجود نظر آتی ہے۔ مسلم دشمنی اور مسلمانوں کا خود انحصاری کی طرف' آزادی اور حریت فکر و عمل کی طرف سفر انہیں اپنے اقتدار کے لئے خطرناک امر لگتا ہے۔ فلسطین کی تحریک انتفاضہ نے ان کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ ہر سال ایسٹر کے موقع پر عیسائی خواتین میں بالخصوص پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس سال یہ تہوار اس لئے نہیں منا سکیں گے کہ مسلمانوں کے خیال میں ایسا کرنے سے انتفاضہ کی روح کو زد پہنچتی ہے۔ مغربی بیروت میں چرچوں میں سنڈے کی عبادات منسوخ کردی گئی ہیں اس لئے کہ مسلمانوں نے ایسٹر کے جلوس کو ساڑھے تین بجے شہر کے اس حصے سے گذرنے کی اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا یہ تہوار رات کو منایا جائے

" خوف' انسانی دکھوں اور بے یارومددگار ماحول نے مشرق وسطیٰ کے عیسائیوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ایک کروڑ عیسائی باقی ہیں لیکن کب تک' مڈل ایسٹ کونسل آف چرچز کے سیکرٹری جنرل جرائیل حبیب کا کہنا ہے کہ خطے میں عیسائیت کے تسلسل کو خطرہ لاحق ہے۔ پروٹسٹنٹ اور اینگلیکن راہنماؤں کا خیال ہے۔ ہم خداوند یسوع مسیح کی مرضی کے مطابق اس زمین پر قیام کریں گے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہماری جڑیں ہیں جس سے ہمارا تعلق ہے ـــــــ مسلم ثقافتی دباؤ ہی عیسائیت کے زوال کا سبب نہیں ہے بلکہ یہ ہر ملک میں مختلف وجوہات کی وجہ سے ہے۔ لبنان کی خانہ جنگی نے عیسائیوں کو نہ صرف مسلمانوں سے بچاؤ پر مجبور کیا ہے بلکہ وہ خود دشمن عیسائیوں کے ہاتھوں بھی تنگ ہیں۔ سعودی عرب نے عرصہ دراز سے عیسائیوں کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اسلام شام کا سرکاری مذہب نہیں ہے اور وہاں کی دس فیصد عیسائی آبادی اس وقت تک محفوظ ہے جب تک حافظ الاسد صدر ہیں ------ خطرہ ہے کہ ایک

دن آئے گا جب ہمارے مقدس مقامات ----چرچ--- عبادت کرنے والوں سے خالی ہوجائیں گے۔ گرجا گھروں کے ماہرین کے مطابق مقبوضہ بیت المقدس میں نو ہزار عیسائی شہری ہیں' عیسائیوں کا مستقبل اس وقت زیادہ نازک صورت اختیار کرگیا جب یہودی جن کی تعداد 150 تھی وہ عیسائیوں کی آبادیوں میں داخل ہوگئے------- اسلامی بنیاد پرستوں کے حالیہ عروج نے عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں تناؤ اور سرد مہری کو مزید گہرا اور تیز کردیا ہے۔ زندگی ناقابل برداشت ہوگئی ہے ہم عیسائی اور مسلمان لمبے عرصے سے آرام کے ساتھ رہ رہے تھے لیکن ان بنیاد پرست مسلمانوں کا رویہ مکمل طور پر مختلف ہے۔ ہمیں پہلے کبھی مسلمانوں کے غلبے کا خطرہ نہیں محسوس ہوا تھا لیکن اب ہمارے شہر جنات اور بھوتوں کے مسکن بنتے جارہے ہیں۔ ہم یقیناً" خوفزدہ ہیں----- ہمارا یہاں کوئی مستقبل نہیں ہے---- ایک انقلابی مسلمان لیڈر نے ہمیں کہا ہے کہ مستقبل میں آنے والے مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں تمہارا مستقبل محفوظ ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ تم غیر ملکی ایجنسیوں کو نکال دو۔ اگر ہم ان ایجنسیوں کو نکال دیں تو ہمارا زندہ رہنا ممکن نہیں رہے گا--- 1920 میں استنبول میں 80 فیصد لوگ عیسائی تھے جبکہ ان کی موجودہ تعداد مشکل سے تین ہزار ہے۔ نوجوان علاقے کو چھوڑ رہے ہیں اس لئے کہ ان کا مستقبل --؟ ______

سیاسی گھٹن نے ترکی میں عیسائیت کی مشکلات میں اضافہ کیا ہے۔ سیکولر حکومت نہ صرف یہ کہ گرجا بنانے سے روکتی ہے بلکہ وہ غیر ملکی پادریوں کو داخلے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ ملک کی واحد عبادت گاہ 1971 میں بند کردی گئی تھی--- اگلی صدی تک خطرہ ہے کہ عیسائیت ختم ہوجائے گی--- ترک آرمینیا میں صرف 28 پادری رہ گئے ہیں ایک مشہور پادری نے امید ظاہر کی ہے کہ جب ترکی یورپی برادری کا رکن بن جائے گا تو ترکی میں مذہبی آزادی حاصل ہوجائے گی---- مصر کے قبطی ملک کی سب سے بڑی عیسائی آبادی ہیں ان کی تعداد 54 لاکھ ہے۔ اگرچہ مصر میں گرجا گھروں کی طرف سے زیادہ کرائے ادا کئے جاتے ہیں تاہم یہاں قید و بند کے مسائل دوسرے مسلمان ممالک کی نسبت زیادہ ہیں۔ عیسائیوں کو پچھلے مہینے دھمکی دی گئی تھی کہ ان کے مکانات اور زندگیوں پر حملہ کیا جائے گا۔ عیسائیوں کی مخالفت اور دشمنی دن بدن بڑھ رہی ہے _____ اگر مصر میں سب سے زیادہ عیسائی آباد ہیں.تو لبنان میں عیسائیوں کی قوت زیادہ مضبوط اور منظم ہے۔ 1975ء سے

شروع خانہ جنگی میں عرب آبادی عیسائیوں پر حاوی ہے ــــ مغربی بیروت کے 85 فیصد عیسائی فرار ہوچکے ہیں۔ پچھلے سال جنوری میں عیسائیوں کے درمیان جنگ پھوٹ پڑی جس کی وجہ سے ایک تہائی عیسائی مشرقی بیروت روانہ ہوگئےــــ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے لگتا ہے کہ عیسائی یہاں مغلوب ہوجائیں گے ہمیں خطرہ ہے کہ عیسائی آبادی ختم ہوکے رہ جائے گی ــــ "۔5

مذکورہ بالا حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائیوں کا کام کرنے کا طریقہ کیا ہے اور وہ کس انداز سے پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے وہ کیسے کیسے حربے استعمال کرتے ہیں۔ اسرائیل میں پولیس منسٹر کے لئے انتخاب لڑنے والے ایک امیدوار رہاوان زوایوی نے اسرائیلی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عربوں کو سمجھانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کی گدی پر ضرب لگائی جائے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا کہنا ہے کہ انتفاضہ کے پتھروں اور پٹرول بموں میں سراسر شرارت پوشیدہ ہے۔ اگر فلسطینی بم استعمال کریں گے تو ان کے خلاف زیادہ بہتر اور نازک ہتھیار استعمال کرنے کی راہ ہموار ہوجائے گی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا ذہن اسلام کے بارے میں کبھی صاف نہیں رہا۔ 1968 میں بھارت میں عیسائی گرجا گھروں کی کارکردگی پر ایک کتاب شائع ہوئی۔ جنوبی بھارت کے علاقے تلنگانہ کے مسلمانوں کا تعارف کراتے ہوئے مصنفین نے اپنے تعصب کا بھرپور اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دن میں پانچ وقت نماز ادا کریں اور جمعہ کے روز نماز کے اجتماع کے لئے اکٹھے ہوکر جلسہ کریں۔ رمضان کے مہینے میں سارا دن بھوکے رہ کر روزہ رکھیں ۔ اس پر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد عمل کرتی ہے۔ اگرچہ سارے مسلمان سارے روزے نہیں نبھاتے۔ گاؤں کے مسلمانوں پر ایک اور چیز فرض ہے اور وہ ہے شہادت یا ایمان کا اظہار جس کے لئے وہ ایک کلمہ ادا کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرے دو رکن زکوۃ اور حج ہیں۔ کچھ لوگ زکوۃ دیتے ہیں۔ حج ایک ایسا فریضہ ہے جسے نظری طور پر سب مانتے ہیں لیکن عمل درآمد کوئی کوئی کرتا ہے۔ چھٹا رکن جہاد ہے۔ جسے مسلمان مقدس جنگ کہتے ہیں۔ یہ مقدس جنگ وہ کافروں کے خلاف لڑتے ہیں۔ 1947 اور 1948

میں برطانوی راج کے خاتمے کے لئے مذہبی جنونیوں نے نواجوں کو کئی بار اس مقدس جنگ کے لئے بلایا ہے۔ مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت کے خلاف مقدس جنگ اب عملی طور پر ناممکن ہے اور جہاد بھی ساقط ہوگیا ہے۔ لیکن اب بھی دیہاتوں میں ایسے مسلمان ہیں جن کے قریب دینی ذمہ داریاں اہم ہیں اور انہیں چھوڑنا وہ کفر سمجھتے ہیں۔

مسلمانوں کا خواجہ گاؤں میں ایک تنہا اور ویران مکان میں رہتا ہے ۔ مسلمان میلوں دور سے اس کے پاس آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے کہنے پر پوجا پاٹ کا کام کرتا ہے اور ان کے نکاح پڑھواتا ہے۔ "بڑا پادری" یا روحانی رہنما مرشد کہلاتا ہے۔ وہ حیدر آباد رہتا ہے وہ کبھی ان دیہاتوں میں نہیں آیا۔ مسلمان اس کے پاس حیدر آباد ہدایات لینے جاتے ہیں۔ ملا اور فقیر بھی ان دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ ہندو پروہتوں کی طرح ہیں۔ فصل کٹنے پر ان کا حصہ الگ کرنا ضروری ہے۔ فقیر اور ملا یہ حصہ وصول کرتے ہیں۔

تلنگانہ کے علاقے میں بہت سی مساجد ہیں جنہیں مسلم حکمرانوں نے تعمیر کرایا تھا۔ بعض مساجد ایسی بھی ہیں جو دولت مند مسلمانوں نے یا پھر مسلمانوں کی آبادی نے چندہ جمع کرکے بنائی ہیں۔ کنڈا پورم میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور ابوجی بت میں ایک بڑی مسجد ہے۔ عام طور پر ہر مسجد میں ایک امام ہوتا ہے جو نماز پڑھاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کا مذہبی راہنما ہے اور انہیں دینی ہدایات دیتا ہے۔ ان کے بچوں کو پڑھاتا ہے۔ عام طور پر مسجد کے ساتھ ایک مکتب بھی ہوتا ہے۔ جسے سکول کہا جاسکتا ہے۔ جہاں امام اردو لکھنا اور پڑھنا سکھاتے ہیں۔ جامع مسجد میں امام جمعہ کو خطبہ بھی دیتا ہے۔ کنڈا پورم میں مسلمان جمعہ کے روز بڑی مساجد میں جاتے ہیں اور چھوٹی مساجد خالی رہ جاتی ہیں۔

بھارت میں اسلام کئی صدیوں سے موجود ہے اس نے اپنے اردگرد لوگوں کو متاثر بھی کیا ہے اور ماحول کا اثر بھی لیا ہے۔ تلنگانہ میں اب لوگ اسلام قبول نہیں کرتے۔ مسلمان اور ہندو آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔" 6

اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں بالکل بے وقعت کرنے کے لئے مخالفین اسلام کی کسی بھی کوشش کو محض اس کے سیاسی تناظر، اقتصادی محرکات یا سفارتی چشمک تک محدود کرنے سے یہ ہوگا کہ ہم عالم اسلام کے خلاف مخالفین کی جدوجہد اور سازشوں سے بے بہرہ رہ

جائیں گے۔ خلیجی جنگ اس کا سب سے اہم ثبوت ہے۔ عالم اسلام مغرب اور امریکہ کے زبردست پروپیگنڈے کی زد میں آگیا۔ بنیاد پرستی کے نعرے نے ایک بار پھر کام کیا اور بجائے اس کے کہ عالم اسلام کی نمائندہ تنظیم اسلامی کانفرنس سعودی عرب اور عراق کو صلح کی راہ پر لاتی۔ وہ حالات کے یک رخے انداز پر بہتی رہی۔ عراق کی جارحیت کے جواز نے امریکہ اور یورپ کو اسلام سے پرانے حساب چکانے کا موقع فراہم کردیا۔ عیسائی دنیا نے اس جنگ کو کس حیثیت میں لیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

"یسوع کی تمثیلوں میں یہ جواز موجود ہے کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے جنگ کی قیمت کا اندازہ لگا لینا چاہیے اس ضمن میں لڑائی ہونے یا لڑائی نہ ہونے دونوں صورتوں میں ہونے والے اخراجات کا اندازہ ضروری ہے۔ ان اعداد و شمار میں کویت اور عراق میں مقیم مغربی باشندوں کی زندگیوں پر ہی نہیں جو مشرق وسطیٰ کے لاکھوں یرغمالیوں میں شامل ہوگئے تھے' پوری انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات' فوجی امکانات اور اقتصادی و اخلاقی دونوں قسم کے نتائج بھی شامل ہیں۔ مغربی دنیا کے مشرق وسطیٰ میں تین طویل المیعاد مقاصد ہیں۔ پہلے نمبر پر تیل ہے' جسے مغربی اقوام بڑے مقدار میں استعمال کرتی ہیں۔ ان کی معیشت' تیل کی قیمتوں میں تیز رفتار اضافے اور بے لگام قزاقانہ دھمکیوں کی زد میں رہتی ہے۔ دوسرا سوال اسرائیل کا ہے اس کے قیام اور دفاع میں جو کچھ بھی غلطیاں ہوئی ہیں مغرب اور بالخصوص ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کا ضمیر اس کی بقا میں لگا ہوا ہے۔ بے لگام صدر صدام اردن کے راستے اس پر چڑھائی کرسکتا تھا اور تیسری چیز اقوام کے درمیان عمومی نظم و ضبط کا قیام ہے۔ اگر کویت پر چڑھائی کو چیک نہ کیا جائے تو بین الاقوامی ڈاکہ زنی کو لائسنس مل جائے گا۔"۔ 7

گویا اس ساری جنگ میں اہم اہداف انسانوں کی جانوں کا تحفظ' صلح جوئی کی کوشش یا حالات پرامن رکھنا نہیں تھے بلکہ تیل پر قبضہ' مسلمانوں کو یورپ اور امریکہ کے قدیم خوابوں کی بھینٹ چڑھانا' فلسطینیوں کے وطن کی نفی کرنا' مسلمانوں کی فوجی قوت برباد کرنا تھے۔ مسلمان اگر اپنے تیل کی قیمتوں کا تعین کرنا چاہیں تو وہ قزاق بن جاتے ہیں۔ فلسطین کا مطالبہ کریں تو اسرائیل کا تحفظ اور بقا ضمیر کی خلش بن کے امریکہ اور برطانیہ کی بزرجمہروں کو پریشان کرتا ہے۔ مسلمانوں ہی قوت مزاحمت اور قوت ایمانی کو ختم کرنے کا ایک

اور مسیحی انداز مسلم خواتین میں عیسائیت کا پرچار کرنا ہے- ایک مسیحی مضمون نگار کا کہنا ہے-

"اکثر مسلم خواتین دو دنیاؤں میں رہتی ہیں- ایک طرف ان کا تعلیمی معیار بتدریج بڑھ رہا ہے اور اپنے مقام ملازمت پر ان کے مرتبہ و حیثیت میں بہتری آ رہی ہے- دوسری جانب وہ اپنے اس ماتحت کردار سے مطمئن ہیں جو اسلامی سوسائٹی کے خاندانی نظام میں ان کے لئے مخصوص ہے-

جو مشنری ریڈیو' لٹریچر اور مواصلاتی کورسز سے کام لے رہے ہیں ان کے لئے نوجوان تعلیم یافتہ مسلم خواتین تک رسائی کے مواقع اوسطاً" کہیں زیادہ ہیں اور جن خواتین نے خط و کتابت میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے ان سے وہ ذاتی ملاقاتیں کرکے ذرائع ابلاغ کے نتائج کو مزید خاطر خواہ بنا سکتے ہیں-

اس سلسلہ میں عیسائیت اختیار کرنے والی وہ سابق مسلم خواتین خاص طور پر مفید ہیں جو بچوں کو پڑھاتی ہیں- موسم گرما کے کیمپ لگاتی ہیں اور خواتین کو چھوٹی-ٹولیوں میں تعلیم دیتی ہیں- یہ خواتین پولیس کی پوچھ گچھ کا خطرہ مول لیتی ہیں ان میں سے کچھ قید و بند کے مراحل سے بھی گذر چکی ہیں- ان میں سے بعض اہم مناصب پر فائز ہیں اور اپنی تنخواہیں دوسرے عیسائیوں کو کانفرنسوں میں بھجوانے کے لئے استعمال کرتی ہیں-

مسلم خواتین مختلف ممالک میں مواقع کے لحاظ سے مختلف صورتحال سے دوچار ہیں- تیونس میں جہاں خواتین ڈاکٹر اور انجینئر ہیں ان کا بڑا مسئلہ گھر اور کام کی ذمہ داریوں میں توازن قائم کرنے کا ہے- سعودی عرب میں کچھ خواتین اپنے بنک' ہسپتال اور سکول چلاتی ہیں- بعض ملکوں میں جہاں ملکی صنعتیں موجود ہیں بہت سی آسامیاں نوجوان خواتین کے پاس ہیں- جبکہ دیہی علاقوں میں وہ اپنے روایتی انداز میں فصلوں اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور دستکاریاں تیار کرتی ہیں-

حالات اگرچہ تبدیل ہو رہے ہیں لیکن مسلم خواتین میں روایات کے اثرات ابھی تک بہت موجود ہیں تیونس کے سوا اکثر ملکوں میں ترمیم شدہ قبائلی اسلامی قانون پایا جاتا ہے جس میں مرد خاندان کا سربراہ ہوتا ہے اور نان نفقے کا ذمہ دار' بلکہ خاتون اپنے خاوند' باپ اور بیٹوں کا تحفظ حاصل کرتی ہے-

نکاح' طلاق اور وراثتی حقوق میں عدم مساوات کے باوجود اکثر مسلم خواتین اسلام کی تعریف کرتی ہیں اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام انہیں مرد کے برابر مساوات عطا کرتا ہے اور کچھ نہیں تو پانچ ارکان اسلام کی ادائیگی کی حد تک ــــ وہ اپنے معاشروں کی حدود میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ انہیں مساوات نسوانی کا مغربی نظریہ سخت ناپسند ہے اور وہ مغرب کی فحاشی اور بداخلاقی کو شرمناک قرار دیتی ہیں۔

اکثر مسلم خواتین اپنے روزمرہ کے مسائل پر قابو پانے کے لئے طاقت پر تصرف چاہتی ہیں اس کے لئے وہ تعویذ گنڈے' جانوروں کی قربانی اور جادو کے ذریعے خدا سے توہم پرستانہ اپیلیں کرتی ہیں۔ عرب ملکوں کی بڑی بوڑھیاں ہوں یا مغربی ممالک میں رہنی والی مسلم خواتین' یہ اعمال ان سب میں پائے جاتے ہیں۔

تیل کی دولت سے مالا مال چند ملکوں سمیت بیشتر اسلامی ملکوں میں تبدیلیوں کے باعث مسلم خواتین کے مشنریوں سے رابطے کے روایتی انداز اب غیر موثر ہوچکے ہیں عوام کے تعلیمی معیار و ذرائع میں اضافہ ہوا ہے اور اب پڑھانے اور دستکاریاں سکھانے کی مشنری کلاسوں کی ضرورت باقی نہیں رہی تاہم بعض مقامات اب بھی ایسے ہیں جہاں عیسائی خواتین دایہ گیری کے ذریعے مسلم خواتین سے تعلقات کا سلسلہ جاری رکھ سکتی ہیں۔

خاص طور پر یورپ میں جہاں افریقہ اور مشرق وسطیٰ سے نقل مکانی کرنے والوں میں ہزاروں خواتین بھی شامل ہیں۔ مشنریوں نے دوستی کے مراکز قائم کئے ہیں۔ ان مراکز میں وہ زبان' قانونی معاملات اور ثقافتی رکاوٹیں دور کرنے میں خواتین کی مدد کرتے ہیں۔ نوخیز مسلم لڑکیوں کی دوسری نسل خاندانی پابندیوں اور اپنائے ہوئے ملکوں کی تہذیب کے درمیان کشمکش کا شکار ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے ۔ کے لئے کچھ مشنری انہیں گھریلو کاموں میں مدد کی پیشکش کرتے ہیں اور انہیں ورزشی کلاسوں اور دیگر سرگرمیوں میں مدعو کرتے ہیں۔"۔ 8

اس طویل اقتباس کے درج کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عیسائیوں کے مسلمانوں کے بارے میں نظریات اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے ان کے طریقوں کے بنیادی پہلو سامنے آسکیں تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ اگر عیسائیوں کو اصلاح مذہب' تبلیغ میں بہتر انداز اور احیائے مسیحیت کا حق حاصل ہے تو پھر اسلام کے پیروکاروں کو ایسی ہی کوششوں پر گالیوں سے نوازا جانا اس بات کی وکالت کرتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ

مسلمانوں کو نفسیاتی محاذ پر پراگندہ خیال کرکے ان کے فیصلہ کی قوت اور عمل کی گرمی کو ختم کیا جاسکے۔

عیسائیوں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ذہنی طور پر اس مقصد کے لئے تیار ہوا جاسکے کہ بنیاد پرستی کے اصل محرک کون تھے۔ بنیاد پرستی کا اصل مفہوم کیا تھا اور کیا ہے اس کے آغاز اور مسلمانوں تک اس کے ابلاغ کے دوران کیا واقعات اس کے محرکین کے حوالے سے رونما ہوئے۔ اس سارے عمل میں عیسائیت اپنے فرقوں میں پنجہ آزما نظر آتی ہے۔

عیسائی عقیدے کے مطابق (Mellinnium) ایک ایسا نظریہ ہے جو بیان کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام (یسوع مسیح) ایک ہزار سال بعد دنیا میں واپس آکر زمین پر مسیحی حکومت قائم کریں گے۔ یہ نظریہ عیسائیوں نے یہودیوں سے مستعار لیا تھا۔ عیسائیوں کا خیال ہے کہ اس نظریے کے تحت وہ دنیا بھر پر حکومت کرنے کے حق دار ہیں اور ایک دن آئے گا جب عیسائیت کو ساری دنیا بھر میں عروج حاصل ہوگا۔ اس نظریے کا ذکر New Testament میں بھی موجود ہے۔ جس کے مطابق شیطان کو ایک گہری کھائی میں ایک ہزار سال کے لئے پھینک دیا گیا ہے اس دوران شہید ہونے والے حواری دوبارہ حیات کئے گئے اور وہ اس نظریے کی بالا تری کے لئے مسیح کے ساتھ حکومت کریں گے۔ شیطان کو تھوڑی سی ڈھیل دی گئی تھی تاکہ وہ قوموں کو دھوکہ دے سکے لیکن اسے فوراً ہی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر تمام مردوں کو جمع کر کی انہیں حتمی فیصلہ سنانے کا اعلان ہوا۔جو عیسائی اس نظریے کے حامی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ہزار سال بعد دوبارہ آئیں گے اور حکومت کریں گے انہیں Pre Mellennialists اور دوسروں کو Postmellennialists کہا جاتا ہے۔ موخر الذکر کا کہنا ہے کہ ساری دنیا ایک دن عیسائیت کو تسلیم کرے گی اس اصطلاح کا زیادہ عام استعمال کرتے ہوئے دنیا میں مادی مفادات کے حصول پر بھی بات کی جاتی ہے۔ ابتداء کے دور کے مسیحی مصنفین خاص طور پر جو صیہونی عیسائیت کے زیادہ قریب تھے انہیں اس نظریئے کے حوالے سے Millenniums کہا جاتا تھا۔ ان میں برناباس، جسٹن، ار ینیئس اور صیہونی عیسائیت کے علمبردار بھی شامل ہیں۔ بہت سے عیسائی اس مکتب فکر سے خوفزدہ ہوئے۔

(بنیاد پرستی وہ قدیم تحریک ہے جو امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں 19 ویں صدی میں ابھری۔ یہ لوگ عیسائیت کے بنیادی اصولوں پر زور دیتے تھے ۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں یقین رکھتے تھے کہ وہ جسمانی طور پر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ بنیاد پرستی کی اس رو کو بیسویں صدی میں جدیدیت کا سامنا کرنا پڑا اور امریکہ کی مذہبی و سماجی زندگی میں ایک جنگ شروع ہوگئی اور اس صدی کے موجودہ دور سے کچھ عرصہ پہلے سے بہت سے عیسائی گرجا گھروں کی انجمنوں، تعلیمی اداروں اور خاص امور میں دلچسپی لینے والی تنظیموں نے اس کی نمائندگی کی)

بنیاد پرستی کی تحریک کی جڑیں دراصل امریکہ میں پائی جاتی ہیں یہ 1830 اور 1840 کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس دور میں امریکہ کے عیسائی اس حوالے سے بہت پرجوش تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (خداوند یسوع مسیح) کے مجسم ہوکر واپس آنے کا وقت ہوچکا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انتظار کے ایک ہزار سال پوری ہوچکے ہیں۔ اس سلسلہ میں بنیادی نوعیت کا کام نیاگرا بائبل کانفرنس نے کیا جس کا آغاز نیویارک سٹی کے ایک وزیر نے کیا۔ اس کی 1872 میں موت کے کچھ ہی عرصہ بعد یہ کانفرنس جیمز ایچ بروکز کی نگرانی میں جاری رہی۔ یہ سینٹ لوئیس میں وزیر تھے اور ایک عیسائی پرچے The Truth کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کے ساتھ دیگر راہنماؤں میں جارج سی بنڈیام، ولیم جے ارمنڈ ولیم کولسن تھے۔ صدی کے اختتام پر اس تحریک میں بوسٹن کے مشہور Baptist وزیرایڈویزم گورڈن اور موریس بالڈون شامل ہوچکے تھے۔ یہ گروہ سالانہ سمر کانفرنسوں کا اہتمام کرتا۔ یہ کانفرنسیں اکثر نیاگرا جھیل کے کنارے ہوا کرتی تھیں یہ بڑے شہروں میں عوامی اجتماعات بھی کرتے تھے۔

جب پروٹسٹنٹ لیڈروں میں اعتماد پیدا ہوا تو ان کی یہ تحریک امریکہ میں زور پکڑنے لگی اس وقت امریکہ میں مزدوروں کی وجہ سے امن و امان کی صورتحال خراب تھی۔ سماجی بے چینی کی وجہ سے رومن کیتھولک کی ہجرت تیز تھی۔ 1880 اور 1890 کے دوران بائبل پر لبرل انداز میں تنقید نے بنیاد پرستی کی اس تحریک کے لئے بہت سے حامی پیدا کردیئے تھے۔ اس تحریک کے کارکنوں کو سرگرم پلیٹ فارم دینے کے لئے ڈی ایل موڈی نے نارتھ فیلڈ کانفرنسوں کا آغاز کردیا۔ اس طرح حوصلہ افزائی پانے پر ایک نئی تحریک Students

Volunteer Movement کا آغاز ہوا۔ اس سارے عمل میں جو تحریکیں اٹھ رہی تھیں ان میں یہ خیال بہت پختہ نظریے کی صورت میں ڈھل چکا تھا کہ انجیل مقدس کی حکمرانی اور تقدس کا دفاع کیا جانا ضروری ہے۔ پرنسٹن کے پروفیسرز انجیل مقدس کے حق میں تقریریں کرتے۔ چنانچہ Millennium تحریک نے ان پروفیسرز کو اپنی کانفرنسوں میں مدعو کرنا شروع کر دیا۔ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ لیکن اس بات پر متفق تھے کہ بہرحال انجیل مقدس کو اہمیت دینا ضروری ہے۔

1902ء میں امریکن بائبل لیگ کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے 12 ابواب پر مشتمل ایک دستاویز تیار کی گئی جسے The Fundamentals کا نام دیا گیا۔ ان ہمفلٹوں میں بائبل پر تنقید کرنے والوں کی خوب خوب خبر لی گئی تھی اور انجیل مقدس کے تقدس اور اختیار کو تسلیم کرنے کے حق میں زور دار دلائل دیئے گئے تھے۔ ان ہمفلٹوں کا ایک اور ہدف جدید تہذیب تھی جس پر تند و تیز حملے کئے گئے تھی۔ اس وقت تک اس تحریک بنیاد پرستی کا آغاز کرنے والوں میں سے اکثر فوت ہو چکے تھے اور نئی قیادت میں جوش و فکر کی کمی آگئی تھی۔ ان کے انجیل مقدس کے دفاع کرنے کا انداز پرتشدد ہو گیا تھا اور وہ کسی بھی مسئلے پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے ان کے رویے غیر لچکدار تھے۔ 19 ویں صدی کے آخری سال حضرت مسیح علیہ السلام کی پیروی کے ان دعویداروں میں اختلاف نے جنم لیا لیکن جیمز ایچ بروکز نے مختلف الخیال لوگوں کو جمع کئے رکھا۔ تاہم اس کی وفات کے چند سالوں کے اندر نیاگرا کانفرنسوں کا سلسلہ دم توڑ گیا اور متحارب گروہوں میں بیان بازی شدت اختیار کر گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر ان بنیاد پرستوں نے دنیا کو خبردار کیا کہ عیسائیت میں لبرل خیالات رکھنے والوں کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے۔ جس سے سماجی طور نسلی خاتمے کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ Millennium تحریک کے حامیوں نے نیویارک سٹی اور فلاڈلفیا میں کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔ ان کانفرنسوں میں ایک بڑی اور مضبوط تنظیم عالمی مسیحی بنیاد پرست تحریک Worlds' Christian Fundamentalist Association نے جنم لیا۔ اس کانفرنس کے بعد Millennium تحریک نے اپنا نام بدل لیا۔ اب بنیاد پرست تحریک اگلے تیس سالوں پر حاوی ہونے کے لئے تیار تھی۔ اس تحریک کے لیڈروں نے جدید تہذیب

مسترد کرتے ہوئے عیسائیت کے بنیادی اصولوں پر کاربند رہنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم کو مسترد کرتے ہوئے اپنے طور پر بائبل انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا شروع کردیئے۔ ڈبلیو بی رائلے، اے سی ڈکسن اور آر اے ٹوری جیسے قد آور مسیحی لیڈروں کی موجودگی کے باوجود یہ ایسوسی ایشن پھل پھول نہ سکی۔

انیسویں صدی کے آخر میں چرچ میں لبرل فرقے کے لوگوں کی تعداد کم تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگ یونیورسٹیوں میں پروفیسرز تھے یا سیمیناروں میں شرکت کرنے والے مقررین تھے۔ تاہم چند عشروں کے دوران انجیل مقدس کے بارے میں نئی ہم آہنگی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ لیکن 1914 تک لبرل فرقے کے لوگوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا۔ 1920 کا عشرہ امریکیوں کے کمزور مذہبی رواداری کے رویے کا مظہر ہے۔ 1920 سے پہلے اور اس کے بعد اشتراکیت کے خطرے نے امریکیوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ صنعتی امن غائب تھا اور جنگ کے فوراً بعد کے مسیحی خطبوں میں بغاوت کی بو صاف محسوس کی جارہی تھی۔ لیگ آف نیشنز کو تسلیم کرنے سے انکار سے ظاہر ہورہا تھا کہ امریکہ نئے عالمی ماحول سے ناخوش ہے اس وقت کے بنیاد پرستوں کا بھی یہی خیال تھا کہ امریکی حکومت کے خطرات حقیقی ہیں اور مسیحی عالمی حکومت کو شدید خطرات لاحق ہیں اس لئے نیا عالمی نظام ان بنیاد پرستوں کی مرضی کے بھی خلاف تھا۔

1920 کے عشرے کی اس مذہبی، سماجی اور سیاسی جنگ نے تمام کے تمام پروٹسٹنٹ لیڈروں کو برگشتہ نہیں کیا تھا۔ بعض خطوں میں جدید تہذیب کی تباہ کاریاں ابھی تک سامنے نہیں آئی تھیں اور بنیاد پرست مسیحیوں کا خیال تھا کہ ابھی ان کے سخت رویے یا رد عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ جبکہ میتھوڈسٹ اور Episcopal گرجا گھروں میں جدید تہذیب داخل ہوچکی تھی۔ اسے گرجا گھروں کے اندر سے اپنے حامی مل چکے تھے۔

تاہم جنوبی ریاستوں میں Baptists اور Presbyterian چرچ کے درمیان سخت کشمکش شروع ہوچکی تھی۔ بنیاد پرستوں کی طرف مسیح علیہ السلام کی دوبارہ آمد، پیدائش، حکمرانی کے نظریات کا زور و شور سے پرچار جاری تھا اور وہ انجیل مقدس پر عملدرآمد کا مطالبہ کررہے تھے۔ 1922 میں نیویارک کا ایک وزیر جدید تہذیب کا زور دار حامی اور ترجمان بن کے سامنے آیا اس کا نام ایمرسن فاسڈک تھا۔ وہ بنیاد پرستوں کی سرگرمیوں اور

کارروائیوں کے سخت خلاف تھا۔ حالات میں تیزی سے گرمی پیدا ہورہی تھی۔ پرنسٹن اور بنیاد پرستوں کے درمیان اختلافات بھی تیز ہورہے تھے اور جدید تہذیب کے حامی ہر جگہ سوال کررہے تھے "کیا بنیاد پرستوں کو فتح حاصل ہوجائے گی؟" چنانچہ ایک کمیشن قائم کیا گیا تاکہ کوئی درمیانی راہ نکالی جاسکے۔ اس کمشن نے جو رپورٹ پیش کی اس نے قدامت پسندوں کے موقف کو سختی سے رد کردیا۔

1930 اور 1940 کے عشروں میں بنیاد پرستوں نے براہ راست تصادم کی پالیسی ترک کرنا شروع کردی۔ وہ قومی افق سے بھی غائب ہوتے گئے۔ اس عرصے کے دوران جدید بنیاد پرستی کا ڈھانچہ وجود میں آیا۔ کچھ بنیاد پرستوں نے اپنے دوستوں سے بغاوت کرکے الگ چرچ بنالئے۔ اس کی ایک مثال 1936 کا Presbytarian چرچ ہے۔ جسے گریشم میکن نے بنایا۔ لیکن ابھی بھی بنیاد پرستوں کی اکثریت اپنی تحریک پر قائم تھی اور وہ انجیل مقدس کو قوت و طاقت اور راہنمائی کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔

موجودہ بنیاد پرستی کی تحریک کا زیادہ تر حصہ ان بائبل انسٹی ٹیوٹ کا ادا کردہ ہے جو بنیاد پرستوں نے انجیل کے تحفظ کے لئے یونیورسٹیوں کے مقابل بنائے تھے۔ ان میں موڈی (Mody) بائبل انسٹی ٹیوٹ آف شکاگو اور موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ آف لاس اینجلس شامل ہیں۔ یہ ادارے بنیاد پرستوں کو مربوط کرنے کا کام دیتے ہیں۔

ان اداروں کے ساتھ ساتھ امریکن کونسل آف کرسچین چرچز 1941 میں بنی جبکہ نیشنل ایسوسی ایشن آف ایونجلیکلز National Association of Evangelicals 1942 میں وجود میں آئی۔ بنیاد پرستوں اور Evangelicals چرچ پر گہرا اثر دوسری جنگ عظیم کی بعد کی خوشحالی نے ڈالا۔ اس دوران 1950 کے عشرے میں مذہبی احیاء کا دور آیا اور لوگوں کو اشتراکی غلبے نے خوفزدہ کئے رکھا۔ اس عرصے کے دوران بنیاد پرستوں کی نمائندگی کا حق Evangelist بلی گراہم نے ادا کیا۔ اشتراکیت کا خطرہ بالکل ایسے ہی تھا جس طرح بنیاد پرستوں کے مخالفین کے تیز حملے تھے جو بائبل پر تنقید کرتے اور نظریہ ارتقاء کے مطابق اسے رد کردیتے تھے۔ بنیاد پرستوں کو قدامت پسندوں میں کچھ مقبولیت ملی۔ پھر اس بات پر اختلاف رائے ہوا کہ والدین کو یہ حق ملنا چاہیے کہ چرچ ان کے بچوں کو کیا پڑھاتا ہے۔ بنیاد پرست اس کیخلاف تھے اور وہ تعلیم میں مداخلت کے قائل نہ تھے۔ اس عرصے

کے دوران بنیاد پرستوں نے عورتوں میں اسقاط حمل' ہم جنس پرستی اور مساوی حقوق کی ترمیم کی شدید مخالفت کی۔ وہ وفاقی اخراجات میں اضافے اور خارجہ پالیسی کا رخ اشتراکیت کے خلاف رکھنے کے لئے زبردست کوششیں کرتے رہے۔

مسیحی بنیاد پرستوں کے خیالات میں نیاگرا کانفرنسوں سے لے کر اب تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتے ہیں اور شراب کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کی بدنامی کی اصل وجہ وہ پرتشدد اور سمجھوتہ نہ کرنے والا رویہ ہے جس کو جدید مغربی تہذیب اپنے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بنیاد پرستی دراصل ایک مسیحی فرقے کے لئے بولی جانے والی اصطلاح ہے۔ یہ فرقہ مذہبی احیاء اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کو ریاست کے معاملات پر مقدم رکھتا تھا۔ جو لوگ ریاست اور خداوند کے درمیان ترجیح کا فیصلہ کرتے ہوئے خداوند کی طرف ہوئے وہ بنیاد پرست کہلائے۔ جدید مغربی تہذیب کے خلاف ان کے رویوں نے رائے عامہ کو ان کے موافق نہ رہنے دیا۔ جس سے حالات پر ان کی گرفت نہ رہی۔

مسلمانوں پر یا اسلام پر بنیاد پرستی کی اصطلاح کا استعمال بالکل غلط ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو احیائے اسلام کی کوششوں سے روکنا ہے۔ ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"یورپ کے صلیبی ذہن نے اسلام اور اہل اسلام پر ضرب لگانے کے لئے کبھی اشتراق کبھی استعمار اور کبھی جدید تہذیب کے عنوان سے حملے کئے مگر وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکے۔ اب وہ امت مسلمہ کے اپنے خون کو اس مکروہ مقصد کے لئے استعمال کرنے چلے ہیں کبھی کسی نام نہاد مسلمان مفکر' ادیب یا عالم سے شیطانی آیات کے انداز کی خباثت کروا کے اس کے دفاع اور تحفظ کے لئے تمام حدود پھلانگنے لگتے ہیں کبھی اسلام کی سربلندی کا نام لینے والوں کو بدنام زمانہ القاب سے نواز کر ان کے اپنے روشن خیال حکمرانوں سے انھیں نیست و نابود کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ یہ شیطانی طریقہ براہ راست تصادم اور خون مسلم میں اپنے ہاتھ رنگنے سے زیادہ کارگر اور خطرناک ثابت ہورہے ہیں۔ صیہونی سازشوں اور صلیبی کارستانیوں سے تحریک اسلامی کی راہ روکنے کے

لئے کبھی مسلمانوں کو خونخوار درندہ کبھی دقیانوسی مذہب پرست' کبھی متعصب جنونی اور کبھی رجعت پسند کا لقب دے کر گردن زدنی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اب تازہ ترین ہتھیار "بنیاد پرست مسلمان" کا ہے ۔ اری ٹیریا' فلپائن' آذربائی جان' تاجکستان اور افغانستان کے تمام حریت پسند مسلمان ان کے نزدیک "بنیاد پرست" اور گردن زدنی ہیں۔ انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار آزادی جمہور کے نقلی چمپئن ہر جگہ مسلمانوں کے قتل عام پر نہ صرف خاموش ہیں بلکہ خوش بھی ہیں۔ آذربائیجانی مسلمانوں کی تحریک آزادی کو روسی ٹینک کچلتے ہیں تو چچا سام کی طرف سے پرمسرت تائید ہوتی ہے مگر دیوار برلن ٹوٹتی ہے تو مشرقی یورپ کے عیسائی گوروں کی آزادی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے اس دیوار کے ٹکڑے کرسمس کا تحفہ اور ڈیکوریشن پیس کے طور پر ہر امریکی کے گھر میں سجتے ہیں ______-- حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں بنیاد پرست اور بنیاد کے منکر مسلمان کی اصطلاحیں کبھی مستعمل ہی نہیں ہوئیں۔ فرقہ بندی اور تکفیر بازی کی جاہلانہ روایات اپنی جگہ ہیں اور صیہونی و صلیبی سازشوں کی وجہ سے اختلافات بلکہ خون خرابے کی صورتیں بھی ناقابل انکار حقائق ہیں۔ مگر کسی مسلمان کو کبھی بنیاد پرست یا منکر بنیاد نہیں کہا گیا۔ بنیاد پرست کی اصطلاح عیسائی یورپ کی ایک قدیم تاریخی بیماری کا نام تھا جس کے گورکھ دھندے نے علم اور سائنس کا راستہ روکنے کی شرمناک کوششیں کی تھیں۔ اسی طرح "مرحوم و مردود" کیمونزم کی دنیا میں بھی "بنیاد پرست کیمونسٹ" کی اصطلاح مروج رہی اور خاصی بدنامی کا باعث سمجھی گئی مگر اسلامی دنیا پر "بنیاد پرست" ہونے کا الزام دراصل اسلامی تحریکوں کو کچلنے کی شیطانی چال کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ دراصل مسلمانوں کو یہ لقب دے کر بدنامی کا جبہ پہنانا چاہتے ہیں تاکہ بدنام کو آسانی سے سولی پر لٹکایا جاسکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو مغرب کی سرمایہ پرستی کا سفینہ انسانیت کا سکھ چین لوٹ کر اپنے سنگدل مسافروں سمیت ڈوب رہا ہے۔ دوسری طرف کیمونزم بھی اپنا حیوانی رنگ دکھا کر اور بے رحمانہ قتل و غارت گری کا کفن پہن کر اپنی یاس و نامرادی کی قبر میں اتر رہا ہے۔ مگر اس کے برعکس ہدایت ربانی کی جو کرن غار حرا سے نمودار ہوئی تھی اور علم و حکمت کا پیغام لئے نغمۂ توحید' وحدت نسل انسانی' احترام آدمیت اخوت و مساوات اور آزادی کا علم لئے انسان کو بھوک اور غلامی سے نجات دینے کے لئے جگمگائی تھی وہ آج بھی پوری آن بان اور آب و تاب کے ساتھ اسی

طرح موجود ہے------ افسوس ناک بات یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کے بعض ایسے راہنما اور حکمران جن کے دل میں دینی حلقوں سے عناد پیدا ہوجاتا ہے یا وہ ان کی حمایت سے محروم ہوجاتے ہیں یا دینی عناصر کی وجہ سے اپنی مقبولیت کھو بیٹھتے ہیں وہ بھی اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے "بنیاد پرست" کا راگ الاپنے لگتے ہیں اور استعماری کورس میں شامل ہوجاتے ہیں--- 9

اسلامی دنیا کے ان راہنماؤں کو خصوصی طور پر اس اصطلاح کے بارے میں کام کرنا چاہیے جو لوگوں کے وسیع حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں- عام مسلمان کو چاہیے کہ وہ خود کو بنیاد پرست مت کہے- اسلام نے مسلمان کو صرف مسلمان ہی کہا ہے وہ بنیاد پرست مسلمان' "رجعت پسند مسلمان" نیا مسلمان یا پرانا مسلمان نہیں بن سکتا _ اسے بننا ہے تو صرف اور صرف مسلمان بننا ہوگا-

1- "Fundamentalism And Revivalism in South Asia"

اے آر فرانیکسن برگ- صفحہ 24-25

2- "انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء" از محمد قطب' ترجمہ: ساجد الرحمن صدیقی

اسلامک بک پبلشرز کویت- طبع دوئم 1976 صفحہ 317-318

3- "اسلام کے تہذیبی مسائل"

از سید قطب شہید ترجمہ: ساجد الرحمان صدیقی

ادارہ معارف اسلامی کراچی جنوری 1979 صفحہ 44-45

4- ایضاً صفحہ 68-69

5- Time - April 23, 1990

6- "Rural Churches In South India"

پی وائی لیوک' جان پی کارمن لندن 1968 صفحہ 38-40

7- ماہنامہ عالم اسلام اور عیسائیت مارچ 1991 صفحہ 5-6

8- ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" اگست 1990ء صفحہ 3-4

9- "بنیاد پرست کی اصطلاح" از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر

سہ روزہ دعوت دہلی 10 اپریل 1990ء

ہم بنیاد پرست کیوں؟

- بنیاد پرستی، بائبل اور قرآن
- بائبل اور قرآن میں فرق
- بنیاد پرستی اور قرآن مجید
- بنیاد پرستی اور مسلمان
- قرآن پاک کا اعزاز
- مسلم پر یہ الزام کیوں؟
- اسلامی دعوت کا تقاضا
- سیاسی آزادی کا استعمال

۳

ہم بنیاد پرست کیوں؟

بنیاد پرستی، بائبل اور قرآن بنیاد پرستی پر فخر کرنے والے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کا مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اس سے مراد اسلام کی اساس پر عمل کرنا، اسے مضبوطی سے پکڑے رہنا ہے۔ بنیاد پرست وہ ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات پر قرآن و سنت کے متن کے حوالے سے یقین رکھتا اور عمل کرتا ہے۔ قرآن مجید کے متن پر ایمان رکھنا، اسے اللہ کی واحد صحیح کتاب سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہمارے سب کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہی نہیں بلکہ اصل الایمان بھی یہی ہے لیکن اس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ ہم قرآن کے متن پر ایمان لانے کی وجہ سے بنیاد پرست ہیں درست نہیں ہے۔ بنیاد پرستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ بائبل کے متن پر عمل کرنے والوں کو بنیاد پرست کہا جاتا تھا وہ عیسائیت کی اساس ہی یہ بتاتے تھے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو عیسائیت کو بائبل کے حوالے سے دیکھنا چاہتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے بائبل پر حرف بہ حرف عملدرآمد کے حامی ہی نہیں بلکہ عامل ہیں۔

یہاں بائبل یا اس پر کسی اور حوالے سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ بائبل بذات خود کوئی متعین یا مقرر کتاب نہیں تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا اور اسے ان کے حواریوں نے جو سمجھا اسے لکھ دیا گیا بلکہ ان کے حواریوں کی الگ الگ انجیل ہے۔ یہاں یہ بحث بھی مطلوب نہیں ہے کہ بنیاد پرست عیسائیوں نے پروٹسٹنٹ بائبل میں ان چودہ الہامی پاروں کو کیوں شامل نہیں کیا جو پرانے عہدنامہ میں اپنڈکس کے طور پر شامل کئے گئے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ عیسائیت کے پاس متعین کتاب ہی نہیں تھی متن کی بات تو بہت بعد میں آتی ہے۔ بہرحال انہوں نے جس بائبل پر بھی

عمل کرنے کے لئے متن کی شرط عائد کی اس کی تعلیمات کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہی تعلیمات ہیں۔ تحریف اور تبدیلی تو اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔ گویا بنیاد پرستی سے مراد ہی یہ لیا جاتا ہے کہ بنیادی اصولوں کی سختی سے پابندی کی جائے۔ لازمی بات ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی سے مراد پھر یہی ہوگی کہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر قرآن پاک اور احادیث کے متن کے ساتھ ایمان لانا اور ان پر سختی سے عمل کرنا۔ اگر یہ سیدھا سا مسئلہ ہو تو کسی کو بھی خود کو بنیاد پرست کہلانے میں عار محسوس نہیں ہوگی لیکن یہ سیدھا سا مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی تحریکوں کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو اس کی اصل شناخت اور تعلیمات کے حوالے سے دیکھتی ہیں اور ان پر عملدرآمد کرنا چاہتی ہیں اور کر رہی ہیں۔ شائد اسی لئے دینی جماعتوں کے بہت سے زعماء خود کو اسلامی بنیاد پرست کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ تو دراصل اسلام پر ہی عمل کرنا ہے اسلام کو آگے بڑھانا ہے۔ جب ہم دنیا سے کہیں گے کہ ہم اسلامی بنیاد پرست ہیں تو لازمی بات ہے کہ دنیا بھی کہے گی کہ ان لوگوں سے ہمیں اصل خطرہ ہے جو یہ بات کہہ رہے ہیں۔ شائد ہمارے زعماء یہ بھی پسند کریں کہ اسلامی بنیاد پرستی کو مغرب اور مشرق میں غیر اسلامی قوتوں کے خلاف ایک ہتھیار بنا کر استعمال کیا جائے تاکہ اسلام کی ایک دھاک بیٹھی رہے اور ہم دنیا کی قیادت حاصل کرسکیں گے جس کے ذریعہ ہم بنی نوع انسان تک اپنی دعوت پہنچا کر دعوت دین کا فریضہ ادا کریں گے۔

ہمیں بہت سے معاملات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ بنیاد پرستی کے عیسائی ماخذ کو تسلیم کرتے ہوئے ہم قرآن پاک کی حیثیت پر ابتدائی ضرب تو نہیں لگا رہے۔ یہ بڑا بنیادی سا سوال ہے کہ کیا ہم قرآن پاک کو بالکل اس حیثیت میں لینا چاہتے ہیں جس طرح عیسائی بائبل کو لیتے ہیں۔ عیسائیت کی بات بار بار اس لئے آرہی ہے کہ ہمارے موضوع کا اصل الاصول ہی اس سے شروع ہوتا ہے ورنہ جیسا پہلے کہا گیا ہے کہ یہ مقصود نہیں ہے اور نہ ہی عیسائیوں کو نشانہ بنانا مقصود ہے۔ مسئلہ تو سیدھا سا یہ ہے کہ ہم قرآن کو اس حیثیت میں دیکھنا چاہتے ہیں جو اس کی اصل اور بنیادی حیثیت ہے۔

بائبل اور قرآن میں فرق بائبل اور قرآن میں بنیادی فرق یہ ہے کہ قرآن پاک اللہ

تعالیٰ کی آخری الہامی کتاب ہے جبکہ بائبل تحریف شدہ کتاب ہے۔ جس کے اصل کا علم نہیں ہے کہ وہ کیسا تھا سوائے اس کے کہ وہ آرامائی زبان میں تھا جو اب ناپید ہوچکی ہے۔ جس کے ماہرین تو کجا کوئی بولنے والا بھی' سمجھنے والا بھی موجود نہیں ہے۔ بائبل میں جو باتیں درج ہیں ان کا موجودہ دور کے جدید علوم کی دنیا سے کھلا ٹکراؤ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا سے ٹکراتی ہے۔ اس میں بیان کردہ باتوں کو آج کے دور میں پرکھنا ممکن نہیں ہے جبکہ قرآن پاک کا اسلوب ہی اور ہے اس کا انداز ہی مختلف ہے۔ قرآن پاک نے اصولوں اور قوانین کو اس انداز سے بنی نوع انسان کے سامنے رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت کا اقرار کرتے ہوئے انسان خلوص نیت سے ہر نئے دور کے حا ت و واقعات کی بنیاد پر راہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ قرآن پاک کی کوئی آیت ساکت و جامد نہیں ہے۔ بائبل کی باتیں جمود کی باتیں ہیں اس لئے کہ وہ الہامی نہیں رہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی ترتیب کردہ باتیں ہیں جن کا اس اعتبار سے احترام تو لازمی ہے کہ قرآن و سنت کی رو سے ہم کسی کو برا کہنے کے سزاوار نہیں ہیں بہرحال اسلام ہی کی رو سے یہ کتابیں اصل نہیں رہیں تاریخ نے اور تحقیق نے بھی ثابت کیا ہے کہ معاملہ یہی ہے۔ بائبل کی مدد سے موجودہ دنیا کے معاملات اور مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود عیسائیوں نے بائبل کی اس حیثیت کے بارے میں جو رویے اختیار کئے ان کے ذریعے انہوں نے چرچ کو سیاست اور محل کے معاملات میں دخیل ہونے سے روک دیا۔ دین اور سیاست کی راہیں جدا کردیں بلکہ مذہب اور سیاست کی راہیں جدا کردیں۔ قرآن پاک کا معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ اس نے تو دین اور سیاست میں دوئی کو ہی بنیادی غلطی قرار دیا۔

بنیاد پرستی اور قرآن مجید جب ہم ان حالات میں یہ بات کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی تعلیمات پر عمل کرنا بالکل بنیاد پرستی ہے تو ہم بادی النظر میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ جس طرح عیسائیوں نے یہ کام کیا ہے کہ بائبل پر عملدر آمد کرکے بنیاد پرست کہلاتے ہیں اس طرح ہم قرآن پر عمل کرکے بنیاد پرست کہلائیں گے تو یہ رویہ غلط ہے۔ قرآن پاک کی زندہ و تابندہ آیات کی زندگی سے انکار ہے۔ اس بات کا انکار ہے کہ قرآن پاک کی آیات اور اس کے الفاظ ہر دور کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جب عدالت کسی خاص

مسئلے میں فیصلہ دیتی ہے تو وہ نظیر بن جاتا ہے۔ مثال بن جاتا ہے۔ آئندہ جب بھی اس قسم کا مسئلہ عدالت کے سامنے آئے گا تو یہ مثال دی جائے گی اس وقت کی عدالت سے کہا جائے گا کہ فلاں وقت میں یہ فیصلہ ہوا تھا یہ قدامت پسندی نہیں ہوگی بلکہ ایک مسئلہ کے تفہیم کی راہ ہوگی۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ متعین اصولوں کے گرد اپنے سماج کی عمارت تعمیر کرنا ہر دور کے مسلمانوں کا فرض ہے حالات کے مطابق فیصلہ کرنا ہی دانشمندی ہے۔ قرآن عظیم الشان نے ہر قسم کے حالات کے لئے پہلے سے طے شدہ فیصلے مسلمانوں کو نہیں دیئے بلکہ حلال و حرام اور حدود و قواعد عطا کئے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ جب ایک صوبے (غالباً یمن) کے گورنر مقرر کئے گئے تو انہوں نے کہا کہ اگر مجھے اللہ اس کے رسولؐ کے احکامات اور تعلیمات سے کوئی چیز کسی خاص مسئلہ کے حل کے لئے نہیں ملے گی تو میں اجتہاد کروں گا کہ اسلام کی اللہ کی اللہ کے رسولؐ کی منشا کیا ہے۔ میں اس منشا کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ گویا اجتہاد کی راہیں کھلی ہیں امت اجماع کرنے میں آزاد ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اجتہاد کرنے کے لئے لازمی ہے کہ مسئلہ جس کا جواب مطلوب ہے اس کا جواب پہلے سے اسلام کی تعلیمات، قرآن و سنت سے نہ ملتا ہو۔ جو لوگ آج یہ بات کرتے ہیں کہ علماء کو سود کے بارے میں اجتہاد کرنا ہوگا وہ انتہائی گمراہ بات کہتے ہیں اس لئے کہ اسلام نے اس کے بارے میں متعین رائے دی ہے کہ یہ حرام ہے۔ یہ انسان کا منہ مار دیتا ہے۔ اس بارے میں بات نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس حوالے سے بات ہو سکتی ہے کہ موجودہ بنکاری نظام سود کے بغیر نہیں چلتا تو کوئی ایسا متبادل نظام تجویز کیا جائے۔ علماء اجتہاد کریں کہ کونسا نیا راستہ ہو سکتا ہے جو موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا بھی کرے اور وہ سودی بھی نہ ہو۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں اجتہاد کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی قتل عام سے اس کو مماثل قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے رزق کے ہم ذمہ دار ہیں۔ بات کرنے کی تو یہ ہے کہ ہم اپنے ذرائع اور وسائل کی منصوبہ بندی کریں۔ عیسائیت میں اجتہاد کے راستے نہیں ہیں۔ وہاں اجماع امت کی بات نہیں ہے گویا اس کے قوانین اور اصولوں سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ بائبل کا ایک خاص حالت میں فیصلہ ہر حالت کے لئے ہے۔ جو فیصلے کردیئے گئے ہیں وہ حتمی اور لازمی ہیں۔ وہ ہر دور کے لئے ہیں ہر آدمی کے لئے ہیں عدالت جب بھی فیصلہ کرے گی تو

وہی فیصلہ کرے گی جو بائبل نے کردیا ہے اس سے باہر عدالت نہیں نکل سکتی۔

بنیاد پرستی اور مسلمان ان واضح صورتوں میں معاملہ سمجھنا زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بائبل آسمانی ہونے کے باوجود الہامی نہ رہی جبکہ قرآن آسمانی بھی ہے اور الہامی بھی۔ دوسرا اہم فرق یہ پڑا کہ بائبل نے وقت کے تقاضوں کا خیال نہیں رکھا اور ہر چیز طے کردی جبکہ قرآن نے وقت کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا اور کہا کہ یہ اصول ہیں یہ حدود اور ضابطے ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے جس مسئلہ کا حل نہ ملتا ہو اسے حل کرلیجئے۔ اس اعتبار سے بھی بنیاد پرستی کے جو روایتی معنی ہیں وہ اسلام پر' اسلام کے ماننے والوں پر منطبق نہیں ہوتے۔ مسلمانوں نے تو قرآن پاک کے متن پر ایمان لاکر ان کی اصل روح کو سمجھا اور ان پر عمل کیا جبکہ عیسائیوں کے لئے واضح طور پر لازم ٹھہرتا ہے کہ بائبل کی اصل روح کی کھوج نہ لگائیں بلکہ اس کو ہر حالت اور ہر مقام اور ہر دن کے لئے ایک ہی جانیں۔ ایک طرف یہ حقیقت تسلیم کی جارہی ہے کہ انسان کا ایمان دن رات میں لمحوں اور سالوں میں بدل سکتا ہے۔ وہ زیادہ اور کم ہوسکتا ہے' وہ مضبوط اور کمزور ہوسکتا ہے لیکن بنیادی اہمیت اس کو حاصل ہے کہ وہ ایمان دار رہے اگر وہ ایماندار رہے گا تو کبھی بھی اس کے پلٹنے کے' اس کے ایمان کے مضبوط ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ انسان کی فطرت بھی یہی ہے کہ وہ زمانے کی تبدیلیوں کا اثر لیتا ہے ان سے متاثر ہوکر بہتری کی طرف بھی جاسکتا ہے اور برائی کی طرف بھی۔ اسلام اس کی اس کیفیت کا مکمل ادراک کرتا ہے اور اسے سمجھتا ہے کہ بہتری کی طرف جاتا ہے برائی سے بچتا ہے اسے وہ ماحول فراہم کرتا ہے کہ وہ بہتری کی طرف ہی جائے۔ اسے دن رات میں پانچ بار پکارتا ہے کہ حی علی الفلاح۔ اس کے نفس کی پاکیزگی کے لئے اسے بھوک اور ادائیگی مال سے آزماتا ہے۔ سفر و حضر کی آزمائشیں دیتا ہے اسے متحرک رکھتا ہے۔ مسلمان جامد نہیں رہتا اس کے ایمان میں کمی بیشی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ بے ایمان نہیں ہوتا اس لئے اس پر کفر کے فتوے لگاتے ہوتے ہوئے بھی احتیاط لازمی ہے۔ دوسری طرف جس کے عمل کو دیکھ کر مسلمان کو آج بنیاد پرست قرار دینے کی کوشش ہورہی ہے وہ بائبل کے ساتھ متحرک نہیں ہوتا۔ اس کی کیفیات نہیں بدلتیں اس لئے کہ اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو بائبل محسوس ہی نہیں کرتی۔ وہ صرف اتوار کے روز با جمعیت اور خوشی میں اسے چرچ آنے کی دعوت دیتی ہے۔

قرآن پاک کا اعزاز الہامی و آسمانی کتاب ہونے' زندہ و متحرک ہونے اور پھر فطرت سے قریب ترہونے کے اعزاز نے ہی قرآن کو مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنایا۔ پھر قرآن پاک کی عملی مثال ہمیں ملتی ہے۔ بائبل کی نہیں ملتی۔ ایک صحابیؓ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ مطہرہؓ سے سوال کیا کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے ہیں تو انہوں نے جوابی سوال کیا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق تو قرآن ہے۔ ہمارے سامنے عملی نمونہ موجود ہے۔ قرآن کی تعلیمات کو جب مسلمانوں تک پہنچایا جارہا تھا تو باقاعدہ یہ بات کہنے کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ گویا قرآن تو مجسم صورت میں بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام جب دوبارہ اس دنیا میں آئیں گے تو وہ اس مجسم قرآن کے امتی بن کے آئیں گے ان کی شریعت نہیں بلکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی حتمی شریعت ان کا دین ہوگی۔ وہ اسلام کے علمبردار بن کے آئیں گے۔ گویا اب بھی جب مسلمان اسلام پر عمل کرنے کی بات کرتا ہے تو اس کے سامنے قرآن پاک کی آیات' اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات طیبہ کھلی کتاب کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔

تصور امت اور قوم پرستی ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ عیسائیت قوم پرستی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ آرتھو ڈاکس عیسائی کے ہاتھوں یورپ میں بوسنیا کے مسلمانوں کا قتل عام تازہ ترین واقعہ ہے۔ بے دردی اور ظلم و تشدد کی انتہا ہے۔ دوسری طرف چرچ آف انگلینڈ ہے اور ویٹی کن میں اسکی حیثیت اور ہے۔ عیسائی قوم پرستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اب ساری یورپی عیسائی برادری کو جمع کرکے ایک ہونے کی بات ہورہی ہے لیکن بوسنیا میں قدامت پسند عیسائیوں کا غیر انسانی طرز عمل اس جانب صاف اشارہ کررہا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے' ہوسکتا ہے کہ آج ممکن ہوجائے چند سال چلے لیکن کیتھولک اور قدامت پسند' پروٹسٹنٹ اور دوسرے گروہوں کا ایک جگہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تو یہ متحد ہوسکتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے لئے نہیں ہوسکتے۔

اس کے برعکس اسلام واضح طور پر امت کا تصور دیتا ہے۔ وہ علاقوں اور قوموں کی سیاست سے منع کرتا ہے۔ وہ ٹکڑوں ٹکڑوں انسان کو تقسیم کرنے کے رویوں کے خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان مختلف قبیلوں سے تعلق رکھ سکتا ہے اس کی زبان مختلف ہوسکتی ہے' اس کا رنگ مختلف ہوسکتا ہے لیکن زبان' رنگ' نسل' علاقہ اور قوم اس کی پہچان نہیں بن سکتے۔ اس کی شناخت اس کا تقویٰ ہے۔ اس کا عمل معیار ہے۔ وہ گورا ہو یا کالا' وہ عربی ہو یا عجمی وہ تو صرف اسی صورت میں مقدم ہے' عزیز ہے' پیارا ہے اگر وہ متقی ہے اگر وہ انسانی فطرت کے زیادہ قریب ہے۔ اسلامی تحریکیں اس چیز کی لئے سرگرم عمل ہیں کہ مسلمان کو مسلمان کے قریب کیا جائے۔ سرحدوں کی زنجیروں کو کھولا جائے۔ قوم پرستی کو ختم کیا جائے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ملنے دیا جائے۔

اب بھی اگر ہم ایک اصطلاح مستعار لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے زیادہ مذہبی ہونے' زیادہ اسلامی ہونے کا تصور ابھرے گا تو ہم بہت سی سچائیوں کا نظری و عملی انکار کردیتے ہیں۔ درحقیقت بنیاد پرست وہ ہے جو حرکت عمل پر یقین نہیں رکھتا۔ جو انسانی فطرت سے دور رہنا چاہتا ہے وہ انسان کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اسے ذات رنگ' نسل' علاقے اور قوم کے چھوٹے چھوٹے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ بنیاد پرست وہ ہے جو زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جن کے مطابق دین ایک جامد اور غیر متحرک شے ہے جس کے سارے فیصلے پہلے ہی کردیئے گئے ہیں جو اٹل ہیں کبھی نہیں بدلیں گے۔

مسلم پر یہ الزام کیوں ؟ آیئے اب دوسری تصویر بھی دیکھیں جس تصویر کی بنیاد پر مغرب ہمیں بنیاد پرست کہتا ہے۔ ہمیں پسماندہ اور ترقی کا دشمن' علم کا دشمن اور امن کا دشمن کہتا ہے۔ پہلی اصولی بات تو یہ ہے کہ اسلام نہ مغرب کے لئے آیا تھا نہ مشرق کے لئے۔ وہ طرفین کا دین نہیں تھا اور نہ ہے لیکن ہم نے اسے مشرق کا دین بنا دیا مغرب کو دشمن قرار دے لیا۔ ہم نے اسے تیسری دنیا کا دین بنا لیا اور پہلی دو دنیاؤں میں اپنا داخلہ بند کرلیا۔ ہم داعی تھے لیکن داعی نہ رہے ہم اقامت دین کے سپاہی تھی لیکن دنیا کی ایک تہائی اکثریت کو ہم نے اسلام سے محروم کردیا۔ ہم اپنے خول میں بند ہوتے گئے۔ دوسروں

نے اس خول پر پہرے بٹھا دیئے۔ ہم نے نکلنا بھی چاہا تو نہ نکل سکے جو بھی نکلا وہ حوادث زمانہ کا شکار ہوگیا۔ جو بچ گیا قوت والا ثابت ہوا اس نے اس خول میں باہر نکل کر دراڑیں ڈالیں لیکن اندر والے اس قدر خوفزدہ تھے کہ وہ تازہ ہوا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لہو سے ایک ایسا کام کیا جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے ان دراڑوں کو بند کرنا شروع کردیا جو دراصل ان کی آزادی کی نوید بن سکتی تھیں۔ اسی لئے اقبال جب درد سے بے چین ہوا تو اس نے اردگرد دیکھا تو اسے صرف نوجوان نظر آئے جو اس کیفیت میں صحیح چوٹ لگاسکتے تھے چنانچہ انہیں مخاطب کرتے ہوئے وہ تقریباً" چیخ اٹھا۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں

کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سردارا

اقبال نے جس قوم کی یہاں بات کی وہ امت مسلمہ تھی۔ امت مسلمہ جو اطراف و اکناف کی پابند نہیں تھی۔ ہمارے بہی خواہوں کا یہ کارنامہ ہے یا پھر بدخواہوں کا۔ جنہوں نے ہمیں مشرق و مغرب میں الجھا دیا۔ ہم بنیادی دعوت لوگوں تک بلاامتیاز ملک و قوم' رنگ و نسل پہنچانے کے ذمہ دار تھے۔ ہمارے لئے کوئی دشمن نہیں تھا۔ جب تک ہم حجت تمام نہ کرلیتے ہم یورپ یا مغرب کو دشمن نہیں کہہ سکتے تھے ہمیں چاہیے تھا کہ یورپ کے صلیبی جنگوں کے بعد کے کردار کا باریک بینی سے جائزہ لیتے۔ ہمیں یہ علم حاصل کرنا چاہیے تھا کہ ہم سپین پر سینکڑوں سال حکومت کرنے کے باوجود ایسے کیوں نکلے کہ وہاں مسلمانوں کا نام لیوا بھی مشکل سے ملتا ہے ہمیں معلوم کرنا چاہیے تھا کہ عیسائیت کی ترویج و توسیع کے لئے عالم اسلام کو کب اور کہاں نشانہ بنایا جائے گا۔ ہم یہ سب کچھ کرنے میں ناکام رہے۔ ہم عام یورپی تک نہیں پہنچ سکے۔ ہم نے مغرب کے نئے دور کے آدمی کو دعوت ہی نہیں دی۔ ہم اس مقام پر آگئے کہ ہم نے اسے دعوت دیئے بغیر سمجھ لیا کہ یہ اسلام کا دشمن ہے۔

تالی دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ مغرب نے مسلمانوں سے تہذیب سیکھی تھی لیکن بعد میں وہ جدید تہذیب کا علمبردار بن گیا۔ انقلاب فرانس ہو یا برطانیہ میں صنعتی دور کا عروج۔ ہم

ہر آنے والے انقلاب سے لاتعلق رہے۔ ہمیں چاہیے تھا کہ وہاں اسلام کی دعوت پیش کرتے لیکن ایسا تب ہی ممکن تھا کہ یورپ خالی کرنے کے باوجود ہمارا رابطہ یورپ سے نہ ٹوٹتا۔ ہم مغرب میں موجود ہوتے اور وہاں کے لوگوں تک اسلام کی ان تعلیمات کو پیش کرتے رہتے جن کے بارے میں اس قدر غلط پروپیگنڈہ کیا گیا کہ شائد ہی کسی اور مسئلہ پر کیا گیا ہو۔ یورپ کی حکومتیں دنیا کو دکھاتی ہیں کہ وہ بہت منصف اور مہذب ہیں وہ اپنی عوام کو صومالیہ اور ایتھوپیا کے بھوک سے پریشان مسلمانوں کی فلمیں دکھا کر سمجھاتے ہیں کہ بنیاد پرست اسلام نے ان کا یہ حال کردیا ہے۔ ہم نے تو تمہیں جنت میں رکھا ہوا ہے۔ یہ حکومتیں سیاسی فوائد حاصل کررہی ہیں اور مسلمان کو بدنام کررہی ہیں کیا اس میں حقیقت نہیں ہے کہ خوشحال مسلمانوں نے بھوک اور قحط زدہ مسلمانوں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ خوشحال ممالک نے دولت کو یوں سمیٹا جیسے یہ کوئی پرندہ ہے اور اڑنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔

اسلامی دعوت کا تقاضا یہ تو سوچنا ہی محال ہے کہ مغرب کی سوچ ہمارے بارے میں اس قدر مثبت ہوجائے گی کہ وہ ہمیں اپنا دشمن نہ سمجھے لیکن ہمیں اسلام کے پیروکار ہونے کی حیثیت سے یہ ضرور ثابت کرنا تھا کہ ہمیں اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اسلام کو اپنی جاگیر سمجھ کر اس کی دعوت کو روکے رکھیں۔ جو لوگ یہ کام کررہے ہیں ہم نے انہیں بھی لعن طعن کی۔ اسلامی تحریکوں نے کسی حد تک یہ کام کرنے کے لئے بیڑہ اٹھا رکھا ہے لیکن جو کام ساری امت کو مل کرکرنا چاہیے اس کے نتائج کچھ اور ہوں گے اور جو ہم تنہا رہ کر کریں گے وہ کچھ اور نتائج دے گا۔ پاکستان سے یورپ جانے والی مذہبی جماعتوں نے فرقہ بندیوں کو وہاں جاکر جس وسیع پیمانے پر ہوا دی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اسلام کو بدنام بھی تو ہم لوگوں نے کیا۔

مغرب سے فاصلوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب اسلام کو مکمل طور پر ایک خطرہ سمجھتا ہے۔ یہاں مغرب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خاندان تباہ ہوگیا ہے وہ زوال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چند ہی سالوں میں امریکہ ٹوٹ جائے گا۔ یہ ساری باتیں ہمارے بارے میں اسلام کے بارے میں منفی ردعمل پیدا کرتی ہیں اگر پاکستان کے خلاف بات سن کر ہمارا خون کھول اٹھتا ہے تو کیا ایک انگریز برطانیہ کے بارے میں خلاف واقعہ بات سن کر یا سچی بات

من کر بھی ہمارے خلاف نہیں ہوگا۔ ہم نے غلط اطلاعات اور غلط تجزیوں پر زیست کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس روش کو بدلنا ہوگا۔ مغرب کے لئے اسلام کو ایک خطرہ بتانے والوں میں یقیناً کیمونزم بھی شامل تھا۔ کیمونزم کے خلاف اسلام نے اس دور کی شاندار جدوجہد کی ہے سوویت یونین کا بکھرنا عصر حاضر میں اس بات کی شہادت ہے کہ اسلام آج بھی ایک زندہ و جاوید نظریہ ہے جو کتابوں کی کوکھ سے نہیں بلکہ اعمال کے حسن سے پروان چڑھا ہے جس نے صرف ایک کتاب پر عمل کرنا سکھایا ہے جس نے ایک اسوہ حسنہ ہمیں دیا ہے۔ کیمونزم کے زوال کے ساتھ ہی مغرب نے ہمیں اپنا دشمن قرار دے لیا۔ برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے بوسنیا کے مظلوم مسلمانوں کے بارے میں ایک مضمون امریکی اخبار نیوز ڈے کی 6 اگست کی اشاعت میں لکھا۔ انہوں نے کہا کہ یورپ کو ایک خطرے کا بروقت احساس کرنا ہوگا مسلمانوں کو بوسنیا سے نکال دیا گیا تو یہ ساری یورپی آبادی میں پھیل کر ٹائم بم بن جائیں گے جو ہمیشہ پھٹتا رہے گا۔ مسلمانوں سے ہمدردی کی یہ بہت ستم انداز روش ہے۔

مغرب جب ہمیں بنیاد پرست کہتا ہے تو اس کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما ہوتا ہے کہ یہ جاہل لوگ ہیں جو چودہ سو سال پرانی بات کرتے ہیں ہم نے مغرب کو سمجھایا ہی نہیں کہ چودہ سو سال پرانی بات آج کے حالات میں کس طرح مناسب ہو سکتی ہے۔ اگر لاکھوں سال پرانے ڈینوسار سے اس کرہ ارض پر زندگی کی ابتداء کے بارے میں سراغ رسانی کی جاسکتی ہے اور لاکھوں سال پرانے کیڑے مکوڑوں کے جرثوموں اور ڈی این اے کو اساس مان کر تحقیق کی جاسکتی ہے تو علم کی یہ میزان بہت کمزور ہے۔ اسلام نے تو انسان کو فطری قوانین دے کر حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کی آزادی دی۔ اگر اسلام اخلاقیات کی لازمی شرط عائد کرتا ہے تو یورپ کو خوب اندازہ ہونا چاہیے کہ لاکھوں کی تعداد میں اسقاط حمل کے مقدمات، لاکھوں خواتین کی عصمت پر حملے، لاتعداد قتل اور دیگر جرائم آخر موجودہ مغربی نظام کی شکست و ریخت کے آثار نہیں ہیں؟ مانا کہ ابھی یورپ کا خاندانی نظام مکمل طور پر تباہ نہیں ہوا لیکن درختوں پر کپڑے باندھ کر جانے والوں کا انتظار یہ ظاہر کرتا ہے کہ جانے والوں کا دکھ ہے اور تباہی کا راستہ جاری ہے۔ یہ موقع ہے کہ ہم یورپ کو یہ احساس دلا سکتے کہ تمہارے خاندانی نظام کی موجودہ ٹوٹ پھوٹ کس طرح رک سکتی ہے۔ اسلام اس کا

کیا حل پیش کرتا ہے ؟ شائد ہم سب انتظار کررہے ہیں کہ یہ معاشرہ مکمل طور پر تباہ ہوجائے اور ہمیں بھی سیاسی برتری کے دن دیکھنے نصیب ہوں۔ اس طرح تو یہ دن کبھی نہیں آئے گا۔

مغرب نے دوسرا اعتراض یہ کیا کہ ہم ترقی کے دشمن ہیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے دور بھاگتے ہیں۔ ہم نے عمل سے اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا اسلام کا کیا تصور تھا؟ آج ہمارا خیال ہے کہ مغرب کو ہم پر جو برتری اور غلبہ حاصل ہے اس کی وجہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی برتری ہے۔ ورنہ اخلاقی برتری تو ہمیں حاصل ہے۔ اس سے بڑی غلط بات کوئی اور بھی ہوگی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ذریعے ایک طرف ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو دشمن قرار دے لیا اور دوسری طرف اپنی کوتاہیوں کا جواز تلاش کرلیا۔ ہم نے جدید علوم کی بنیاد رکھی۔ یورپ نے ان کو ترقی دی یورپ والوں نے تحقیق کی تو انہیں پتہ چلا کہ اسلام تو وہ دین ہے جو اپنے ماننے والے کو کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچی تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ مومن مومن کا آئینہ ہے یہ ساری "چھوٹی چھوٹی باتیں" یورپ نے محدب عدسہ لگا کر دیکھیں اس نے یہ بات نوٹ کی کہ مسلمان کا اتحاد اس کا ایک دوسرے پر اعتماد ہے جو اس کی بنیادی نفسیات کی تشکیل کرتا ہے اسے سماج میں ایک دوسرے سے ملنے، جڑے رہنے کی تلقین کرتا ہے وہ مسجد جاتا ہے تو اس سماج کے مختلف معمار اسے ملتے ہیں یہی حال مکتب و کالج کا ہے۔ مسلمان کے ہاتھ میں میزان آتی ہے تو وہ پورا تول کے دیتا ہے۔ یورپ نے ہماری بنیادی اخلاقی نفسیات پر گہرا حملہ کیا اور جو نفسیات آج ہمارے علم میں ہے وہ ہماری نفسیات کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ہم بدل گئے۔ رشوت، بدعنوانی، اقربا پروری، لالچ، دھوکہ دہی غرض کون سی عادت تھی جو ہم نے نہ اختیار کی۔ ہمارا تعلیمی ڈھانچہ تباہ ہوگیا ہم بے فکر رہے۔ سرمایہ داری کا عفریت ہمارے سروں پر کھڑا رہا اور ہم جدید تقاضوں کے مطابق غیر سودی نظام کے لئے تحقیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کرسکے۔ کیا ہم واقعی قرآن و سنت کے متن پر عمل کرتے آئے ہیں۔ ان حالات میں تو لگتا ہے کہ ہم واقعی بنیاد پرست ہیں جو جہالت کے اصولوں کی پاسداری میں دن رات ایک کررہے ہیں۔

سیاسی آزادی کا استعمال یورپ کی غلامی سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے بعد کا دور ہمارا دور ہونا چاہیے تھا۔ آزاد ملکوں میں آزادی اظہار ہوتی تو سماج میں اسلامی قدروں کا تحفظ آسان ہوتا لیکن ہمارے حکمرانوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ ہم اسلام سے بہت دور رہے۔ اس دوران ہماری جو عادات پختہ ہوئیں وہ منفی زیادہ تھیں ہم نے تشدد اور عدم تشدد کے من مانے فلسفے ایجاد کئے۔

جو مسلم ممالک غیر مسلم قوتوں سے آزادی حاصل کررہے تھے ان میں اسلام کی طرف رغبت زیادہ تھی ۔ وہ زیادہ دیر اسلامی نظام حیات سے الگ تھلگ رہنا ہی نہیں چاہتے تھے لیکن ان کے راستے جو مشکل تھے' ناممکن بنانے کی شعوری کوشش کی جاتی رہی۔ ان ممالک میں یورپ نے ایک عرصہ گزارا تھا بیوروکریسی' تعلیمی ڈھانچہ' معاشی سلسلے غرض ہر شعبہ پر وہ لوگ حاوی تھے جو مغربی تعلیم کے اظہار کے لئے لازمی سمجھتے تھے کہ مقامی مسلمان کو دبا کر رکھا جائے اس کی تخلیقی قوت کو ختم کیا جائے۔ وہ محض کلرک اور اسی قسم کا مہرہ تو بنے لیکن وہ کوئی بڑا کام کرنے کے قابل کبھی نہ ہوسکے۔ اس کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید تھا۔ لوگ نئی آزادی سے مایوس ہوئے ۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے ملک کے لئے مسلمانوں کی لئے۔ وہ پہچان اور شناخت دینا چاہتے تھے جسے لے کر نئی نسل میدان میں آتی تو حالات آج سے بہت ہی مختلف ہوتے۔

مسلمان کے بارے میں یہ سوچنا اجتہادی غلطی سے کم نہیں ہوسکتا کہ وہ بے مقصد ہوسکتا ہے۔ مسلمان خواہ کیسا بھی ہو اس کے سامنے ہمیشہ مقصد رہتا ہے۔ وہ اپنے دین کا دیوانہ وار اظہار چاہتا ہے۔ نئے حالات میں وہ نظام بھی تبدیل کرنا چاہتا تھا وہ استعماری بیوروکریسی اور اسکے استعماری ہتھکنڈوں سے نجات چاہتا تھا لیکن سب سے پہلی رکاوٹ بیوروکریسی بنی جس نے نہ صرف ان کا راستہ روکا بلکہ انہیں دل برداشتہ بھی کیا۔ ردعمل کو خود بیوروکریسی نے پالیسی کے تحت خوش آمدید کیا۔ انتظامیہ اور افسرشاہی اس کے مقاصد سے خوفزدہ تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مقاصد صاف اور نیک تھے۔ مسلمان اپنے دین کا عملی اظہار چاہتا تھا۔ وہ جس معاشرے میں بھی تھا اس کی خواہش تھی کہ اسے اپنے ملک کو اپنے معاشرے کو اسلامی بنانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اس کی یہ معصوم خواہش حکمرانوں اور بیوروکریسی کے لئے ناپسندیدہ تھی اس سے اقتدار کو خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

اسلامی تحریکیں اسی آواز کو ساتھ لے کر چلنا چاہتی تھیں۔ یہ آواز ایک غنیمت تھی اور ہے۔ اسلامی تحریکوں کو بخوبی علم تھا کہ یہ آواز ایک طرف اسلام کی دعوت بن سکتی ہے۔ گلی گلی اور محلے محلے' گھر گھر اور دکان دکان جاکر مسلمان کو اپنے دین پر عمل کرنے کی دعوت دے سکتی ہے تو دوسری طرف یورپی طرز زندگی جس سے بہرحال ہمیں بچنا چاہیے اس سے بچا سکتی ہے۔ بیوروکریسی اور حکمران طبقے نے اسلامی تحریکوں کی اس کوشش کو بھی اپنے خلاف ایک نیا محاذ سمجھا اور اس کے خلاف ڈٹ گئے۔

مغرب کو جن باتوں کی خواہش تھی وہ آہستہ آہستہ پوری ہورہی تھیں اس لئے اسے مسلم ممالک میں براہ راست مداخلت کا زیادہ شوق نہ رہا اسے یہ علم ہوگیا کہ جو بیورو کریسی اور حکمران طبقے اس نے جنم دیئے ہیں وہ وفادار کتوں سے بھی زیادہ وفادار ہیں اس لئے انہیں صرف اور صرف ایک ایسی ہڈی کی ضرورت ہے جو غیر ملکی امداد کی صورت میں دی جائے اور انہیں خوب بلیک میل کرسکے۔ یہ ایک ایسا خاموش معاہدہ تھا جس نے عالم اسلام میں دیرپا نتائج پیدا کئے۔ بیورو کریسی یورپ کی درسگاہوں سے آتی تھی جبکہ اسلام کے بارے میں بات کرنے والا مدرسوں سے آتا تھا۔ جو بہرحال اس اعتبار سے پیچھے تھے کہ انہوں نے اسلام کی اصل میراث کھو کر صرف طے شدہ اسباق ہی یاد کرانے کا کام کیا یہ بھی انتہائی ضروری کام تھا لیکن اسلام نے غوروفکر اور سوچ بچار کے جو راستے کھولے تھے ان سے اصل فائدہ نہ اٹھایا جاسکا۔ جس کی وجہ سے یورپی تعلیم یافتہ زمانے کی دوڑ میں آگے نکل گیا وہ پہلے ہی حکمران تھا مغربی طرز حکومت میں وہ مزید بڑا حکمران بن گیا۔

یہ اسلامی تحریکوں اور حکمرانوں کے درمیان فاصلوں کی ابتداء ہی نہیں تھی بلکہ عوام اور حکومت میں فاصلے پیدا ہوئے۔ سوچ کے دھارے بدلے۔ حکمرانوں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ انہوں نے اس بات کا پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ اسلامی تحریکوں کا اسلام اور ہے اور عوامی اسلام اور۔ عوامی اسلام کو انہوں نے سرکاری اسلام کے پردوں میں چھپانا شروع کردیا اور اسلامی تحریکوں کا اسلام ایک خودپسند' ضدی اور ترقی کا دشمن اسلام قرار پایا جو مغرب کا دشمن ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کا دشمن ہے۔ دوسری تعریف یہ کی گئی کہ یہ مدرسوں کا اسلام ہے ملا کا اسلام ہے فرقوں کا اور مولوی حضرات کی خواہشوں کا اسلام ہے۔

ان حالات میں اسلامی تحریکوں کو کڑا امتحان پاس کرنا پڑا۔ انہوں نے یہ امتحان پاس کیا لیکن اس طرح کہ اس کا نتیجہ آج تک نہ نکل سکا۔ جدید دور میں الجزائر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں اسلامی نجات محاذ کو یہ کہہ کر حکومت دینے سے انکار کردیا گیا کہ یہ حکومت میں آکر سارے نظام کو بدل دیں گے۔ انتقام اور ظلم کا نظام لے آئیں گے۔ ان کے آنے سے انسانی حقوق کو شدید ترین خطرہ لاحق ہے۔ جس کا اثر یورپ پر بھی پڑے گا۔ اس لئے کہ یہ یورپ کی دہلیز پر بیٹھے ہیں۔ یہ الزام بھی لگایا گیا بلکہ مظاہرے کرائے گئے کہ یہ عورتوں کی آزادی اور مساوات کے دشمن ہیں۔ یہ سودی نظام کے دشمن ہیں لیکن اسلامی نجات محاذ نے ان تمام الزامات کو مسترد کردیا اور کہا کہ ہم بے وقوف لوگ نہیں ہیں۔ ہم حکومت چلانے اور اسے اسلامی نظام کے حوالے سے استوار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب یہ محسوس ہوا کہ انہیں روکنا مشکل ہے تو کہا گیا کہ اگر محاذ کی حکومت آئے گی تو بیورو کریسی ہجرت کرکے فرانس چلی جائے گی محاذ کے ترجمان نے کہا کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ لوگوں کی کھیپ موجود ہے ہم کام چلا سکتے ہیں۔ پھر فوج آگئی اور سب کچھ تلپٹ کردیا گیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ بیوروکریسی فوج اور سول انتظامیہ دونوں جگہ بدعنوان تھی۔ وہ اپنی بداعمالیوں کے اس احتساب سے خوفزدہ تھی جس کا اسلامی نجات محاذ نے الیکشن میں دعویٰ کیا تھا کہ یہ احتساب ضرور لیا جائے گا۔ چنانچہ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے اسلامی نجات محاذ کا راستہ روکنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہی ہوا جو ساری دنیا کے سامنے ہے۔

دوسرا تجربہ بھی دیکھئے یہ اسلامی تحریک اور ایک فوجی حکومت کے درمیان تعاون کا تجربہ تھا۔ سوڈان میں اسلامی نیشنل فرنٹ نے ڈاکٹر حسن الترابی کی قیادت میں تعمیر نو کا کام شروع کیا تو انہیں بنیاد پرست کہہ کر جاہل اور انسانی حقوق کے دشمن قرار دے دیا گیا۔ ڈاکٹر حسن الترابی نے جب سوڈان میں کام کا آغاز کیا تو امریکہ نئے عالمی نظام کا شور مچا رہا تھا۔ روس ٹوٹ رہا تھا۔ اور دنیا یونی پولر بن رہی تھی۔ سوڈان میں انارکی اور بے چینی تھی۔ بدحالی اور بھوک نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ انہوں نے پہلے ملک کی اندرونی سیاست کے استحکام پر توجہ دی اس کے بعد انہوں نے اپنے بنیادی نظریے یعنی عرب اور اسلامی دنیا میں تبدیلی پر توجہ دی۔ انہوں نے اسلامی تحریکوں سے قریبی تعلق استوار کیا۔ پہلے سے موجود تعلق کو مزید مضبوط رکھا۔ ان کا نظریہ ہی یہ تھا کہ اسلام لوگوں کے لئے ہے'

مسلمانوں کو متحرک کرنا اصل کام ہے۔ ایک بار یہ متحرک ہوگئے تو پھر ان سے کوئی بھی بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دونوں کام کئے۔ مسلمانوں کو متحرک بھی کیا اور ان سے سوڈان کو ترقی کے راستے پر ڈالنے کا کام بھی لیا۔ یورپ نے ڈاکٹر حسن الترابی اور جنرل عمر حسن البشیر کے اشتراک کو ایک بنیاد پرست اشتراک کہہ کے مسترد کرنے کی کوشش شروع کردی۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا اس لئے کہ نہ تو ڈاکٹر حسن الترابی ترقی کے دشمن تھے اور نہ ہی جنرل عمر حسن البشیر نے لوگوں کو مسجدوں میں بند اور خواتین کے سروں پر زبردستی کی چادر رکھ دی تھی۔

جہاں تک انقلاب ایران کا تعلق ہے بنیاد پرستی کے الزام میں کوئی صداقت اس لئے نہیں کہ اسلام نے روا داری اور درگزر کی جو مثالیں قائم کی تھیں انقلاب ایران کے بعد ان کی جھلک دیکھنے کو نہ مل سکی۔ یہ ایک قومی انقلاب تھا جو ایرانی عوام نے برپا کیا اس لئے اس کے اثرات بھی قومی ہی رہے یہ پوری امت کا احاطہ نہ کرسکا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ پر ہندہ کو بھی معاف کردیا تھا جس نے حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تھا لیکن امام خمینی کسی کو معاف نہ کرسکے۔

بات کو مختصر کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے کہ بنیاد پرستی وجہ افتخار نہیں ہے۔ یہ اسلامی تحریکوں کو بدنام کرنے کا نام ہے۔ اسلامی تحریکوں کو یہ نام استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کے اندر اس کے عام ہونے سے تشدد، جذباتیت اور جلد بازی کو فروغ ملے گا جو بہرحال اسلام کے مطلوب اور معیار نہیں ہیں۔ ہم انسانی ترقی کی دشمنی کا لیبل نہیں لگا سکتے اس لئے کہ ہم ایسا کرتے ہی نہیں ہیں۔ انسانی حقوق کا سب سے بڑا ضامن اسلام ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اسلام کی تعلیمات سے عملی انکار کرکے ہم اپنے متفرق عمل کو اسلام قرار دے لیں تو یہ اسلام نہیں بن جائے گا۔ آج کا بنیاد پرست یہی کچھ کررہا ہے کہ وہ اپنے عقائد اور نظریات کو اسلام کہہ کے پیش کررہا ہے پھر کہتا ہے کہ وہ قرآن کے متن پر بھی یقین رکھتا ہے اس کا یہ دعویٰ باطل ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسے باہر کی دنیا بنیاد پرست کہنا شروع کردیتی ہے۔ اسلام کو اس کے حوالے سے سمجھنا اور عمل کرنا چاہیے نہ کہ اپنے اعمال کو اسلام قرار دے کر دوسروں کو اس پر انگلیاں اٹھانے کا جواز دینا چاہیے۔

اسلام یا اسلامی بنیاد پرستی

- اسلام سے خوف
- عالمی امریکی نظام کے انداز
- عملی تضاد کا مظاہرہ
- اسلامی بنیاد پرستی کیا؟
- بنیاد پرستوں کی پہلی قسم
- بنیاد پرستوں کی دوسری قسم
- بنیاد پرستی اور موجودہ دور
- فکری انتشار کے پیدا کردہ مسائل

اسلام ----- یا ----- اسلامی بنیاد پرستی

اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں مغرب اور اسلام کے درمیان ایک نئی کشکش کا آغاز ایرانی انقلاب کے ساتھ ہوا۔ یہ کشکش مسلمانوں کی اس تربیت کی وجہ سے ابھی تک یکطرفہ رہی ہے جو مغرب نے دور غلامی میں کی ہے۔ نو آبادیاتی دور کے گہرے اثرات، مغرب کی اقتصادی برتری کے علاوہ سب سے اہم عنصر یہ رہا ہے کہ (عالم اسلام میں مفکروں نے خود کو ترقی پسند اور روشن خیال ثابت کرنے کے لئے وہ سب کچھ بھی داؤ پر لگا دیا جو ان کے دفاع کی بنیاد بن سکتا تھا۔ انہوں نے ایک عام آدمی سے زیادہ مرعوبیت کا اظہار کرتے ہوئے مغرب کے اسلام پر حملوں کا دفاع کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے ایک نیا راستہ اختیار کیا اور وہ اسلام کے نقاد بن کے سامنے آئے۔ یہ بہت عجیب صورتحال تھی کہ ایک ایسے معاشرے کا نمائندہ جسے بیرونی ساجوں سے ثقافتی اور سیاسی یلغار کا شدید سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اپنے سماج کی کمزوریوں کی اصلاح اور ان کو دور کرنے کے بجائے ان کا نقاص بن گیا وہ نقاد بھی بنتا تو بات بن پاتی۔ اس نے اپنے معاشرے میں نمائندگی کے حق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اسی کی بنیادیں کھوکھلی کرنا شروع کر دی تھیں۔ لہٰذا بدیہی نتیجہ یہی تھا جو سامنے آیا کہ مغرب کو حملہ آور ہوتے ہوئے کسی قابل ذکر مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اسلامی معاشرے میں جو اپنے حق نمائندگی کو ذمہ داری سمجھ کے ادا کر رہے تھے۔ انہیں دوہرا مقابلہ درپیش تھا ایک طرف اپنے معاشرتی زخموں کا علاج اور دوسری طرف اس پر حملہ آور قوتوں کا سدباب۔ یہ دوہری جنگ کرنے والے اسلامی بنیاد پرست کہلائے یہ وہی عنصر تھا جسے قبل ازیں مقامی متاثرین مغرب، ملا اور اس کی جدوجہد کو ملا ازم کے نام سے یاد کرتے تھے۔)

(جب بات ملا ازم سے بڑھ کے بنیاد پرست تک پہنچی تو بہت کچھ خلط مبحث ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ ملا ازم تو ایک اندھا کوڑا تھا جسے ہر قسم کے علماء کو ہانکنے کے لئے استعمال کیا جارہا تھا۔ بظاہر جہالت اور ضد کے مترادف اس اصطلاح کا ہدف وہ روشن خیال عالم تھا جو سائنس کے اس دور میں بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات کی جدید تشریح کر سکتا تھا۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک جتنے بھی روشن طبع اور روشن خیال مصلح اور عالم آئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے اپنا کردار ادا کیا۔ مسلمان

بنیادی تعلیم سے بے بہرہ تھا وہ ان پڑھ تھا۔ اس کی ناخواندگی کا ناجائز فائدہ انہی نام نہاد ترقی پسندوں نے اٹھایا جو مغرب کے شانہ بشانہ مسلمانوں کو انتشار اور بدامنی کی دہلیز تک لے آئے تھے۔ اس کی واضح مثال جہاد افغانستان کے حوالے سے دی جاسکتی ہے۔ ترقی پسند سوویت یونین کے حاشیہ بردار بن کے پہلے خوفزدہ کرتے رہے کہ اسلام کی بنیاد پر آپ دنیا کی عظیم ترین سپر طاقت کو شکست نہیں دے سکتے۔ جب سوویت یونین شکست کھا گیا تو کہا گیا کہ یہ تو پولینڈ کے لیخ ویلیسا اور پوپ کا کارنامہ ہے۔ اسلام تو محض بونس لینے کے لئے قطار میں کھڑا ہے۔ حالات ثابت کررہے تھے کہ اسلام بونس لینے کے لئے نہیں بلکہ بونس دینے کی پوزیشن میں تھا مشرقی یورپ اور سوویت روس کی ریاستوں کی آزادی اسلام کا عطا کردہ بونس ہی تھا جو افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلا سے انہیں ملا تھا۔ مغرب اس حقیقت کو جانتا تھا اس لئے جب جہاد کا مرحلہ کامیابی کے قریب آیا تو وہ افراد جنہیں وہ پہلے "افغان مجاہدین" کے لقب سے پکارتا رہا تاکہ اسے بھی ان کے طفیل بونس میں حصہ مل سکے۔ بعد میں "افغان باغی" کہہ کے پکارنے لگا جو اس کے مطابق انقلابی اور بنیاد پرست مسلمان تھے۔

اسلام سے خوف مغرب کی اسلام سے اس قدر شدید خوفزدگی کی کیفیت محض اس لئے ہے کہ کیمونزم کے زوال کے بعد صرف ایک اسلامی تہذیب ہی اس کی مغربی تہذیب کے لئے چیلنج ہے۔ "اسی کے عشرے کے ہنگامہ خیز دور اور مغربی سرمایہ دار اور مشرقی کیمونسٹ کے درمیان سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی دور بین مسلم مفکرین یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مغرب کے ذہن میں عالم اسلام ایک خطرے کی صورت میں ابھر رہا ہے------ اسلام کو بطور خطرہ محسوس کرنے والے مغرب کے سامنے چند عوامل تھے جن کی وجہ سے وہ اسلام کو ایک چیلنج سمجھ رہا تھا۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان کشمکش کی ایک پوری تاریخ اس کی پشت پر تھی مغربی مورخ بار بار صلیبی جنگوں کی طرف توجہ مبذول کرا رہے تھے وہ مغرب کو وہ دور بھی یاد دلا رہے تھے جب قومیت کی تحریکوں کے زیر اثر مسلمانوں نے یورپ کی نو آبادیاتی صلیب کو مسترد کردیا تھا۔ 1950 کے عشرے میں نو آبادیاتی قوتوں اور مسلم قوم پرستوں کے درمیان شدید تصادم ہوئے۔ 1953 میں ایران کی تیل کی صنعت کو وزیر اعظم مصدق نے قومیا لیا۔ 1956 میں سویز نہر کے مسئلہ پر قوم پرستی کی لہر اور جمال

عبدالناصر کا برسراقتدار آنا اور 1962 میں الجزائر کی جنگ آزادی کی کامیابی جو 1954 میں فرانس کے خلاف شروع ہوئی اور جس میں الجزائر کی آبادی کا دس فیصد حصہ یعنی دس لاکھ الجزائری مسلمان مرد' عورتیں اور بچے شہید کر دیئے گئے "۔1

عالمی امریکی نظام کے انداز ان واقعات کی بازگشت دور جدید میں بھی ملتی ہے اگرچہ انداز نیا ہے لیکن اصول پرانے ہیں۔ نئے حالات میں امریکہ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس روپ میں سامنے آئے۔ وہ دنیا کو ایک وسیع و عریض نوآبادی میں تبدیل کرکے اس کا تنہا حکمران بننا چاہتا ہے۔ سوویت یونین کی موجودگی میں اس کا دشمن نمبرایک سوویت یونین ہی تھا۔ تازہ ترین صورتحال میں ایک طرف تیزی سے بنتے ہوئے اقتصادی بلاک اس کے لئے پریشانی کا سبب بن رہے ہیں لیکن اس سے بڑا اور اہم مسئلہ اس کے مطابق بھی وہی ہے۔ جسے مغرب سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا ہے یعنی بنیاد پرستی۔ اس کا سیاق و سباق کسی بھی ایسی اسلامی ریاست کے حوالے سے زیادہ خطرناک نظر آتا ہے جو عملی طور پر اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے کا عوامی یا سیاسی اظہار کررہی ہو۔ امریکیوں کو ہمیشہ اس بات کی جستجو رہی ہے کہ وہ اپنے سامنے موجود خطرے کو کوئی مستقل عنوان دیں تاکہ اس کے مقابلے کے لئے یکسوئی پیدا ہوسکے۔ سوویت یونین سے خطرات "کمیونزم" کے حوالے سے اہم تھے چنانچہ انہوں نے اسے "اشتراکی خطرہ" کہہ کے ہمیشہ خود کو اس سے خوفزدہ رکھا اور اپنی آنے والی نسلوں کو بھی کہا کہ اشتراکی خطرہ ان کی زندگیوں' معاشرتی سکون اور اقتصادی تحفظ کے لئے شدید ترین دشمنی کا سزاوار ہے۔ اس خطرے کے تحلیل ہونے کے بعد وہ اسلام کو بحیثیت خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ مغرب بھی یہی سوچتا ہے ۔

عملی تضاد کا مظاہرہ (امریکیوں اور مغربی قوموں کے لئے فلسطین کے لئے جدوجہد کرنے والے ہاتھ' آزادی کے لئے کام کرنے والے انسان دہشت گرد ہیں لیکن ان پر گولیوں کی بارش کرنے والے انسان دوست ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ فائرنگ کرنے والے " انسان دشمن عناصر" پر فائرنگ کرتے ہیں۔ خلیجی جنگ میں بغداد اور دیگر شہروں پر شدید ترین بمباری تاریخ انسانی کے تاریک ترین ابواب میں کئی اضافے کرچکی ہے لیکن بمباری کرنے والوں کی نسبت بمباری کا شکار ہونے والے عراقی ماحولیاتی دہشت گرد ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنے دفاع کے لئے سمندر کے تیل کو آلودہ کردیا تھا جس سے سمندری حیات

خطرے میں پڑ گئی تھی۔ امریکہ سے دوستی سے قبل شام دہشت گرد تھا لیکن حق دوستی نبھانے اور عراق پر بمباری میں شرکت کا انعام ملا اور شام دہشت گرد نہ رہا۔ شام کے وزیر خارجہ فاروق الشرح نے میڈرڈ میں مشرق وسطیٰ میں کانفرنس میں اس وقت سنسنی پیدا کردی جب انہوں نے مغرب کا شائع کردہ ایک پوسٹر شرکاء کے سامنے پیش کیا جس میں اسرائیل کے اس وقت کے وزیر اعظم اسحاق شمیر کو دہشت گرد قرار دیا گیا تھا۔ یہی اسحاق شمیر ہر اسرائیلی وزیر اعظم کی طرح ہر عرب کو دہشت گرد کہہ کے پکارتا تھا۔ گویا عجب صورتحال تھی چور بھی پکارے چور۔ چور۔ اس سارے گورکھ دھندے سے جو چیز برآمد ہوئی ہے وہ بنیاد پرستی کی اصطلاح ہے۔ ایرانی انقلاب آیا تو وہ دہشت گرد اور بنیاد پرست تھا۔ الجزائر میں مسلمانوں نے جمہوری طریقے سے اسلامی تحریک کو عنان حکومت سونپنے کا فیصلہ کیا اور ووٹ کے ذریعے اسلامی سالویشن فرنٹ کو کامیاب کرایا تو وہ بھی بنیاد پرستی تھی اس لئے کہ جمہوریت کو جمہوریت نے قتل کردیا تھا۔ سوویت یونین ٹوٹا تو چھ آزاد اسلامی ریاستیں وجود میں آئیں پھر کہا گیا کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کو اسلامی بنیاد پرستی سے شدید خطرہ ہے۔ ان ریاستوں کا ایران اور پاکستان سے روابط استوار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایران اور پاکستان اسلامی بنیاد پرست ممالک ہیں۔ چنانچہ فروری ۱۹۹۲ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ جیمز بیکر نے ان ریاستوں کا طوفانی دورہ کیا۔ امریکہ کو اصل خطرہ تو یہ تھا کہ پاکستان' ایران' ترکی پر مشتمل اقتصادی تعاون کی تنظیم ECO میں چار وسطی ایشیائی ریاستیں شامل ہورہی تھیں جن سے امریکہ کو یہ خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ اس خطے میں اس کے اقتصادی مفادات متاثر ہوں گے۔ امریکہ کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ نئے عالمی منظر نامے میں عالم اسلام متحد صورت میں سامنے نہ آنے پائے' اسلامی ممالک اس قدر کمزور رہیں کہ وہ کسی بھی سطح پر اسلامی بنیاد پرستی کے خطرے کو عملی شکل دینے کے قابل نہ ہوسکیں۔ مغربی سیکولرازم کی اصل حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ یہ دراصل عیسائیت کا فروغ ہے اب یورپ کے سامنے یہ مقصد نہیں رہا کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنائیں بلکہ ان کا بہترین مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر حالت میں برائے نام مسلمان بنا دیا جائے۔ پوپ نے ---- ایک ایسے اجلاس کی صدارت کی جس میں اس کے بہترین معاون شریک تھے۔ اس اجلاس میں عراق کی تباہی کے بعد مسلمانوں کے معاملات پر غور کیا گیا اس میں ایک اہم

نکتہ یہ تھا کہ مسلمان مسلمان سے بیزار ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب عیسائیت کو اسلام کو میدان سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ ایسا اسلام آہستہ آہستہ زائل ہو رہا ہے اور موجودہ حکمرانوں کی موجودگی میں ایسا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ مشرق وسطیٰ اور دیگر ممالک جن میں بالخصوص مغربی افریقہ کے الفولانی قبائل شامل ہیں ان کی طرف عیسائی مشنریوں کو روانہ کیا جائے۔" 2

اسلامی بنیاد پرستی کیا؟ ایک طرف مغرب کی یہ سوچ ہے کہ اسلام کو کس طریقے سے عیسائیت کے مقابلے سے دستبردار کرایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف ہم خود ہیں جو اس فسانے میں مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ایک نظر ان خیالات پر ڈالنا بھی ضروری ہے جو ہمارے مفکرین نے اسلامی بنیاد پرستی کے حوالے سے پیش کئے ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ "اسلامی بنیاد پرستی" ایک مغربی اصطلاح ہے۔ جس کا مقصد اسلام کو انسانیت کا دشمن، ضدی اور قدامت پسند رویہ قرار دینا ہے اس لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ اسلامی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلم مفکرین بھی انہیں بنیاد پرست اسلامی تحریکیں قرار دیں۔

جناب عزیز الدین احمد پنجاب یونیورسٹی میں استاد رہے ہیں وہ ایرانی انقلاب کے پیش منظر کے طور پر تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" اسلامی بنیاد پرست جماعتیں جو ہمارے پڑوسی ممالک میں موجود ہیں انہوں نے اپنی کمزور ہوتی ہوئی ساکھ کے مقابلے میں اخلاقی حوصلہ اور نئی زندگی حاصل کی ہے۔

مصر کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے یہاں اخوان المسلمون نے ایرانی انقلاب کے بعد نئی کروٹ لی ہے۔ مبارک حکومت کی فراہم کردہ مکمل آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے (مکمل آزادی تو دور کی بات ہے جزوی آزادی بھی مشکل سے ہی میسر آتی ہے) وہ سیاسی میدان میں کود پڑے ہیں اور انہوں نے 1987 کے قومی اسمبلی کے انتخابات میں 60 نشستیں حاصل کیں۔

اردن میں بھی اخوان نے 1989 کے انتخابات میں ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ریاست میں بائیس سال بعد پہلے انتخابات میں بنیاد پرستوں نے 80 میں سے 22 نشستیں (22 نہیں اصل تعداد 39 ہے) حاصل کرلیں جبکہ بارہ دیگر ارکان نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور اخوان نے اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت کی حیثیت اختیار کرلی۔ لیکن اخوانوں

نے خود کو محض جمہوری راستے تک ہی محدود نہیں رکھا سوڈان میں انہوں نے بریگیڈیئر جنرل عمر حسن البشیر کی قیادت میں فوجی انقلاب کی حمایت کرتے ہوئے اقتدار میں شرکت کی اور صادق المہدی کو نکال باہر کیا۔ اب سوڈان کی کابینہ کے تمام ارکان اخوان کے ہیں۔

اسلامی بنیاد پرستی عرب مغرب میں بھی عروج پر ہے۔ یہ خطہ مشرق وسطیٰ کے بعد اسلامی بنیاد پرستی کا ایک مضبوط مرکز بن سکتا ہے۔ 1990 کا سال تیونس اور مراکش میں اسلامی بنیاد پرستی کے عروج کا سال تھا۔ پولیس کے ساتھ تصادم کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں کامیابی سے اپنا کردار ادا نہیں کیا تھا لیکن عسکریت پسندی ان رویوں کا اظہار تھی جو حالیہ برسوں میں بنیاد پرستی کے ساتھ مخصوص رہے ہیں۔ "3

اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں جناب نسیم جعفری صاحب کے نظریات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ "سچے اسلامی بنیاد پرست" کے عنوان سے وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"پچھلے چند سالوں میں مغربی پریس نے اسلامی بنیاد پرستی پر بہت کچھ لکھا ہے جس کا اکثر حصہ جہالت اور تعصب کی نشاندہی کرتا ہے تاہم پاکستانی اخبارات میں بھی اس موضوع پر کافی لکھا گیا ہے۔ اس پر لکھے جانے والے مضامین' خطوط اور تحریروں میں کہا گیا ہے کہ (بنیاد پرستی دراصل وہ رویہ ہے جو انیسویں صدی کے اختتام سے شروع ہوتا ہے جب عیسائیوں کے ایک گروہ نے ڈارون کے انسانی ارتقاء کے نظریے سے مکمل اختلاف کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ انجیل میں بیان کردہ طریقہ ارتقاء پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔

اس عیسائی طبقے کے لئے بنیاد پرستی کے الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا ممکن ہے کہ اس میں کوئی منطق رہی ہو لیکن اس بات کی کیا وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے بھی اسلامی بنیاد پرستی کا لفظ استعمال کیا جائے جو اپنے رویوں اور اعمال میں جہالت' عدم برداشت اور تشدد طریقوں کے استعمال کے ذریعے چاہتے ہیں کہ مسلم امہ آج بھی بالکل انہی اصولوں اور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرے جو اسلام کے اسلاف کے تھے۔ ایسے افراد کے لئے اس لفظ کا استعمال کیوں کیا جائے جو ان رویوں کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ لغت میں بنیادی پرستی کا مطلب یہ دیا گیا کہ بنیاد کی حفاظت کرنا' ضروری' ابتدائی وغیرہ ______ ؟ "4)

("اگر اسلامی بنیاد پرستی کی اصطلاح کسی فرد کے لئے استعمال کرنا مقصود' ہو نیت یہ ہو کہ اسے صحیح انداز سے اور مکمل انصاف کے ساتھ استعمال کرنا ہے تو پھر اسے ہمارے ان

آباؤ اجداد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے جن کی اسلام کے ساتھ مکمل وابستگی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ آج کی جدید دنیا میں اگر کسی کو اسلامی بنیاد پرست کہا جائے گا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ یہ ایسے مسلمان ہیں جو مکمل وفاداری اور ایمان کے ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے راستے پر چل رہے ہیں بدقسمتی سے ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے "۔ 5

ڈاکٹر ضیاء الحق کا کہنا ہے۔

" جدید اسلام میں اسلامی بنیاد پرستی ایسی اصطلاح نہیں ہے جو اسلام کے دینی و سیاسی کردار کی تعریف کرسکے۔ یہ دینی مظہر چند دینی سیاسی جماعتوں کا ایک عام رجحان ہے جو جدید مسلم معاشروں میں بھی موجود ہے۔ یہ رویہ دراصل جدید اور سیکولر ثقافت کے رد عمل میں سامنے آیا ہے۔ پچھلی چار صدیوں میں مسلم معاشرے ایشیا اور افریقہ سے سرمایہ دارانہ نظام سے منسلک رہے ہیں جس سے ان معاشروں میں سیکولر ازم کو فروغ ملا ہے۔ سیکولر ازم ایک ثقافتی عمل ہے جس میں سائنس' جواز' صنعتی ترقی اور شہروں کے پھیلنے کی وجہ سے مذہب کو زندگی کے بہت سے حلقوں اور شعبوں سے نکلنا پڑا ہے اور سائنس کے ساتھ ساتھ تنقیدی عقلی رویوں کے لئے جگہ خالی کرنا پڑی ہے۔

کسی معاشرے میں سیکولر ازم کے عمل کا مطلب یہ ہے کہ وہاں ماڈرن ازم کو فروغ حاصل ہورہا ہے اور معاشرہ وڈیرہ شاہی' قبائلی' دیہی اور اس طرح کی دیگر شکلوں سے آزاد ہورہا ہے۔ یہ لازمی طور پر مذہب دشمن رویہ نہیں ہے اسکا صاف مقصد تو یہ ہے کہ سائنس نے آج انسانی زندگی میں وہی جگہ لے لی ہے جس پر پہلے مذہب کا غلبہ تھا اسلامی بنیاد پرستی اپنی انقلابی حیثیت میں ایک ایسی تحریک ہے جس کا ہدف اسلام کو ایک ماڈرن نظریے کی حیثیت سے متعارف کرانا ہے۔ یہ تحریک اس بات کے خلاف ہے کہ اسلامی تعلیمات کی جدید انداز میں تشریحات کی جائیں جیسا کہ بعض آزاد خیال اور ماڈرن مسلمان کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اسلامی بنیاد پرستی' ایک دینی و سیاسی تحریک کے طور پر' اس بات کے حق میں ہے کہ اسلام کے اصل ماخذ اور جڑوں کی طرف پلٹا جائے اسلام کے اصولوں اور تعلیمات پر ان کے لفظی مفہوم کے ساتھ عمل کرتے ہوئے چودہ صدیوں کے سماجی' معاشی' سیاسی اور ثقافتی

رویوں سے متعلق رہا جائے۔ اسلام کے اصل ماخذ قرآن اور حدیث میں جو اس اعتبار سے انقلابی ہیں کہ وہ وسیع تر اور آفاقی معنی دیتے ہیں جس سے مساوات' اخوت اور آزادی کو تقویت ملتی ہے اور کسی بھی سماجی نظام کو جو غیر منصفانہ ہو تبدیل کرسکتے ہیں "۔ 6

"جدید اسلامی بنیاد پرستی کی دو واضح شکلیں ہیں۔ اول انقلابی اور بچی بنیاد پرستی دوم قدامت پسند بنیاد پرستی۔ انقلابی بنیاد پرستی اسلام کی تشریح کرتے ہوئے مسلم معاشروں کے نیم جاگیردارانہ اور نو آبادیاتی نظام کو ختم کرنے کی بات کرتی ہے اور اسلام کے بنیادی اور ضروری ایمانیات پر اضافوں اور بدعات کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اپنے معاشروں میں مغرب زدہ اور بدعنوان اعلیٰ طبقوں کی مخالفت کرتی ہے۔ جو انقلابی بنیاد پرستوں کے مطابق مغرب کے دارالحکومتوں کے خادم ہیں اور سرمایہ دارانہ تہذیب اور ثقافت کے علمبردار ہیں۔

بنیاد پرستوں کی پہلی قسم اس بنیاد پرستی کے معتقدین جیسا کہ مغرب کے علماء کا موقف ہے۔ عسکریت پسند اور جارحیت پسند ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں ریاست' طبقے یا بیوروکریسی مسلم معاشروں میں کسی بھی قسم کی انقلابی تبدیلی لانے کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ عدم مساوات کے حامل معاشرے میں سماجی' معاشی اور سیاسی اصلاحات کرسکتے ہیں جبکہ ان کی معیشت دن بدن خراب ہورہی ہے اور سیاسی نظام بدعنوان ہوتا جارہا ہے۔ امام خمینی کی قیادت میں ایرانی انقلاب پر مغرب نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا یا لیبیا کے عسکری رویوں پر جس ردعمل کو وہ سامنے لائے یا پھر الجزائر میں اسلامی سالویشن فرنٹ کی انتخابی کامیابی پر ان کا عجلت آمیز رویہ انقلابی بنیاد پرستی کے سیاق و سباق میں سمجھا جاسکتا ہے۔

بنیاد پرستوں کی دوسری قسم دوسری قسم کے بنیاد پرست جنہیں قدامت پسند بنیاد پرست کہا جاسکتا ہے۔ (Elite) سے منسلک یہ لوگ نیم جاگیردارانہ نظام برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ حضرات مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں حکمران طبقہ کے تمام رویے پائے جاتے ہیں۔ وہ اسلام کی قانونی اور روایتی اصطلاحات میں تشریح کرتے ہیں ان کا مقصد غریب لوگوں کو دبانا اور ان کا استحصال کرنا ہوتا ہے۔ پاکستان میں قوانین کو اسلام کے قالب میں ڈھالنے کے لئے 1977 سے 1988 تک مارشل لاء کے تحت جو کوشش ہوئی اسے قدامت پسند بنیاد پرستوں کی دینی و سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان

جماعتوں کے اندر وہ بنیاد پرست جو ردعمل کا اظہار کرتے تھے ان کی کوشش رہی کہ وہ حکمران طبقوں کی عوام کے مقابلے میں مدد کرتے رہیں "۔ ے 7

بنیاد پرستی اور موجودہ دور: "لیکن اب وقت کا فیصلہ بنیاد پرستی کے خلاف ہے۔ صنعتی ترقی کا عمل جاری ہے۔ عوام کے بڑے بڑے حصے خوشحال ہو رہے ہیں۔ معیار زندگی کے بارے میں شعور میں اضافہ ہو رہا ہے---- ایک خاندان جس کا صرف ایک فرد کماتا ہے اب خرچ برداشت نہیں کر سکتا اور عورتوں کے کام کرنے کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور ملازمت ایک حقیقی ضرورت بن گئی ہے اس کا متبادل بھی نہیں ہے ایران میں ایسا ہو رہا ہے۔ ایک عورت جو اپنی بسر اوقات کے لئے کام کرتی ہے وہ آزادی اور مساوات چاہتی ہے اور اب اسے زیادہ محروم نہیں رکھا جا سکتا ۔ کام کی شرائط کی وجہ سے "پردہ بنیاد پرستی" نہیں چل سکتی عورتوں کو بسوں، ریل گاڑیوں اور ٹیکسی کاروں میں سفر کرنا ہے لیکن وہ تمام وقت "محرم" کو ساتھ نہیں رکھ سکتیں ______ ایک بنیاد پرست حکومت کیونکر اس حملے کا مقابلہ کر سکتی ہے جو سی این این، بی بی سی اور دیگر دوسرے ٹی وی اور ریڈیو سٹیشن تہذیبی طور پر کر رہے ہیں۔ بیرونی میڈیا کو روکنے کے لئے کوئی دیوار چین تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ جنسی مساوات، انسانی حقوق اور سیاسی حقوق کے نظریات کو کوئی بھی بنیاد پرست سنسر شپ پھیلنے سے نہیں روک سکتی۔

بنیاد پرستی نے ان ممالک میں جڑیں گہری کی ہیں جن کا انسانی حقوق کا ریکارڈ درست نہیں ہے جبکہ خواندگی کی شرح زیادہ ہے۔ شاہ ایران نے ہر قسم کی سیاسی مخالفت پر پابندی لگا دی تھی اور تنقید کرنے والوں کو بے رحمی سے قتل کرا دیا تھا۔ بدقسمتی سے جس حکومت نے آزادی کے بعد سے الجزائر پر حکومت کی ہے۔ اس کے پاس بھی جمہوریت کے لئے کوئی محبت کا جذبہ نہیں رہا ہے جبکہ فوج اپنے ہی شہریوں کو تشدد کا نشانہ بناتی رہی ہے۔ ان دونوں ملکوں میں پچاس فیصد آبادی خواندہ ہے۔ اب اعلیٰ تعلیم لوگوں کو شعور دے رہی ہے۔ تمام خواندہ لوگ لازمی طور پر تعلیم یافتہ نہیں ہوتے لیکن ان کی ایک اقلیت ضرور ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے معاشی، سیاسی اور سماجی حقوق سے دستبردار نہیں ہوتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر قسم کی آمریت کی مخالفت کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بادشاہ نے مسلط کی ہو یا کسی جنرل یا کسی ملا نے۔ یہیں سے بنیاد پرست کی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے

خیالات اور نظریات دوسروں تک پہنچانے کے لئے آزادی اظہار اور انجمن سازی کا مطالبہ کرتا ہے اور اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے وہ لوگوں کو آمر کے خلاف جدوجہد پر اکساتا ہے۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ جس سیاسی نظام کو وہ لانا چاہتا ہے وہ انصاف پر مبنی ہوگا اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے گا۔ وہ انتخابی اتحاد قائم کرتا ہے متحدہ محاذ بناتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ بائیں بازو اور آزاد خیال لوگوں کو بھی ساتھ ملا لیتا ہے۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد وہ اپنے مخالفین کو اختلاف رائے کا حق بھی نہیں دیتا _ مساویانہ سماجی اور سیاسی مواقع بھی چھین لینا چاہتا ہے "۔ 8

اس موقع پر میاں نواز شریف سابق وزیر اعظم پاکستان کا وہ جملہ یاد کریں جو اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری کے بعد تقریر کرتے ہوئے ادا کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ I am not a fundamentalist لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اگر اوپر بیان کردہ بنیاد پرستی کی تعریف' رویوں اور کردار کو دیکھا جائے تو پورے اسلامی جمہوری اتحاد میں سے صرف اور صرف میاں محمد نواز شریف ایک ایسے معاشی بنیاد پرست کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جنہوں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے پلیٹ فارم سے پہلا الیکشن لڑا اور وزیر اعلیٰ پنجاب بنے۔ مرکز پنجاب کشمکش کا آغاز ہوا تو وہ اس کا عنوان بنے۔ اسی کشمکش کے زیر اثر جب مرکز میں پی پی کی حکومت رخصت ہوئی تو دوسرے الیکشن تک وہ اتحاد کے سربراہ تھے اوربالا خر وزیر اعظم پاکستان بنے۔ ان کے مقاصد پورے ہوچکے تھے وولر بیراج سے کشمیر تک اور افغانستان سے وسطی ایشیا تک' سود کی حرمت سے شریعت کی بالادستی تک ان کی منزل محض اقتدار کا حصول تھی چنانچہ انہوں نے اپنے رفقاء کو ایک ایک کرکے رخصت کردیا یا رخصت ہونے پر مجبور کردیا اور وہ جنہیں اسلامی بنیاد پرست کہا جاتا تھا مفت میں بدنام ہوئے۔

فکری انتشار کے پیدا کردہ مسائل اسلامی بنیاد پرستی کے بارے میں اس بحث کا اصل مقصد یہی ہے کہ ہم اصل خطرے سے آگاہ ہوسکیں۔ مسلمانوں کو دو باتوں میں سے ایک بات کا انتخاب کرنا ہے۔ اسلام یا اسلامی بنیاد پرستی۔ مستقبل میں حکومت کے ایوانوں میں سود اور دیگر غیر اسلامی قدروں کو برقرار رکھنے کے لئے اسلامی بنیاد پرستی مہرہ بنے گی جبکہ اسلام اس کام کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہمارے رویوں کی صورت ایسی ہے کہ ہم ان پر

نظرثانی کریں اور واضح لائحہ عمل مرتب کریں۔ اس وقت عالم اسلام میں فکری انتشار کی صورتحال بہت خراب ہے۔ جس کی وجہ سے مسائل مزید الجھ رہے ہیں۔ اگر مختصراً" جائزہ لیا جائے تو یہ نکات سامنے آتے ہیں۔

(الف) امت مسلمہ بحیثیت مجموعی سکتے کے عالم میں ہے۔ اس کے اندر وحدت فکر اور وحدت عمل نام کی بھی کوئی رمق موجود نہیں ہے اور وہ اپنے حالات پر تجزیاتی نگاہ ڈالنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس پر مستزاد کہ اسے اسلامی بنیاد پرستی کے گمراہ کن پروپیگنڈے کا سامنا ہے۔

(ب) امت میں فکرو عمل کی غیر موجودگی نے بے حسی اور بیچارگی کو رواج دیا ہے۔ حالات پر گرفت نہیں رہی۔ اور ہم اپنے تحفظ کے لئے غیر اقوام کو دعوت دینے اور ان پر تکیہ کرنے پر مجبور ہیں اور وہ اقوام ہمیں بنیاد پرستی کی بحث میں الجھا کر مزید پراگندہ خیال کررہی ہیں۔

(ج) ہم غیر مسلموں کو تو یہ حق دیتے ہیں یا تسلیم کرتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے سماج کی تشکیل کریں لیکن اپنے سماج کی تشکیل اسلامی خطوط پر کرتے ہوئے معاشی اور اقتصادی بلیک میلنگ کا شکار ہورہے ہیں۔ سوڈان کے وزیر کو ایک اسلامی ملک نے اس لئے تیل دینے سے انکار کردیا کہ سوڈان سود پر تیل کا معاملہ کرنے پر تیار نہیں تھا۔

(د) امت میں مشترکہ مفادات پر اتفاق رائے موجود نہیں ہے اس کے ادارے بشمول اسلامی سربراہی کانفرنس بے اثر اور جمود کا شکار ہیں اور امت مسلمہ کے مسائل کا حل نہیں چاہتے۔ عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل نے اگست 92ء میں پاکستان کا دورہ کیا اور پاکستان سے اصرار کیا کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کرلے۔

(ر) عالم اسلام میں جدید علوم سے ابھی تک دوری موجود ہے۔

(س) مسلم حکمرانوں کے پاس اپنی مسلم عوام کی بہتری کے لئے کوئی منصوبے نہیں ہیں اور وہ حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتے ہیں۔

(ش) شہری آزادیاں حاصل نہیں ہیں معاشی طور پر لوگ بے حال ہیں جس سے نو آبادیاتی دور کے تسلسل کو تقویت مل رہی ہے۔

(اہم مستقبل میں "اسلام ــــــ یا اسلامی بنیاد پرستی" میں سے کس کا انتخاب کریں اس کے لئے ہمارے پاس قرآن کی راہنمائی موجود ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہی تو دراصل بنیاد پرستی ہے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے اس کی صاف وجہ یہی ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی فی زمانہ قوت برداشت کی کمی، دہشت گردی، قدامت پسندی، روشن خیالی کی مخالفت اور ترقی دشمنی کا نام ہے جبکہ اسلام ان تمام رویوں کی شدید نفی کرتا ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں کو احترام آدمیت، احترام حقوق اور تحمل و برداشت کی دعوت دیتا ہے۔

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کردے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی "۔ (آل عمران ۔ 19)

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں واضح لائحہ عمل بن جاتا ہے۔ جس کی پہلی بات " اسلام" بطور دین عمل درآمد کا وعدہ ہے۔ دوسرا سب سے اہم کام "مسلم" ہوتا ہے نہ کہ مسلم بنیاد پرست یا کچھ اور

ما کان ابراهیم ــــــ من المشرکین (ال عمران 67)

"ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہرگز غیر مسلموں میں سے نہ تھا"۔

"مسلم" ہونے کی حیثیت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ دنیا اسے خواہ کچھ بھی کہے اسے صرف مسلم بن کے ہی رہنا ہوگا۔

وامرت ان اکون من المسلمین ○ (یونس 72)

(حضرت نوحؑ نے کہا) اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کے رہوں "۔

ہماری پہچان اسلام اور ہمارا نام مسلم ہے۔ یہی ہمارے لئے ہمارے رب کا فیصلہ ہے، اور اسی پر ہمیں خوش ہونا چاہیے۔

الیوم اکملت لکم دینکم ------ الاسلام دینا (المائدہ - 3)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کردیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے (لہٰذا حلال حرام کی جو قیود تم پر عائد کی گئی ہیں ان کی پابندی کرو)"۔

1- "The West Versus Islam"
مشاہد حسین The Nation, Lahore

2- "New Worldorder - A Global Strategy Against Islam"
پروفیسر عالمگیر خان The Nation - Feb. 1992

3- "Islamic Fundamentalism Today"
عزیز الدین احمد The News - 16 March 1992

4- "Real Islamic Fundamentalists"
نسیم اے جعفری Dawn - 18 April 1992

5- ایضاً

6- "Islamic Fundamentalism"
ڈاکٹر ضیاء الحق Dawn - 14 Feb. 1992

7- ایضاً

8- "The Destiny of Fundamentalism"
عزیز الدین احمد The Nation - 29 January 1992

بنیاد پرستی' سیکولرازم اور سیاست

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے کہ عصر حاضر میں "بنیاد پرستی" کی اصطلاح کو اسلام کے خلاف مختلف محاذوں پر استعمال کیا جارہا ہے۔ ثقافتی' سماجی' معاشی اور تعلیمی امور پر اسلام کی دعوت کو مشکوک کرنے' اس کی افادیت اور اصل حیثیت کو ختم کرکے مغربی طرز فکر کو رواج دینے اور مسلمانوں کو ان محاذوں پر حتمی شکست سے دوچار کرنے کے واضح اور متعین مقاصد کا حصول سامنے رکھتے ہوئے اہل مغرب نے اس اصطلاح کو ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ بنیاد پرستی سے اصل مقصود تو یہی ہے کہ اشتراکیت کے خاتمے کے بعد اسلام کو بھی ہر اعتبار سے ختم کیا جائے تاکہ عالمی سطح پر مغربی طرز فکر کی حکمرانی ہو اور دنیا کے سامنے کوئی ایسا نظام نہ رہے جو متبادل ثابت ہوسکتا ہو یا مغربی طرز فکر کو چیلنج کرتے ہوئے اس فکر کے حواریوں کے اقتصادی' سماجی اور سیاسی مفادات کے لئے کسی قسم کا خطرہ بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال کہتے ہیں۔

" مغرب کو اسلام سے خطرہ ہے کہ وہ ان کی تہذیب کو چیلنج کرے گا مغرب کو اشتراکیت سے بھی ایسا ہی خطرہ تھا امریکہ نے جان بوجھ کر مسلم ممالک میں "بنیاد پرستی" کی حمایت کی اور اسے انقلابیت کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ سب سے زیادہ انقلابی فعالیت کا مظاہرہ کرنے والے امریکہ کے قریب ترین اتحادی تھے۔ 81-1977ء کے دوران امریکہ کے صدر کے مشیر برائے قومی سلامتی مسٹر زبیگنو برزنسکی نے اعتراف کیا ہے کہ سوویت یونین کی مسلم ریاستوں میں بے چینی پیدا کرنے اور انہیں بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے یہ اقدام ضروری تھا"۔[1]

اسلام کے پیروکاروں کے بارے میں مغرب کا طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ مغرب نے اسلام کو صحیح تناظر میں جان بوجھ کر پیش نہیں کیا اور حاصل ہونے والے ہر موقع کو اسلام کو بدنام کرنے اور اسے ایک قدیم اور ناقابل عمل نظام کے طور پر متعارف کرانے کی شعوری کوشش کی تاکہ اس کی اصل تعلیمات کے بارے میں ابہام پیدا ہو اور اس ابہام کو گہرا کرتے ہوئے مسلمانوں کو عقیدہ و عمل کی دنیا میں کمزور کردیا جائے اس کے لئے ضروری تھا کہ اسلام کو سیاسی شکست دینے کا مربوط پروگرام ترتیب دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو حملہ شروع کیا گیا اس کے اہم پہلو یہ تھے۔

(i) اسلام کو بطور تہذیبی قوت ناقابل عمل ثابت کیا جائے۔

(ii) مسلمانوں پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام ثابت کیا جائے۔

(iii) عالم اسلام کو جمہوریت دشمن، جمہوریت کش اور آمریت کے حوالوں سے روشناس کرایا جائے۔

(iv) ایک ماڈل اسلامی ریاست کے قیام کو ناممکن بنایا جائے۔

(vii) اسلام کے احیاء کی جدوجہد کرنے والی تنظیموں اور قوتوں کو مسلم معاشروں میں بے وقعت کیا جائے۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے مغربی ذرائع ابلاغ، دانشوروں، سیاستدانوں نے جو کام کیا اس کی پیروی کرتے ہوئے اسلامی ممالک کے خودساختہ ترقی پسند دانشوروں اور ذرائع ابلاغ نے بڑھ چڑھ کر اس "کارخیر" میں حصہ لیا۔ ان مسلم کارکنوں میں ایک گروہ تو وہ تھا جو صرف نام کی حد تک مسلمان تھا وگرنہ وہ ماضی سے ہر قسم کے رشتے توڑنے کو ہی اپنا ایمان قرار دیتا تھا۔ ان میں اشتراکیت کے علمبردار بھی شامل تھے اور اشتراکیت کو ہی سب کچھ قرار دینے والے اس کے غیر تعلیم یافتہ پیروکار بھی پیش پیش رہے۔ یہ لوگ "غیر تعلیم یافتہ" اس اعتبار سے تھے کہ انہوں نے اشتراکیت کو بطور فیشن تو اختیار کیا تھا اس کے اصل مباحث اور اعمال سے انہیں کوئی غرض تھی نہ ہی نسبت۔ دوسرا گروہ ان دانشوروں پر مشتمل تھا جو مغرب کی ادبی و ثقافتی وراثت کی امانت داری کے دعویدار تھے ان کے ذہنوں پر فرائڈ، ڈارون اور آئن سٹائن کی حکمرانی تھی۔ سائنس کی چکا چوند ترقی نے ان کی نگاہوں سے انسان کے روحانی اور مابعد الطبیعات تقاضے محو کردیئے تھے اور یہ طبقہ مابعد الطبیعات

کی انسانی توجیہات کا مادی پہلو سامنے رکھ کر اپنے فیصلے صادر کرتا رہا اور اسلام کی اصل دعوت کی طرف رجوع کرنے والوں کو رجعت پسند اور اس پر عمل کرنے والوں کو بنیاد پرست کہتا رہا۔ عالم اسلام کی مخصوص سیاسی حالت کی وجہ سے تیسرا گروہ حکمرانوں میں پیدا ہوا۔ جس نے اسلامی تحریکوں کو واضح خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں حد سے زیادہ انتہا پسند اور باغی قرار دینے کے لئے اس اصطلاح کو موقع و بے موقع استعمال کیا۔ اسلام کے خلاف ان تمام تر محاذوں کا مشترکہ ہدف یہ تھا کہ اسلام کو سیکولر بناکر انسانوں کے سامنے آنے کا موقع تو دیا جاسکتا ہے لیکن اسے اس صورت میں سامنے آنے کا موقع نہیں دیا جاسکتا جو اس کی دعوت اور تحریک سے بنتی ہے۔ چنانچہ اسلام کو بدنام کرنے کی مہمات شروع کی گئیں اور انہیں حتمی کامیابی تک جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ یہ فیصلہ کسی مجلس یا محفل میں بیٹھ کر نہیں کیا گیا بلکہ اس کو بڑی طاقتوں کی سیاسی ضرورتوں نے طے کروایا۔ سیکولر ازم کو متبادل کے طور پر پیش کیا گیااور اسے ایک ایسا راستہ قرار دیا گیا جو "دین کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ تمام مذاہب اور ادیان کو ایک جگہ زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ گویا مذاہب اور ادیان میں یہ نقص تلاش کرلیا گیا کہ وہ اپنی تعلیمات یا اپنے پیروؤں کے طریقہ عمل کی وجہ سے ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے جبکہ سیکولر ازم انہیں جمع کرسکتی ہے بشرطیکہ وہ جمع ہوتے ہوئے مذہب اور دین کی پہچان کو ختم کرکے سامنے آئیں۔ یہ ایک میٹھی گولی تھی جسے آہستہ آہستہ اپنا عمل ظاہر کرنا تھا اور اس نے کیا۔

سیکولر ازم دراصل انسان کو مذہب سے بے نیاز کرکے عقل اور جواز کے ذریعے اپنے مابعد الطبیعی ضروریات پورا کرنے کا راستہ دکھانے کا نام ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ مذہبی اور نیم مذہبی راستوں کو ترک کرکے دنیا پر نظر دوڑائے۔ وہ کائنات' خالق' آخرت اور انجام کے حوالے سے ہر قسم کے تصورات اور نظریات کو خیرباد کہہ تاریخ کو ان کے " زہر" سے آزاد کروے۔ انسان اپنے آپ کو اس حیثیت میں دریافت کرے کہ اس کے سامنے اس دنیا کو مسخر کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ اس کے اپنے دست و بازو سے نکلتا ہے انصاف اور حقوق کی مشکل شاہراہ پر چلنے سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ لیڈن یونیورسٹی (Leiden University) میں فلسفہ کے پروفیسر کارنیلس وان پرسن کا کہنا ہے کہ سیکولرازم نہ صرف سیاسی اور سماجی زندگی پر حاوی ہے بلکہ ناقابل تردید حیثیت میں ثقافتی

زندگی بھی اس کی رہین منت ہے اور ثقافتی علامتوں سے مذہب کو خارج کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس کے مطابق یہ ایک تاریخی عمل ہے وہ کہتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ معاشرے اور ثقافت کو مذہب سے آزاد کراکے سیکولرازم کے حوالے کردیا جائے تاکہ مذہب نگرانی اور اتالیقی کے فرض سے سبکدوش کردیا جائے۔ ان خیالات کو کارنیلس وان پرسن نے ہارورڈ کے دانشور ہاروے کوکس سے مستعار لیا ہے جنہوں نے ان خیالات کو اپنی کتاب The Sécular City میں 1965 میں پیش کیا تھا۔ اس سے قبل ان خیالات کا اظہار سوئٹزرلینڈ کے Ecumenical Institute of Bossey کی 1959 کی ایک رپورٹ میں کیا گیا تھا۔ ان حوالوں سے سیکولرازم کی جو ترجیحات سامنے آتی ہیں وہ پروفیسر کارنیلس نے بیان کی ہیں ان میں خالق فطرت سے علیحدگی' سیاست سے تقدس کا خاتمہ اور اقدار و روایات کے مذہب اور دین سے تعلق کو ختم کرنا ضروری ہے۔ گویا دین و مذہب میں اخلاقی ساجیات اور بامقصد سیاسیات کے جن نظریات پر زور دیا جاتا ہے سیکولرازم ان نظریات کو باطل قرار دے کر انہیں قطعی طور پر مادی پہچان دینا چاہتی ہے۔ خالق فطرت سے علیحدگی کے بارے میں جرمن ماہر عمرانیات میکس ویبر کا کہنا ہے کہ اس سے مراد مذہب کی غلامی سے نجات دلانا مقصود ہے تاکہ اسے روحانی ضرورتوں اور جادوئی کرشموں سے آزاد کراکے فطری دنیا سے ہم آہنگ کردیا جائے۔ خدا سے الگ تھلگ کرتے ہوئے انسان کو احساس دلایا جائے کہ وہ خدا کا پابند نہیں۔ اس لئے اس کے لئے فطرت یا قدرت کسی خدا کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ اس مادی دنیا کے حصے ہیں۔ اسی طرح سیاست کو "تقدس سے پاک کرنا" کی مہم کے بھی واضح مقاصد میں یہ شامل ہے کہ سیاست کسی مذہبی قوت کے تابع نہ ہو اس پر مذہب کی قانونی پابندیاں نہ ہوں۔ اختیار مذہب کی بجائے سیاست اور اہل سیاست کو حاصل رہے تاکہ سیاسی تبدیلی لاتے ہوئے مذہب کے دائرہ عمل کی حدود کا اطلاق نہ ہوسکے اور آزادانہ یہ تبدیلی لائی جاسکے۔ روایات اور اقدار سے مذہب کی لاتعلقی سے انسان کو موقع ملے گا کہ وہ کسی خدا کا پابند نہ رہے اور سماجی تعامل سے ایسے رویے جنم دے جو اس کے اپنے ہوں کسی دین کے عطا کردہ نہ ہوں۔ اگر واضح الفاظ میں ان نظریات کو بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان نظریات کے مطابق کسی خدا کی ضرورت نہیں خواہ وہ موجود ہو یا نہ ہو' کسی تقدس کی ضرورت نہیں خواہ اس کا تعلق سماجی تعلقات سے ہو یا

سیاسی معاملات سے۔ کسی قسم کے ایسے مقدس رویے کی بھی ضرورت نہیں جو قدروں اور رویوں کو ترتیب دیتا ہو اور خوف الٰہی کا سبب بنتا ہے۔ مذہب ایک افیون ہے جسے کھانے والے مدہوش اور ست الوجود اور کاہل العمل افراد ہیں جبکہ اس کے علی الرغم سیکولر ازم پر یقین رکھنے والے جدید دور کے معمار ہیں ماڈرن ازم کے موجد ہیں اور فی زمانہ انسان کی ذہنی ترقی کے موجب ہیں۔ ان کے ہتھیار سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں اور ان کی کائنات تعقل اور فلسفہ۔ ان کا پیداہ کردہ ادب روشن خیال اور ترقی پسند ہے۔

ان نظریات کو سامنے لانے والوں نے سب سے بڑی کامیابی یہ حاصل کی کہ انہوں نے مذہب کو ایک قدیم طرز فکر قرار دیتے ہوئے مذہب کے پیروکاروں کو ایمان محکم سے کسی قدر محروم کردیا اور ایسے اوہام اور شکوک پیدا کردیئے جو آج کی سائنسی دنیا میں اسے بچ لگتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہب قصوروار تھا جو ان حملوں کا جواب نہ دے سکا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب کے پیروکار قصور وار تھے جنہوں نے مذہب کو اپنی زندگیوں پر قسطوں میں نافذ کیا۔ ان کے اعمال میں یقین کی کمی' تسلسل سے محرومی اور استقامت کی کمزوری شامل ہوتی گئی۔ مذاہب کی تعلیمات کتابوں سے باہر نہ نکل سکیں۔ جدید دور کے پیش کردہ مسائل لاینحل نہ تھے لیکن مذہب کے پیروکاروں نے مذہب کو محض عبادات کا نام دے لیا اور سوچوں پر پہرے بٹھا کر ہر اصلاحی جدوجہد کرنے والے کو منصور بنادیا۔ اس رویے کے پیش نظر ضروری ہے کہ اصل صورتحال تک رسائی حاصل ہو۔ عبداللہ نور الدین اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(1) دنیا میں کہیں بھی سچی اسلامی حکومت نہیں ہے۔ دنیا کے اقتصادی طور پر باہم جڑے ہونے کی وجہ سے یہ مکمل طور پر سود پر مبنی نظام سے منسلک ہے۔ اس لئے کوئی بھی ایسی کوشش جو وسیع پیمانے پر سماجیات اور حکومت میں تبدیلی کے لئے کی جائے ضروری ہے کہ وہ اقتصادی طور پر زندہ رہنے کے راستے وضع کرے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے اندر سے موجودہ نظام کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ چونکہ ماڈرن حکومت کا نام ہی اس حقیقت سے عبارت ہے کہ یہ سیاسی عمل کے عدم تقدس کو حکومت کے اندر سے ابھارتی ہے جو قیادت کے ابھرنے کا راستہ ہے اس لئے اس کے خلاف جدوجہد گہری ہونا ضروری ہے اور اس کا عوام کے وسیع تر حلقے سے تعلق بھی ضروری ہے۔ سیکولر نظریئے کے مطابق

قانونی اختیار صرف اسی کو حاصل ہوسکتا ہے جو حقائق کا زیادہ گہرا اور واضح علم رکھتا ہو۔چنانچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جانوروں پر حکمرانی کرنے کی بات کرنے والے اس بات کو اختیار کریں کہ ان کا حکمران بھی ایک جانور ہی ہو۔ ان کے حکمرانوں کو ان سے کس حد تک ان سے زیادہ باصلاحیت' زیادہ ذہین اور زیادہ سمجھدار ہونا چاہیے خواہ وہ ایک چرواہے کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ درست نہیں ہے اس نظریئے کے مطابق جسے حکمرانی کی ذمہ داری دی جاتا ہے۔ اسے بھی ان سے ہونا چاہیے جن پر وہ حکمران بنایا جارہا ہے۔ اس قسم کی سوچ مکمل طور پر غیر حقیقی بھی ہے اور ایمان اور "جدید" دنیا کے نظریئے سے متصادم بھی۔

(2) "جدید" ذرائع ابلاغ' خواہ وہ صحافت ہو' ریڈیو' ٹی وی' سینما یا صنعت تشہیر ہو یا صنعت چھپائی۔ (ان سب کے لئے ایک ایسی منڈی کی ضرورت ہے جو ان کے تقاضوں کو پورا کرسکے یا ایسے متمول افراد موجود ہوں جو ان کی سرپرستی کرسکیں) یہ بھی سیکولرازم کی آواز ہیں' ان کے ذریعے سیکولرازم کا پیغام کھلے اور دبے انداز میں پھیلتا ہے۔

(3) بنکاری ان قوتوں کا ایک مضبوط ہتھیار ہے۔ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہر کرنسی سود اور جبر کے نظام کا حصہ ہے۔ چونکہ عالمی تجارت کو اس بات سے مشروط کردیا گیا ہے کہ دیگر تمام کرنسیاں اس تسلیم شدہ کرنسی سے تبدیل کی جائیں گی گویا سیکولرازم کا یہ ہتھیار تجارت کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور مسلم دنیا کی تمام کرنسی بھی اسی کے تابع ہے اور اس کا تعلق یا تو ڈالر سے ہے یا مارک سے' یا ین سے اور یا پھر پاؤنڈ سے ہے۔ یہ تمام کے تمام سیکولر نظام کے دست و بازو ہیں۔ تمام کثیر قومی اور بین الاقوامی کارپوریشنیں اور ادارے ان سے منسلک ہیں۔ اور وسیع پیمانے پر دفاع اور تعمیرات کے شعبوں پر بھی حاوی ہیں۔ یہ تمام سودی تعلقات اور سودی لین دین پر قائم ہیں۔

(4) تعلیم وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے کمال مہارت سے سیکولرازم کے تمام نظریات نئی نسل کو منتقل کئے جارہے ہیں۔ جب حکومتوں نے اپنے نوجوان دماغوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے مغرب کے دروازوں پر بھیجا تو انہوں نے حقیقتاً" انہیں روحانی طور پر ذبح کرکے رکھ دیا۔ ان حکومتوں کا تعلق نو آبادیاتی دور سے بھی تھا یہ اس کے بعد کی حکومتیں بھی تھیں اور خودکار نو آبادیاتی کردار بھی رکھتی تھیں۔ ان حکومتوں کی وجہ سے مسلم معاشروں میں

سیکولرازم کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ اب انہیں خیال خام کے تحت بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اربوں کے اخراجات سے عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں تاکہ نئی نسل کو مقامی سطح پر ہی اعلیٰ تعلیم دی جاسکے لیکن ان عمارتوں میں انہیں مردہ دماغ تعلیم دے رہے ہیں اور ان میں مرعوبیت کے شعوری یا غیرشعوری ہر دو طرح کے وائرس داخل کررہے ہیں۔

(5) ادویات (جیسا کہ انہیں سمجھا جاتا ہے) کے بارے میں یہ نظریہ عام ہے کہ موت کو آخری لمحوں پر شکست دینے کے لئے یہ ضروری ہیں لیکن ان کی کیفیت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان سے مرض کو میکانکی یا غیر میکانکی انداز میں ختم کیا جاسکے گا اور سارا عمل مادی ہوگا۔ یہ خیال بھی اس لئے کیا جاتا ہے کہ زندگی دراصل ایک ایسے عمل کا نام ہے جو پیدائش اور موت کا درمیانی وقفہ ہے۔ لافانی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس سے باہر جو کچھ ہے وہ بے اعتقادی اور وہم پرستی ہے۔

(6) سائنس کا بھی ایسا ہی معاملہ ہے چونکہ مغرب میں روایتی زندگی کا خاتمہ نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہوگیا تھا چنانچہ سائنس نے روشنی کا وہ درجہ کمال حاصل کرلیا ہے جو سیکولر ازم کی اصل بنیاد ہے۔ سائنس کی عملی صورت ٹیکنالوجی ان ذرائع کو تخلیق کرتی ہے جن کے ذریعے سیکولر ازم دنیا پر اپنی گرفت مضبوط کرتی ہے۔ ایٹمی توانائی ایک طرف دنیا میں وسیع پیمانے پر تباہی کے خطرات ساتھ لائی ہے یا پھر تابکاری کے ذریعے طویل زہریلے اثرات پیدا کرتی ہے سائنس کے یہ استعمال شیطانی اور برائی پر مبنی ہیں۔ مزید یہ کہ ٹیکنالوجی نے تعمیرات اور فنون کی سائنس کو شکست دے دی ہے۔

(7) فوج کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ طے شدہ حدود میں اپنا کردار ادا کرے اور مروجہ نظام کا دفاع کرے۔ فوج یہ ذمہ داری ادا کرتی ہے لیکن افغانستان کے مجاہدین ہوں، مورو کے جزائر میں حریت پسند ہوں یا انتفادہ کی تحریک فلسطین کے لئے کام کررہی ہو، فوج صرف اور صرف حکومتوں کا دفاع اور تحفظ کرتی ہے۔ اس لئے کہ مروجہ نظام اسلامی نہیں ہوتا (اس کی تازہ ترین مثال الجزائر بھی ہے جہاں فوج نے ہی اسلام کے پیروکاروں کو اقتدار منتقل کرنے سے انکار کرکے سیکولر حکومت کا دفاع کیا اور شہریوں کا بے دریغ قتل عام کیا اور انہیں قید و بند سے دوچار کردیا) فوج کے اندر بھی ایسے عوامل اور عناصر شامل ہوجاتے ہیں جو اسے سیکولر کردار اختیار کرنے پر مجبور کردیتے ہیں ــــــ "2

مسلم ممالک میں حکومت، ذرائع ابلاغ، اقتصادیات، تعلیم، سائنس اور فوج پر موثر کنٹرول کے باوجود ان قوتوں کو اس بات کا گہرا ادراک ہے کہ مسلم عوام کسی بھی وقت اس کنٹرول کے باوجود بغاوت کر سکتے ہیں ماضی قریب کے سیاسی حالات نے اس شعور کو مزید گہرا کیا ہے اور عالم اسلام میں بیداری کی تحریکوں نے اپنے گہرے اثرات مرتب کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ جہاں حکومتیں غیر اسلامی تھیں وہاں بھی جدوجہد ہوئی جہاں ممالک کا تشخص مسلم تھا وہ بھی ان تحریکوں سے آشنا ہوئے اور جہاں سارا ماحول ہی غیر اسلامی بلکہ لامذہبی تھا وہ خطے بھی اسلام کے پیروکاروں کے سیاسی بیداری کے رجحانات کو نہ روک سکے۔ اس دوران اسلام کے پیروکاروں نے نہ صرف محاذ جنگ پر اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اب بھی جہاد کو ایک متحرک اور زندہ عقیدہ کے طور پر جانتے ہیں بلکہ اسے ترک کرنے پر تیار ہی نہیں ہیں انہوں نے جمہوری طرز پر اپنی جدوجہد بھی جاری رکھی تاکہ وہ معروف اور مشہور طریقوں سے بھی یہ ثابت کر سکیں کہ انہیں ہی اسلام کے اصولوں کی آفاقیت اور ابدی حیثیت پر ایمان نہیں بلکہ عوام کی عظیم اکثریت بھی ان کے ساتھ ہے۔ جہاں وہ غلام تھے انہوں نے انتفادہ کی طرز پر جدوجہد کی اور کر رہے ہیں۔ گویا اسلام کا متحرک سیاسی عمل جاری رہا ہے اور اسلام کے خلاف سرگرم قوتوں کو اس کا کوئی توڑ نہیں مل سکا۔ یہ قوتیں جانتی ہیں کہ محض حکومتوں کے سہارے پر وہ طویل المدت منصوبہ بندی نہیں کر سکتیں عوام کے اندر ایسے انتظامات ضروری ہیں جو انہیں ایک متحد اور مضبوط قوت بننے سے روکے رکھیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایسے وائرس استعمال کئے ہیں جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ وائرس قوم کے حافظوں کو صاف کرنے اور اس کے تاریخ سے تعلق کو ختم کرنے کے لئے مصروف عمل رہتے ہیں۔ ان کے خیال میں تاریخ سے تعلق توڑے بغیر وہ عامتہ المسلمین کو ان کے ایمان سے دور نہیں کر سکتے۔ ان وائرس زدہ دانشوروں کے ہاں دین کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ انہیں اس حملے کو کامیابی سے استعمال کرنے کا موقع اس لئے ملا ہے کہ علمائے دین نے جدید عصری تقاضوں کو سمجھنے اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کو پورا کرنے پر وقت صرف نہیں کیا بلکہ جن علمائے دین نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے انہیں عامتہ المسلمین سے الگ تھلگ کرنے کی کوششیں جاری رکھی ہیں ایسے ہی علمائے دین کو بنیاد پرست اور

رجعت پسند قرار دیا جاتا ہے جو احیائے اسلام کی تحریکوں کو ابھارتے رہتے ہیں۔ "بنیاد پرستی" کو اسلام اور دیگر مذاہب کے حوالے سے تسلیم کرنے والے دانشوروں کا کہنا ہے کہ فی زمانہ مذہب قتل و غارت اور تفرقہ و گروہ بندی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ان کے مطابق

"بنیاد پرستی کا ظہور متضاد محرکات اور دباؤ سے ہوتا ہے یہ محرکات اور دباؤ کے عناصر ہمارے معاشروں میں مختلف قسم کی تبدیلیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح اگرچہ اس صدی کے بہت آغاز میں شروع ہوگئی تھی اور اس وقت اس کا سیاق و سباق یہ نہیں تھا اس کو مغربی ذرائع ابلاغ نے اس وقت شدت کے ساتھ استعمال کیا جب شاہ ایران کو مزاحمتی تحریکوں سے خطرہ لاحق تھا اور یہ تحریکیں استعمار کے خلاف مذہبی تحریکوں کی حیثیت سے ابھری تھیں تاہم اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ایرانی تحریک بالآخر ایک بنیاد پرست تحریک میں بدل گئی جو اب ایشیا کے دیگر معاشروں پر اثرانداز ہورہی ہے۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح اگرچہ مبہم ہے تاہم اسے ان تمام تحریکوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جن کا مطمع نظر احیائے اسلام ہے یا پھر وہ سیاست میں اسلام یا مذہب کا عمل دخل چاہتی ہیں------ مذہبی بنیاد پرستی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ادیان کے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جن کے خلاف اسے استعمال کیا جاتا ہے یہ تو مکمل طور پر انسانی زندگی کے اخلاقی اور روحانی رویوں سے الگ تھلگ ہے اور اس کا ان روحانی و اخلاقی قدروں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو بہت سے مذاہب میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں"۔ 3

اسلام کی طرف رجوع کرنے اور اسلامی قدروں کو سیاسی معاملات میں فیصل بنانے کی خواہش مند تحریکوں کا یہ موقف بہت مضبوط ہے کہ پچھلے تقریباً پچاس سالہ دور میں حکومتوں نے جس طرز حکمرانی کو اختیار کیا تھا اس سے کس قدر ترقی ہوئی ؟ نو آبادیاتی دور سے نکل کر مسلمانوں نے غلامی سے کس قدر نجات پائی ؟ غیروں کے در پر سوالی بننے والوں نے کس قدر خیرات وصول کی۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان تحریکوں کا یہ بھی کہنا درست ہے کہ ان حکمرانوں نے اسلام کے علی الرغم جو نظام حکومت اختیار کیا اس کا عشر عشیر بھی اسلامی نہ تھا۔ اس لئے ان تمام نظاموں کی روح ہی غیر اسلامی تھی۔ اسلام کو کہیں بھی آزادانہ متحرک ہوکر نظام حکومت کی تشکیل اور اصلاح کا موجودہ حکمرانوں یا ان کے باپ داداؤں نے موقع نہیں دیا۔ اس لئے اب تک ہونے والی تمام تر پسماندگی کی ذمہ داری

اسلام پر نہیں بلکہ ان نظام ہائے حکومت اور حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو غیروں کے ہو کر رہ گئے لیکن غیروں نے کبھی بھی انہیں اپنا کہہ کے سینے سے نہ لگایا جب موقع ملا استعمال کیا اور پھر کاٹ کر جدا کردیا۔

"مسلم دنیا عام طور پر غیر ترقی یافتہ ہے اقتصادی طور پر بھی اور سیاسی حوالے سے بھی۔ جدید دور کی ترقی کی قوتوں نے مسلمانوں کو دیکھتے ہوئے بھی فراموش کردیا ہے۔ شمالی افریقہ سے عربوں تک اور خلیج کی ریاستوں سے جنوبی اور وسطی ایشیا تک اور مشرق بعید تک کوئی مسلم ملک ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ کرنے کا سزاوار نہیں ہے۔ ترقی سے یہاں مراد یہ ہے کہ کوئی ملک اپنے تمام شہریوں کو ایک باعزت معیار زندگی کے مطابق زندہ رہنے کا حق اور موقع دیتا ہو اور سائنس و ٹیکنالوجی میں خاطر خواہ ترقی کرچکا ہو۔ سیاسی آزادی کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی مسلم ملک خودکفالت کا دعویدار نہیں ہوسکتا"۔4

اس حقیقت کے باوجود اسلام کو بطور نظام زندگی اختیار کرنے کی دعوت دینے والوں کو بنیاد پرست کہہ کر مسترد کردینا کوئی عقلی جواز نہیں رکھتا۔ مسلم معاشروں میں بالعموم اور پاکستانی معاشرے میں بالخصوص یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا پاکستان کے عوام بنیاد پرستی کو اختیار کرنا چاہتے ہیں یا جمہوریت کو؟ اس سوال کو ایک اور انداز میں یوں کیا جاتا ہے کہ کیا جمہوری نظام میں بنیاد پرستی کے لئے کوئی جگہ ہے؟ اور اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ نہیں! اس "نہیں" کی توجیح کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ توجیح کیا مقام اور مرتبہ رکھتی ہے۔

"وہ (جماعت اسلامی اور دیگر بنیاد پرست) جمہوری عمل میں کہیں پورا نہیں اترتے وہ اصل حالت میں ایک ایسی پہچان رکھتے ہیں جس کے ساتھ جمہوری کلچر میں ان کا داخلہ ممکن نہیں ہے۔ ایک جمہوری ماحول میں انسان کو تمام چیزوں کے حوالے سے دیکھنا پڑتا ہے انسان ـــــ خاص طور پر کثرت رائے سے اور بعض اوقات مشترکہ رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ بنیاد پرست ووٹر سے کئے گئے وعدے کو پورا نہیں کرتے بلکہ معاشرے کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔ جبکہ منتخب شدہ افراد اپنے حلقہ انتخاب کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ مافوق الانسانی قوت کی پابندیوں کا اطلاق کرتے ہیں اور وہ خود کو اسی قوت کے سامنے جواب دہ قرار دیتے ہیں۔ پھر جمہوریت انہیں کیونکر اپنے فریم میں داخل کرسکتی ہے؟ یا پھر

بنیاد پرست کس طرح جمہوری نظام میں شامل ہوسکتے ہیں ؟ ان دونوں میں ملاپ ممکن نہیں ہے۔ ------ بنیاد پرستوں کی طرف سے کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بہت سے معاصر معاشروں میں خود کو انتخابی عمل کے ذریعے عوام کے سامنے برائے انتخاب پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں یا بہت قریب ماضی میں الجزائر میں ایسا کیا گیا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا ہے وہ محض ایک دھوکہ ہے یا دھوکہ نما چیز ہے۔ ہماری موجودہ زندگی میں یہ بنیاد پرست کوئی پہچان نہیں رکھتے اور محض اپنے پوشیدہ مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ان کا آئینی عمل کے ذریعے منتخب ہونا محض ایک جھانسہ ہے "۔5

فاضل مضمون نگار آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"حال ہی میں الجزائر میں سیاسی تبدیلیوں میں تنگ کرنے کی حد تک عمل سامنے آیا ہے۔ بنیاد پرستوں نے جمہوری عمل اختیار کرتے ہوئے بیلٹ باکس کامیابی حاصل کی اور یہ مطالبہ کردیا کہ ایک جمہوری ریاست کا نظم و نسق ان کے حوالے کردیا جائے تاکہ وہ برسراقتدار آکر ہر اس شخص کے حلق میں ان اصولوں کو اتار دیں جنہیں وہ عام حالت میں پسند نہیں کرتا۔ درحقیقت یہ بنیاد پرست اقتدار میں آکر پہلا کام یہ کرتے کہ اختلاف رائے کا گلہ گھونٹ دیتے جو کہ جمہوری عمل کی جان ہے۔ آپ کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا ایک جمہوری ریاست یا ایک بنیاد پرست ریاست "۔6

اگر کچھ لمحوں کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اسلام کو سیاسی اقتدار دینے والے بنیاد پرست جمہوری عمل میں بھی پورے نہیں اترتے تو یہ بات کون سمجھائے گا کہ جو لوگ ترقی پسند اور بنیاد پرستی کے دشمن کہلاتے ہیں وہ عوام کی رائے کو کیا اہمیت دیتے ہیں۔ اگر عوام کا حق یہ کہہ کے مسترد کردیا جائے کہ اس نے ایسی جماعت کو ووٹ دیئے ہیں جو اسلام کو نافذ کرنا چاہتی ہے اس لئے وہ جمہوری نہیں ہے وہ ہر قانون بدل دے گی اور ہر رسم کو اسلام سے متعلق کردے گی آخر وہ کون سا جمہوری حق ہے جس کو جواز بنا کر یہ عمل کیا جاتا ہے کہ عوام کی طرف سے تبدیلی کی خواہش بھی نظرانداز کرکے اسے جمہوری عمل قرار دیا جاتا رہے۔ الجزائر میں ہونے والی جمہوری کامیابی پر بھی اگر اسلام کے پیروکاروں کا حق مسلم نہیں ہے تو پھر سوچنا چاہیے کہ انہیں جمہوری عمل سے جدا کیوں رکھا جارہا ہے۔ حالانکہ انہوں نے شدید مصائب میں بھی توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کرنے سے انکار کردیا۔

اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ الجزائر مغرب کی خواہش کی بھینٹ چڑھا ہے۔ جناب ہمایوں اختر نے اپنے ایک مضمون میں مغرب کے اسلام کے بارے میں رویوں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" 1989 کے وسط میں ایک تحقیقی سروے کیا گیا جس میں فرانس کے شہریوں سے دریافت کیا گیا کہ دیئے گئے ممالک میں سے سب سے زیادہ خطرہ آپ کو کس ملک سے ہے ؟ جواب میں کہا گیا کہ 25 فیصد خطرہ ایران سے' 21 فیصد سوویت یونین سے اور 4 فیصد خطرہ عربوں سے ہے کہ ________ لندن کے سنڈے ٹائمز نے مغرب اور سوویت یونین سے کہا ہے کہ وہ مراکش سے لے کر چین تک اسلامی بیداری کے سب سے بڑے خطرے کے مقابلے کے لئے مشترکہ تیاری کریں جو بنیاد پرستی کے جلو میں آرہا ہے۔ ولیم لنڈے نے تجویز کیا ہے کہ روس کو اسلامی احیاء کے شدید خطرے کے پیش نظر مغرب کے ایک اہم حصہ کے طور پر خصوصی کردار ادا کرنا چاہیے۔ سوویت یونین مغرب کے دائیں جانب اہم مقام رکھتا ہے اور بحیرہ اسود سے لے کر ولاڈی واسٹوک تک پھیلا ہوا ہے۔ والٹر میک ڈوگال مشہور مورخ کا کہنا ہے کہ روس عیسائیت کی سرحدوں کا محافظ ہے ہمارا اور اس کا دشمن مشترکہ ہے۔ روس کو مذہبی بنیادوں پر ایک مکمل ایٹمی' جراثیمی اور کیمیائی جنگ میں تباہی کا خطرہ وسطی ایشیا سے متوقع ہے۔ ایرانیوں اور عراقیوں نے پہلے ہی خود کو اس کا اہل ثابت کردکھایا ہے۔ اب مایوس اور پریشان روسیوں کو بھی یہی صورت درپیش ہے اس سے زیادہ اسرائیل / فلسطین کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو وسطی ایشیا میں ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے"۔ 7

جناب ہمایوں اختر نے اس تشددانہ مغربی رویے کے تعارف کے بعد جس حقیقت کا اظہار کیا وہ آج کی مسلم دنیا کی سب سے بڑی اور تلخ حقیقت ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اس مسئلے کا سب سے مرکزی نکتہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے تعلق توڑنے پر مجبور کردیا جائے تاکہ وہ قرآن سے دور ہی رہیں۔

نام نہاد مسلمانوں کو قرآن سمجھنے کی اجازت نہ دو اور نہ ہی انہیں قرآن پر عمل کرنے کی اجازت دو۔ انہیں جدیدیت کو اختیار کرنا ہے انہیں مغربی تہذیب کو تسلیم کرنا ہے اور

انہیں مغربی معاشروں کے ساتھ جڑتا ہے"۔

اسلام کا المیہ یہ ہے کہ اسے مکمل طور پر سمجھا ہی نہیں گیا اور نہ ہی اس کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے۔ اس رویے کا سب سے زیادہ خود مسلمانوں نے ہی اظہار کیا ہے کیا ہم سچے مسلمان ہیں ؟ ایک نام نہاد مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے سکول کے داخلہ فارم میں دین کے خانے میں لفظ "اسلام" لکھتے ہیں اور ایسا ہی ملازمت کی درخواست پر لکھتے ہیں لیکن خود کو اللہ کی نظر میں مسلمان نہیں بناتے۔ "۔ 8

پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی طرف ایک اہم پیش رفت سود کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ تھا جس کے ذریعے یہ قرار دیا گیا کہ سود کو ملکی اقتصادیات سے ختم کردیا جائیگا۔ اس تاریخی فیصلے سے ایک بار پھر "لبرل حلقوں" میں تشویش کی لہردوڑ گئی۔ ان کے خیال میں بنیاد پرستی کے قدم تیز ہونے شروع ہوگئے تھے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ واضح دلائل کے بعد سنایا گیا تھا۔ حکومت نہ صرف اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے میں مصروف ہوئی بلکہ یہ بھی طے کرلیا گیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات کم کرنے کے لئے قانون سازی کی جائے گی۔ اس موقع پر اسلام اور اس کی تعلیمات کے حوالے سے جس قدر بیان بازی کی گئی وہ یقیناً" اسلام سے ایک سنگین مذاق تھا۔ ایک صاحب نے لکھا :

"اس ملک میں ایک خاموش اکثریت کا اس مسئلے پر کیا نکتہ نظر ہے یہ کوئی غیرواضح چیز نہیں ہے۔ یہ ملک جناح اور اقبال کے اسلام پر عمل کرنا چاہتا ہے یہ ہمارا تاریخی تجربہ ہے اور ناقابل تنسیخ فیصلہ بشرطیکہ اسے ملاؤں کے ذریعے دھندلا نہ دیا جائے۔ آج شائد یہ محسوس ہورہا ہے کہ سردار آصف احمد علی کو کسی کی حمایت نہیں ہے لیکن اس سے ہمیں یہ بھی یاد آتا ہے کہ 1938 میں جب قائد اعظم نے پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا تو وہ بھی اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے اس مقصد کو ایک عشرے سے بھی کم عرصے میں حاصل کی تھی "۔ 9

کیا ملاؤں اور مولاناؤں کا اسلام اور ہے اور اقبال اور قائد اعظم کا اسلام اور ہے ؟ کیا ملا ازم حضرات کی عطا کردہ اصطلاح نہیں ہے۔ اقبال اور جناح کو عام آدمی سے جدا کرکے کوئی مقاصد حاصل نہیں کئے جاسکتے۔ اسلام کو مختلف خانوں اور مختلف ناموں سے

پکارنے والوں کو بھی علم ہے کہ اسلام کو متنازعہ بنانے سے لوگوں کے اس پر ایمان اور اعتقاد کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کا تجربہ یہ ہے کہ

1- سیکولر ازم ناکام ہوچکا ہے _ مسلم آبادیوں کو مغرب نواز حکمرانوں کے ذریعے مطمئن کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہ حکمران اپنی پسند کے نتائج حاصل کرنے سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور انہیں سیاسی' اقتصادی اور ثقافتی محاذوں پر شکست کا سامنا ہے۔ اسلامی بیداری کی تحریکیں جنہیں مغرب بنیاد پرست کہتا ہے فی الحال موجودہ صورتحال کا ایک ردعمل ہیں اور ابھی انہیں مربوط حل پیش کرنا ہے جس سے ان سیکولر نظریات کا جواب دیا جاسکے۔ اسلام بطور دین ایک مربوط نظام رکھتا ہے جسے سیکولر ازم شکست نہیں دے سکا۔ اسلام کو اپنے ماننے والوں کے دلوں اور ذہنوں پر جو حکمرانی حاصل ہے وہ اسے متحرک قوت بناتی ہے اس متحرک قوت کو درست سمت میں راہنمائی چاہیے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دور جدید کے اہم تقاضوں کو سمجھا جائے ہم بحیثیت مسلمان اس سطح پر آگئے ہیں جہاں سے ہم ایک ایسے ارتقائی عمل کا حصہ بن رہے ہیں جو ماضی میں ہمارا خاصہ رہا ہے۔

2- سیاسی عمل میں شرکت کو اب کسی بھی ملک میں کسی ایک فرد یا تمام افراد سے روک کر نہیں رکھا جاسکتا۔ خواہ یہ سیکولرالجزائر ہو یا مذہبی سعودی عرب۔ ایک لاوا ہے جس پر ایک باریک نقاب ہے۔ موجودہ حالات کے خلاف شدید ردعمل کے اس لاوے کو روکنا ممکن نہیں ہے تاریخ نئے موڑ میں داخل ہورہی ہے اور سامنے کا راستہ واضح اور صاف ہے اور یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ آنے والے دن کا سورج موجودہ اسلامی معاشروں میں اسلامی قوتوں کی سرخروئی کے ساتھ طلوع ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد خیالی اور ترقی پسندی کے دعوے دار اپنے مقاصد کے حصول میں تو شائد کامیاب رہے ہوں لیکن وہ اپنے معاشروں میں مسلم عوام کے غم اور مسائل کے حل میں کوئی کردار ادا کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ان کے موجودہ حالات اس نہج تک آگئے ہیں کہ اب زیادہ عرصہ تک اسلام کی تمدنی قوت کو سیاسی عمل سے مطابقت کرنے سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس تعامل اور مطابقت کے ساتھ ہی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام مشروط ہے۔

3- عالمی سطح پر ہونیوالی تبدیلیوں نے مسلمانان عالم کو اس بات کا احساس بھی دلایا ہے کہ مشرق وسطیٰ' فلسطین' کشمیر' افغانستان' اری ٹیریا اور وسطی ایشیا میں ہونے والی جغرافیائی اور

سیاسی و عمرانی تبدیلیوں کے پس منظر میں جو قوت سرگرم عمل ہے وہ دراصل اسلام ہی ہے جس سے مغرب اور امریکہ کو یہ خطرہ درپیش ہے کہ اسلام اشتراکیت کے خاتمے کے بعد ایک عالمی قوت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ اس خطرے کے پیش نظر وہ اسرائیل اور اس قسم کی دوسری قومیتوں کو آگے لارہے ہیں صیہونیت کے خلاف اقوام متحدہ نے اپنی وہ قرارداد خود ہی مسترد کردی ہے جس میں صیہونیت کو ایک نسلی گروہ قرار دیا گیا تھا۔ سلامتی کونسل کا نیا کردار تیسری دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص جنگ کا طبل بجا رہا ہے۔ مغرب اور امریکہ کو اس بات پر سخت تشویش لاحق ہے کہ افغانستان کی اسلامی حکومت وسطی ایشیا اور جنوبی ایشیا کے درمیان پل بن جائے گی اور یہ سلسلہ مغربی ایشیا تک دراز ہوکر اسلام کو ایک عظیم قوت کے طور پر سامنے لائے گا۔

ان حقائق کو شعور کا حصہ بنانے والے مسلمان موجودہ حالات سے نکلنے کے لئے بھی سوچتے ہیں۔ سب سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو مغرب کی مرغوب کن گرفت سے نجات کیونکر ولائی جائے اور دنیا پر یہ کیونکر ثابت کیا جائے کہ اسلام بطور نظام زندگی مکمل اور بہترین نظام ہے۔ اس کا واحد حل تو یہ ہے کہ قرآن سے تعلق کو جوڑا جائے اور اس سے اپنا رشتہ مضبوط کیا جائے تاکہ ہم اپنے مرکز کی طرف لوٹ سکیں۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہم مغرب کے نفسیاتی اور سیاسی حملوں کا پیشگی ادراک کریں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کے لئے سرگرم عمل رہیں۔ اسلام کو بلا جواز ایسے بندھنوں کا شکار نہ کریں جو خود اس نے نہیں لگائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم انتشار سے بچتے ہوئے اس امر کی کوشش کریں کہ علمائے حق کو عصر حاضر کے تقاضوں کی طرف متوجہ کریں تاکہ وہ جدید مسائل کا حل تلاش کرکے مسلمان کو سیاسی' سماجی اور تمدنی طور پر ایک زندہ قوم کی طرح زندہ رہنا سکھائیں۔ یہی واحد راہ نجات ہے۔

-1 "Phantoms of Fundamentalism"

افضل اقبال The Muslim - 15 March, 1992

2- "An Introduction to Secularity and Secularism In Relation to the Traditional Islam"

عبد اللہ نور الدین دور کی صفحہ 49-51

"The Muslim Education Quarterly Nov. 4 1990"

3- احمد علی کا مضمون "The News - April 3-9, 1992.

4- "Muslims In Search of their Destiny"

سید فہد حسین The Muslim - 20 March 1992.

5- "Fundamentalism or Democracy"

اے پی ایس جعفری

The Muslim - 24 January, 1991.

6- ایضاً

7- "Revulsion of Muslims Against Themselves" از ہمایوں اختر

8- ایضاً

9- ایس ایم عثمان کا مضمون The Muslim - 6 Feb.1992

اسلام اور مغربی تہذیب

- ایک عمومی جائزہ
- فرد کی حیثیت
- مذہب کا کردار
- امریکی عظیم ہیں
- سرد جنگ کے بعد
- مغرب کا انسان
- مغربی تہذیب سے انکار
- خود فریبی کا حال
- بنیاد پرستی ایک سیاسی نعرہ
- اچھائی کا برائی سے موازنہ
- حکومت اور اجتماعیت
- اسلامی نظام اور موجودہ دور کی مشکلات

- عالم اسلام کی اخلاقی حالت
- دینی احیاء کا پہلا عنصر
- دینی احیاء کا دوسرا عنصر
- ایک غلط سوچ کا ازالہ
- گروہی ظلم کے طریقے
- اسلامی اور غیر اسلامی تحریک
- دینی احیاء کیلئے توجہ طلب امور
- اسلامی حکومت
- پاکستان ایک اسلامی ریاست
- تصور امت اور قوم پرستی
- مثالی ریاست کی ضرورت
- عوام اور حکومتوں میں فاصلے
- متبادل راستے
- عیسائیت اور یہودیت
- سرمایہ داری اور سوشلزم
- ایک اہم سوال

اسلامی اور مغربی تہذیب

ایک عمومی جائزہ آج مسلم دنیا کے سامنے بنیادی نوعیت کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ان مسائل کی فکری اور عملی اہمیت اگلی صدی میں مسلمانوں کے مستقبل سے وابستہ تقاضوں کو سمجھنے اور ان کو مسلم دنیا کے مجموعی مفاد میں پورا کرنے میں مضمر ہے۔ آج کی جدید ترین دنیا نے بعض سوالوں کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ جو ماضی میں بھی اہم تھے لیکن سرد جنگ کی کیفیت طاری رہی جس نے ایک طرف تو اشتراکیت اور سرمایہ داری کے کھیل کو فروغ دیا اور دوسری طرف امت مسلمہ کے اندر اپنے علیحدہ تشخص کی پہچان اور اسے منوانے کے اسلامی رویوں کو پہلی اور دوسری دنیا سے وابستگیوں نے متاثر کیا۔ ہر مسلم ملک اور علاقے میں کئی سطحوں پر یہ کشمکش جاری رہی اور سرد جنگ کے خاتمے کے باوجود امت مسلمہ کے اندرونی محاذوں پر لڑی جانے والی اس سرد جنگ کے خاتمے کے آثار نہیں ملتے۔ مغرب کی خواہش ہے کہ یہ سرد جنگ اس کے حق میں ختم ہوجائے اور جن نو آبادیاتی حکمرانوں کی نسل اس نے تیار کی ہے عالم اسلام ان سے اتفاق کرلے جبکہ اپنے علیحدہ اسلامی تشخص کی پہچان اور سرمایہ داری کے نقصانات سے بچنے کے خواہش مند اسلامی حلقوں میں اس "اتفاق رائے" یا لائحہ عمل کے مجوزہ اتفاق کو موت یا خود کشی سے کم تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج عالم اسلام کے سامنے بنیادی مسائل یہ ہیں کہ کیا امت مسلمہ کی موجودہ قیادت دوسروں پر انحصار کرنے کی عادت ترک کرسکتی ہے اور مسلم عوام کو پسماندگی اور غربت کے جال سے آزادی دلانے کا وعدہ کرسکتی ہے؟ کیا وہ وقت نہیں آگیا کہ اشتراکیت کے خاتمے اور سرمایہ داری کی صف بندی کی کوششوں کے درمیان ہم اپنی جگہ الگ سے بنائیں _ ہم بھی روشن راہوں کے راہی بنیں اور اپنی تقدیر خود سنواریں۔ کیا ہم حوصلہ، جرات، ذہانت اور سچائی کو مسلمانوں کی اصل قوت کے طور پر منوا سکتے ہیں اور بزدلی، کم مائیگی، ذہنی غلامی اور سہولیات و مفادات کے فریب سے خود کو آزاد کرا سکتے ہیں؟

اہل مغرب ان بنیادی امور پر غور و فکر کرنے، ان کے حل کے راستے تلاش کرنے اور امت مسلمہ کے علم کو سربلند کرنے کے عمل کو بنیاد پرستی قرار دے کر الزام عائد کرتا ہے کہ اہل اسلام چودہ سو سال قبل کی دنیا میں واپس جانا چاہتے ہیں یہ رجعت پسندی ہے کہ موجودہ دنیا کو اس کے سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کی کوششوں سے دور کردیا جائے اور دنیا

میں ایسے ممالک اور خطے وجود میں آجائیں جو الگ اقتصادی اور معاشی نظام کے حامل ہوں- اہل مغرب کے لئے یہ بات اس لئے بھی ناقابل قبول ہے کہ دنیا میں دولت کے ذرائع اور قدرتی وسائل کے ذخیرے ان علاقوں میں زیادہ بڑی تعداد میں ہیں جہاں مسلم ممالک ہیں- یہاں کسی قسم کی احیائے اسلام کی جدوجہد اہل مغرب کے مفادات پر ضرب قرار دی جاتی ہے- اسلام اور مغرب کی اس کشمکش کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فرد' خاندان اور سماج کے اس فرق کو ضرور ذہن میں رکھیں جو اہل مغرب اور اسلام کے درمیان موجود ہے- اسلام میں فرد کو خاندان اور سماج کی ایک اکائی قرار دے کر اس سے اجتماعی کاموں کی توقع کی جاتی ہے اور اس سے مادر پدر آزاد رویوں کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے جبکہ مغرب میں اجتماعی زندگی کو فرد کی ذات سے دور رکھنے کی پوری جستجو رہتی ہے- وہاں مذہب فرد کی ذات سے متعلق ہے سماج سے نہیں اسی لئے خاندان میں وہ رشتہ پیوند بھی نظر نہیں آتا جو ایک اسلامی ماحول سے خاندان کو میسر آتا ہے اور مذہب اجتماعیت کا مسئلہ بنتا ہے-

فرد کی حیثیت فرد کیا ہے؟ انسان کی کیا حیثیت ہے □ اسے سماج میں کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ اس کے حقوق اور فرائض کیا ہیں؟ اس کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہمیں اسلام اور مغرب کے مابین کشمکش کی بنیادوں سے متعارف کراتے ہیں- اہل مغرب کا کہنا ہے کہ انفرادی حیثیت کے اعتبار سے انسان سماج سے زیادہ ممتاز ہے اس لئے سماج کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے نظام وضع کرے جو انسان کو انفرادی حیثیت میں آزادی اور انصاف فراہم کرے تاکہ انسان ایک آزادانہ ماحول میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکے- لیکن مغرب کا ہی مسیحی طبقہ کہتا ہے کہ یہ آزادی تو لازمی طور پر اسے ملنا چاہیے تاہم اسے سماجی نظام کے مختلف النوع تقاضوں کے تابع ضرور رہنا ہوگا مسیحی سیاستدان جو خود کو جمہوریت پسند کہلوانا پسند کرتے ہیں وہ اجتماعیت اور انفرادیت کی حدود متعین کرنے کے حامی ہیں تاکہ وہ ایک سیاسی اور سماجی شناخت ترتیب دے سکیں- لیکن مغرب کا لبرل طبقہ اس شناخت کے بھی خلاف ہے- وہ مذہب کے اس عمل کو شرمناک قرار دیتا ہے کہ مذہب انسان پر پابندیاں عائد کرکے اس کی جبلی خواہشات کی تہذیب چاہتا ہے- جس سے ڈارون کا انسان کہیں گم ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا انسان لے لیتا ہے جسے آدم

اور حوا کے تعلقات سے وجود دیا گیا تھا۔

مذہب کا کردار مغرب میں مذہب کی بنیاد پر یا مذہب کو سیاست کا جزو بنانے والے مسیحی جمہوریت پسندوں کا موقف ہے کہ یورپ دراصل عیسائیت کی دنیا ہے جس کی تہذیب و اخلاق کے تمام سوتے مغرب میں عیسائیت سے ہی پھوٹتے ہیں ان کے مطابق عیسائی دنیا کا مشن ہی یہ ہے کہ وہ یورپ میں مغربی تہذیب کو سیکولر بنیادوں پر استوار ضرور کرے لیکن کبھی بھی یہ کوشش نہ کرے کہ وہ اس سیکولر بنیاد کو سیاست کے علاوہ کسی اور شعبے پر بھی لاگو کرے۔ سیاست لازماً سیکولر ہوگی تاہم سیاسی زندگی کی کامیابی کے لئے یورپ کے عیسائیوں کا ووٹ بنک ہی اصل قوت ہے۔ یورپ کی بیشتر سیاسی جماعتوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ خود کو کیتھولک پارٹی کہلانے کے بجائے کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کہلوایا جائے۔ چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی کے اصول کو برقرار رکھا جائے اور مسیحی اصولوں پر سیاسی نظام وضع کیا جائے۔ مذہب کو طلاق' اسقاط حمل اور ضبط ولادت کے محاذوں پر کام پر لگایا جائے جبکہ سیاست کو خودانحصاری' اقتصادی و معاشی برتری اور سفارتی غلبے کے لئے بروئے کار لایا جائے۔ ایک ایسی دنیا وجود میں لائی جائے جو اپنے سماج کے حوالے سے فرد کو عزت دے' اسے عالمی' ناقابل تردید اور ناقابل تنسیخ حقوق عطا کرے۔ فرد کی زندگی آزادی سے عبارت ہو وہ صرف آزادی سے زندگی بسر ہی نہ کرسکے بلکہ شاندار انداز سے زندگی گزارے اسے یہ حق دیا جائے کہ اس کی ذات' اس کا دل و دماغ جس چیز کو سچ قرار دے وہ اس سچ کو اختیار کرسکے خواہ یہ سچ سوسائٹی کے نزدیک جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ذات کی پہچان کے اس عمل میں وہ اپنے وجود سے سارے لباس اتار کر برہنہ پھرنا چاہے تب بھی اسے کوئی نہ روکے حتیٰ کہ کوئی اس بات کا شکوہ نہ کرے کہ اس کے یوں پھرنے سے اس کی آزادی سلب ہوگی لیکن جہاں یہ چلن عام ہوجائے وہاں شکوہ کرنے والے پر شکایت ہوسکتی ہے کہ اندھوں میں کانا راجہ نامنظور۔ اس لئے یا تو وہ ان میں شامل ہوجائے یا پھر اعتراض نہ کرے۔ امریکہ کے ساحلوں پر قائم ننگے کلبوں پر ایک بار کسی نے اعتراض کیا تو اسے کہا گیا کہ آپ اس طرف تشریف نہ لے جائیں۔ مزید برآں فرد کو اس آزادی کے ساتھ ساتھ اظہار' فنی تخلیق' اطلاعات کے حصول' انجمن سازی' عوامی یا ذاتی زندگی میں اپنے مذہب کے اظہار کی آزادی ہونا چاہیے اور یہ کہ اسے ہروہ آزادی دی جائے جس کا مطالبہ اس کا

ضمیر کرتا ہے ان رویوں کو مغرب انسانیات کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ مغرب کا مطالبہ ہے کہ انسان کو مغرب میں عیسائی ثقافت کے تمام بنیادی اصولوں کی طرف واپس آنا ہوگا۔ جن کے ذریعے انسانوں کی قدروقیمت کا پتہ چلتا ہے۔ لوگوں کو اپنے تشخص کے مادیت پر مبنی اظہار کے بجائے عیسائی شناخت کے حامل اظہار کو اختیار کرنا چاہیے۔ مادیت کا خاتمہ کرکے اسے عیسائی اخلاقیات کی طرف پلٹنا چاہیے۔ ریاست کی تکمیل اسی صورت میں ہوگی جب ریاست کو مسیحی بنیادوں پر کھڑا کیا جائیگا۔ اور اس تکمیل کی منزل ایک متحدہ یورپ ہے جو قوت کے مینارہ کا کام دے گا اور جہاں فرد کو انفرادی زندگی کی تمام تر خوشیاں میسر ہوں گی اور انہی کے ذریعے وہ اپنے مشن کی تکمیل کرسکے گا۔

اٹلی کے کرسچین ڈیموکریٹ پارٹی کے پروگرام کے آغاز میں لکھا ہے کہ ہمیں ان مسیحی قدروں کو تحفظ دینا ہوگا جو ہمارے لوگوں نے قائم کی ہیں یہ پارٹی دراصل مسیحی جذبوں کی عملی تصویر ہے جس کا مقصد لبرل ڈیموکریسی کو پروان چڑھانا ہے۔ اس کا طریقہ کار مکمل طور پر سیکولر رہے گا۔ بلجیم اور ہالینڈ میں دوسری جنگ عظیم کے بعد بطور خاص اس طرز جمہوریت کو فروغ دیا گیا۔ تجربات سے پتہ چلا کہ یہ طرز جمہوریت معاشی اور سماجی جمہوریت کو ختم کردیتا ہے۔ ان تجربات کے نتیجہ میں "انسانی حقوق" کا مسئلہ اٹھایا گیا اور مغرب نے اس مسئلہ کو جمہوری زندگی کی ایک اہم پہچان کے طور پر اختیار کیا اور اپنے رویوں سے مذہبی تقاضوں پر عملدرآمد سے اور سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اقدامات سے ثابت کردیا کہ انسانی حقوق کا نعرہ دراصل دنیا میں ایک طرف مسیحی قدروں کو فروغ دینے اور دوسری طرف اپنے عوام کو مادر پدر آزادی دے کر دیگر اقوام کو خوفزدہ کرنے کے لئے لگایا گیا تھا۔ مغرب نے اس نعرے کو مسیحیت کے فروغ کے لئے ایک متبادل مذہب کے طور پر خوب استعمال کیا ہے۔ مغرب اپنے رویوں سے کارل مارکس کے لبرل ازم کے بارے میں رویوں سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ کارل مارکس ہر انسان کی لامحدود قدروقیمت کے مسیحی فلسفے کا منکر ہے۔ وہ اجتماعیت کے رویوں کو ترک تو کرتا ہے لیکن کارل مارکس کے اجتماعی تقسیم کار کے اصول سے کسی حد تک قربت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ اگر مارکسزم میں سرمایہ داری کا داخلہ کیا جاسکتا ہے تو اس ملغوبے کو جدید مغربی دنیا کے رویے قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اہل مغرب مارکس ازم اور لبرل ازم کے درمیانی

راستوں کی تلاش میں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ آزادی اور انصاف کے ملاپ سے اپنا حوالہ تلاش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس اس بات کا شائد کوئی جواب نہیں ہے کہ آزادی کے بغیر انصاف تو ویسے بھی بے معنی سی بات ہے۔ مغرب آزادی اور انصاف کو ایک دوسرے سے تشبیہ دے کر اس کے دونوں سرے پکڑنا چاہتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ انصاف کے بغیر آزادی کا نام مارکیٹ اکانومی ہے۔ سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے جبکہ آزادی اور انصاف میں تعلق کے خاتمے کا دوسرا نام ہی اشتراکیت تھا۔ جہاں انسان کو اپنے فطری حقوق بھی میسر نہیں تھے۔ مغرب اس کا حل یوں نکالتا ہے کہ انصاف تب ہی ممکن ہے۔ جب ایک انسان اپنے ساتھی دیگر انسانوں کے لئے حقیقی عزت کا اظہار کرے۔ انہیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال نہ کرے۔

آزادی' خوشحالی' انصاف اور فرد کی برتری پر مبنی مغربی سماج نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنے ان سیکولر حوالوں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ تمام تر کوششوں کے باوجود اس کا یہ سفر محض مادیت کا سفر تھا جس میں ضمیر' مذہب اور نظریئے کو کوئی مقام میسر نہیں تھا۔ اس سفر کی کرب انگیزی کا اندازہ کرنے کے لئے امریکی معاشرے کو دیکھاجاسکتا ہے امریکہ آج دنیا میں واحد قوت کے طور پر متعارف ہے لیکن اس کے سماج میں کرب و یاس کی شدید کیفیت پائی جاتی ہے۔ خود امریکیوں نے جارج بش کا نئے عالمی نظام کے امریکی قیادت میں تشکیل پانے کے نعرے کو "داخلی تبدیلی" کے بل کلنٹن کے نعرے سے شکست دے کر ثابت کیا کہ وہ مادی زندگی کے ہاتھوں کرب و یاس کی جس منزل تک آگئے ہیں وہ اس منزل سے باآسانی گزرنے کے لئے اس داخلی کیفیت سے نجات چاہتے ہیں جس نے انہیں شدید کساد بازاری کے ماحول کی طرف دھکیل دیا ہے۔ وہ خوشحال معاشرے کی تشکیل کرتے کرتے خوشحالی کے ایسے غلام بنے ہیں جن کے فیوض کی بارش ہے کہ ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اس کے بجائے جن چیزوں کی بارش ہورہی ہے ان کا ہلکا سا تعارف یوں کرایا جارہا ہے۔

امریکی عظیم ہیں امریکہ نے بار بار اس بات کا پروپیگنڈہ کیا ہے کہ امریکی دنیا کے سب سے عظیم لوگ ہیں۔ امریکی قوم دنیا کی عظیم قوم ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ عیسائیت دنیا کا عظیم ترین مذہب ہے۔ مرد ہونا انسانی زندگی کا سب سے بڑا افتخار ہے اور

گورا رنگ دنیا کے سب سے ممتاز فرد ہونے کی علامت ہے۔ امریکیوں کا خود ستائی اور خود نمائی کا یہ انداز قابل ستائش نہیں ہے۔ امریکی کبھی نسل پرستی کے حق میں ہوتے ہیں تو کبھی جنس پرستی کی بات کرتے ہیں۔ کبھی عمروں کی طوالت انہیں پریشان کرتی ہے لیکن وہ ایک اہم بات فراموش کر رہے ہیں کہ قوم پرستی صرف انہی میں موجود نہیں ہے۔ جدید دنیا کا یہ مسئلہ ہر ملک اور علاقے میں شدت کے ساتھ ابھر رہا ہے امریکیوں کی یہ خوش فہمی اس اعتبار سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ دنیا کے امیر ترین ملکوں کے عوام کے جذبات اس طرح کے ہیں وہ خود کو دنیا کا بے تاج حکمران سمجھتے ہیں جو اپنی زندگی کے رویوں کو ہر جگہ غالب اور جاری و ساری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان ممالک کا کہنا ہے کہ امریکہ ایک بڑا اور جمہوری ملک ضرور ہے لیکن اس نے اپنے نام کے ساتھ عظیم ترین کا جو لاحقہ لگا رکھا ہے وہ اندر سے کھوکھلا ہے وگرنہ اٹلی اور فرانس جیسے ممالک بھی امریکہ سے اس حوالے سے کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ امریکہ کے عوام اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں لیکن انہیں بدلے ہوئے حالات میں یہ لفظ استعمال ہی نہیں کرنا چاہیے ۔ چالیس سال قبل پیرس کے لوگ بڑے بڑے جلسوں میں "فرانس زندہ باد" کے نعرے بلند کیا کرتے تھے۔ برطانیہ میں بینڈ "Land of Hope and Glory" کی دھن بجایا کرتا تھا۔ لیکن آج جدید یورپ میں لوگ خوفزدہ ہو کر اس وقت اپنے وجود کو سمیٹ لیتے ہیں جب ان کے سامنے وطن پرستی یا قوم پرستی کا ترانہ کوئی فرد محض محبت کے اظہار کے طور پر ہی پڑھ دے ۔ جدید جاپان میں عظیم تر جاپان کی بات کرنے والے کو سخت ناپسند کرتے ہیں خواہ وہ وزیر اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ اب تک جنگوں کو جیتنے کے لئے قوم پرستی کا سہارا لیا جاتا رہا ہے۔ لیکن آنے والے دس بیس سالوں میں بھی اس رویے اور رجحان کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔ لوگ اب بھی قوم پرستی اور حب الوطنی کی باتیں کرتے محسوس ہوتے ہیں اور وہ فخر بھی کرتے ہیں۔

سرد جنگ کے بعد اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک خود ساختہ اور خود مسلط کردہ سرد جنگ میں سرمایہ داری کو فتح حاصل ہوئی انسان کی انا اور خودداری کو تباہ کرنے والی اشتراکیت ناکام ہوگئی۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ دنیا میں امن کے ساتھ حب الوطنی یا قوم پرستی کے جذبات کو تعمیری رخ دیا جائے لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ تاریخ کو بے وقعت کردیا جائے۔ روایات اور زبان و ادب کو غیر ضروری قرار دے

دیا جائے۔ آج کے جدید ماحول میں ایک اچھے سماج کی پہچان یوں کی جاتی ہے کہ وہ جمہوری سماج ہے۔ انسانی حقوق کا خیال رکھتا ہے انصاف مل رہا ہے جرائم کی شرح کم ہورہی ہے قیادت جدید سائنسی خطوط پر کام کررہی ہے اور اس کا بنیادی مقصد سماج کو آلودگی، غربت، منشیات اور جرائم سے نجات دلانا ہے۔ اس کے ساتھ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ صنعت کی تیز رفتار ترقی سے دنیا کا نقشہ بدل جائے گا اور تیز رفتار قوم پرستی کی لہر قابو سے باہر ہوجائے گی"۔1

مغرب میں ماضی کے حوالے سے انتقام کے بارے میں رویوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ "بلقان کے لوگوں سے ہونے والی زیادتی کا تعلق صدیوں پرانی نفرت سے ہے۔ رومن کیتھولک 1221ء سے آرتھوڈاکس عیسائیوں سے لڑتے آئے ہیں۔ سرب 1389ء میں ترکوں کے ہاتھوں اپنی شکست کو فراموش کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ قبائل کے درمیان تعلقات اور شادی بیاہ کے باوجود نسلی اور مذہبی دشمنی ختم نہیں ہوسکی ہے نہ ہی اس دشمنی کے اظہار کی شدت کم ہو رہی ہے۔ اس قسم کی شدت پسندی اور انتہا پسندی کا اظہار غیر ملکیوں سے ہوتا رہا ہے۔ 1878ء میں آسٹرو ہنگری نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ بوسنیا ہرزی گو وینا کو نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں اس فوج میں مزید ایک لاکھ فوجیوں کا اضافہ کردیا گیا۔ 1878ء میں اکانومسٹ نے اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"سرکاری ذرائع اس قسم کی رپورٹ شائع کررہے ہیں کہ قبضے کے مکمل ہونے کے ساتھ ساتھ فوج کی ایک قابل ذکر تعداد نکال لی جائے گی جس سے اخراجات میں کمی ہوسکے گی لیکن بوسنیا میں موجود ماہرین کا کہنا ہے کہ فوجیوں کو نکالنا ممکن نہیں ہوگا سوائے ان فوجیوں کے جو حملے کے آغاز میں شریک تھے اور اب تھک چکے ہیں کیونکہ فوجیوں میں کمی سے یہ خدشہ پیدا ہو جائے گا کہ موجودہ فوجیوں کو تحفظ کون دے گا یہ درست ہے کہ آسٹروی افواج تمام اہم سڑکوں اور قصبوں پر قابض ہیں لیکن تمام مزاحمتی گروہ پہاڑوں میں چھپنے میں کامیاب ہوگئے ہیں وہ کسی بھی وقت حملہ کرسکتے ہیں اس لئے افواج کا طاقتور رکھنا ضروری ہے۔

تقریباً نصف صدی بعد جرمن جب قابض افواج کی صورت میں داخل ہوئے تو ان

کے لیے حالات مزید مشکل تھے۔ ونسٹن چرچل کی یہ بات درست نہیں تھی کہ برطانوی فوجوں نے جرمنوں کے چودہ ڈویژنوں کو روک دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جرمن مقامی مزاحمت میں شریک بلقانی گروپوں کو قابو میں لانے میں ناکام ہوگئے تھے۔

تاریخ اب اپنے آپ کو دوہرا نہیں رہی لیکن اسے فراموش کرنا بیوقوفی ہوگی 1990 کے عشرے میں فوجی مداخلت کرتے ہوئے اس بات کے لئے تیار رہنا ہوگا کہ مداخلت کرنے والی فوج قتل کرے گی تو قتل کی بھی جائے گی اور اس مقصد کے لئے بڑی فوج درکار ہوگی"۔ 2

آزادی' انصاف اور انسانی احترام کے اصولوں کے حامل اہل مغرب کے لئے یہ حوالے زیادہ خوشگوار نہیں ہیں۔ انہی حوالوں میں امریکہ کے کھوکھلے سماج کی بات بھی آتی ہے۔ نیوز ویک نے اس کھوکھلے پن کی بنیادوں کی کھوج لگا کر بتایا تھا کہ امریکیوں نے سوچا تھا کہ ایک خوشحال معاشرہ ایک بہترین سماج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے مطابق امریکیوں میں ایمان کا بحران 1960 کے عشرے میں سامنے آیا جب تیز رفتار ترقی کی رفتار تیز نہ رہی اور نہ ہی اس نے مزید خودکار ہونے پر آمادگی ظاہر کی۔ گیلپ سروے بتاتے ہیں کہ سب سے اہم مسئلہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ کیا امریکی حالات کی موجودہ تصویر سے خوش ہیں یا نہیں"۔ 1980 کے عشرے میں لوگوں کی دو تہائی اکثریت نے شکوہ کیا کہ حالات درست نہیں ہیں۔

"1950 کا عشرہ امریکیوں کے لئے شناخت کا دور تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ ایک خوشحال معاشرہ ایک اچھے سماج کی بنیاد بن سکتا ہے۔ خوشحالی لازمی ضرورت ہے۔ اس سے خودبخود ایک اچھا معاشرہ' ایک اچھا سماج وجود میں آئیگا۔ ہم امریکی اسی شدت سے یقین رکھتے تھے کہ خوشحالی سے یہ کام خودبخود ہوجائیں گے۔ اب ہمارے ایمان کے ستونوں پر لرزہ طاری ہے اور وہ ہمیں دبا رہے ہیں ہم نے اس سفر کے بعد یہ دریافت کیا ہے کہ ہم محض اس بنیاد پر ایک اچھا سماج نہیں بنا سکتے۔ ہم اب بھی معیشت کے خوفناک پھیلاؤ کے شکار ہیں۔ ہماری روحیں ہم سے جدا ہورہی ہیں۔ ہم نے یہ سبق حاصل کیا ہے کہ خوشحالی کی بڑی سے بڑی صورت میں بھی ہمارے سماجی مسائل حل طلب ہی رہیں گے۔ یہ اچھی سوسائٹی' خوبصورت سماج بڑے بڑے دھبوں سے اٹا ہوا ہے۔ غربت پاؤں پھیلا رہی ہے۔ نسلی کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ خاندان ٹوٹ رہے ہیں۔ بجٹ کا خسارہ ہولناک ہورہا ہے۔ ہم

مستقبل کے بارے میں اپنے غیر واضح نظریات کے ہاتھوں پامال ہوئے ہیں۔ جس نے روح کے شدید بحران کو جنم دیا ہے۔ اس بحران سے ہم شخصی سطح پر شکوک کا شکار ہیں ہماری سیاسی زندگی میں تلخی آرہی ہے ہم اپنے عالمی کردار کے بارے میں شش و پنج کا شکار ہورہے ہیں"۔

" شناخت وہ مناسب لفظ ہے جو ہماری نفسیاتی الجھن بیان کرتا ہے۔ ہم بہت کچھ چاہتے تھے۔ محفوظ ملازمت' اعلیٰ معیار زندگی' عالمی اقتصادی برتری' صاف ستھرا ماحول' اور بہت کچھ مزید۔ ہمیں اقتصادی ترقی کے لئے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ ہم اپنے مستقبل کو شکل دے سکتے ہیں اسے بنا سکتے ہیں"۔ 3

مغرب کا انسان مغربی رویوں کی شکست و ریخت اور انسانی قدروں کے بارے میں غیر مستحکم نظام کی وجہ سے انسان سخت عدم تحفظ کا شکار ہوا۔ مغربی انسان اپنی ذات میں خوف کا ایک ایسا پیکر ہے جو بیک وقت اپنی شخصیت سے بھی خوفزدہ ہے اور اپنے ماحول سے باہر نکلنے سے بھی خوفزدہ ہے۔ اس خودساختہ زون سے باہر نہ نکلنے کی وجہ سے اسے دنیا کے تہذیبی اور سماجی مسائل کا صحیح ادراک نہیں ہے۔

" مغربی تہذیب کے دو انتہائی مضبوط حوالے اور دوسروں کو دبا کے رکھنے کے ہتھیاروں میں ایک خود اختیار کردہ نمائندگی ہے اور دوسرا اصول دوہری مخالفت ہے۔ مغربی تہذیب دیگر تمام تہذیبوں کو انہی حوالوں اور تصورات کے تحت دیکھتی ہے۔ اس سے سیدھا سادہ مراد یہ لیا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب ان حوالوں اور تصورات سے باہر نکل کر دیگر تہذیبی قدروں کو دیکھنا نہیں چاہتی۔ یعنی وہ یہ گوارا کرنے کی عادی ہی نہیں کہ دوسرے لوگ اپنی تہذیب میں "دوسرے" بھی ہوسکتے ہیں۔ وہ سوچتی ہے کہ "دوسرے" بھی دراصل اس کی شناخت کے حوالے سے پہچانے جائیں۔ یوں وہ "دوسروں" (جن کا مغربی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں--- مصنف) سے بھی یہ مطالبہ کرتی نظر آتی ہے کہ وہ ان کی نمائندگی کرے گی اور کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی تہذیب ہے جو دوسرے کلچر کو ایک کتاب کا موضوع سمجھتی ہے۔ جسے پڑھا جاسکتا ہے۔ گویا وہ دوسری تہذیبوں کی پیائش سازی کرتی رہتی ہے۔ جن سے پھر وہ سیاسی اور معاشی حسابات کے لئے خوش اسلوبی پر مبنی رویے اختیار کرنے کا دعویٰ کرتی ہے"۔ 4

مغربی تہذیب سے انکار مغربی تہذیب کے اس اصرار اور طرز فکر کو مشرقی تہذیب قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اسلام کی تہذیب تو عالمگیر ہے۔ مغربی تہذیب کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے اکانومسٹ نے 28 نومبر1992 کی اپنی اشاعت میں ایک رپورٹ دی جس میں کہا گیا تھا

"مغرب کا اصرار ہے کہ انفرادی حقوق اور نظریات کی متنوع حیثیت پر زور دیا جائے لیکن سنگاپور کے لوگ کنفیوشس کے راستوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ اس کے نظریات کی بہت قدر کرتے ہیں۔ نظام زندگی' خاندان کی تشکیل اور اتفاق رائے کے لئے اسے ہی اصل بنیاد قرار دیتے ہیں۔ حکمران عوامی عمل پارٹی (PAP) کا خیال ہے کہ سنگاپور کنفیوشس کے راستوں سے ہٹ گیا تو وہ سماجی استحکام اور معاشی کامیابیوں سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ حکمران جماعت کے ترجمان اخبار STRAITS TIMES کا کہنا ہے کہ اقدار بہت نازک معاملہ ہے جن سے دور ہٹنے کا مطلب قوم کی سماجی اور اقتصادی زندگی کو مشکلات سے دوچار کرنا ہے۔ حکومت کی طرف سے ان اقدار کے خلاف کوئی بھی کام اسے مشکلات سے دوچار کر سکتا ہے۔ حکمران جماعت کا موقف ہے کہ اقدار اور زبان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اگرچہ حکومت نے کاروبار اور عوامی مسائل پر بات چیت کے لئے انگریزی زبان کو ترقی دی ہے تاہم اس کا کہنا ہے کہ سنگاپور کے چینی شہری پرانی چینی زبان استعمال کریں تاکہ ثقافتی تبادلوں میں اقدار کو زندہ رکھا جاسکے۔ ستمبر میں حکومت نے "پرانی چینی زبان بولیئے" مہم کا آغاز کیا تھا۔ وزیر اطلاعات جارج یاؤ نے کہا ہے کہ گھروں میں انگریزی بولنے والے چینی شہریوں کی تعداد میں تکلیف دہ اضافہ ہورہا ہے۔ اس پر شدید ردعمل ہوا۔ مغربی اور مشرقی قدروں میں تفاوت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نامزد رکن پارلیمنٹ اور قانون کے پروفیسر والٹر ودن نے اس رجحان کو خطرناک حد تک سادہ ذہنیت کا شاہکار قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اچھی روایات کسی بھی زبان کے ذریعے منتقل کی جاسکتی ہیں۔ حکومت نسلی مسئلے کو کھڑا کررہی ہے۔ چینیوں کا خیال ہے کہ روایتی چینی زبان پر اصرار سے چینی شاونزم میں اضافہ ہوگا۔ان کے خیال میں زبان سیکھنا بے فائدہ ہے بلکہ ناقابل برداشت ہے۔ اس سے سنگاپور کے تعلیمی اداروں میں بوجھ میں اضافہ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حکومتی مہم کو حمایت حاصل نہیں رہی لیکن اس مہم کو

ایک ایسی کامیابی مل رہی ہے جو لوگوں کی عادت بن چکی ہے۔ سنگاپور میں انگریزی زبان کو عام بنانا 1905 سے حکومتی پالیسی کا حصہ رہا ہے.............. مسٹرلی کا کہنا ہے کہ سنگاپور اپنی تہذیبی روایت سے دور ہوجائے گا ان کے خیال میں اس کا حل بہت آسان ہے وہ یہ کہ ہر نسل اپنے گھروں میں اپنی زبان بولے اور انگریزی کو عام سماجی رابطوں کی زبان بنایا جائے۔ لیکن یہ حل آسان نہیں ہے اس لئے کہ بہت سے چینی گھروں میں پرانی بولیاں بولتے ہیں جو دراصل پرانی چینی نہیں ہیں حکومت نے ان مختلف بولیوں کو ایک کرنے کے لئے ہی " پرانی چینی بولیئے" مہم شروع کی تھی۔

یہ مہم اپنے بنیادی مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ 1964 میں 64.4 فیصد لوگ اپنی اپنی بولی بولتے تھے لیکن 1980 میں یہ شرح صرف 3.6 فیصد رہ گئی۔ اب ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگ چینی بولتے ہیں۔ سکول جانے والے طلبہ کی 30 فیصد تعداد گھروں میں انگریزی بولتی ہے۔ یہ شرح 1980 میں دس فیصد تھی۔ حکومت کا خیال ہے کہ مغرب میں تشدد اور سماجی بدامنی کی وجہ یہ ہے کہ وہ کنفیوشس کے راستوں پر نہیں چلتی۔ اس کے خیال میں مغربی تہذیب کے نتائج اگر سماجی بدامنی اور تشدد ہی ہیں تو پھر سنگاپور کیوں اس راستے کو اختیار کرے۔ "ـ 5

سنگاپور جس سماجی بدامنی سے محفوظ رہنا چاہتا ہے مغربی تہذیب اس کا شکار ہے۔ اکانومسٹ نے ہی 16 مئی 1992 کی اشاعت میں آئرش کیتھولک چرچ کا وقار کے عنوان سے لکھا کہ

"آئرلینڈ کے کیتھولک چرچ کو اس وقت شدید دھچکا لگا جب بشپ ایمون کیسی نے ایک نوخیز مطلقہ سے ناجائز تعلقات استوار کئے اور چرچ کے فنڈ سے ایک لاکھ پندرہ ہزار ڈالر اس پر نچھاور کردیئے۔ اس جرم کا انکشاف اس وقت ہوا جب چالیس سال تک چرچ میں خدمات سرانجام دینے والے بشپ نے اپنی عمر سے بیس سال کم کی اپنی مورفی سے کہا کہ وہ اس ناجائز بچے کو کسی ادارے کے سپرد کردے جو اس بشپ کے جرم کی صورت میں اپنی مورفی کے پیٹ میں پروان چڑھ رہا تھا۔ بشپ کو نیو یارک جانا پڑا اور اس نے ایک خفیہ مقام سے کہا کہ وہ چرچ کی رقم واپس کردے گا۔

آئرلینڈ میں بھی اسقاط حمل کا مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کرچکا ہے۔ حکومت ایسے

قوانین بنارہی ہے جن کے تحت اسقاط حمل کرانے والی خواتین کو ملک سے باہر جانا پڑے گا۔ سپریم کورٹ نے بعض حالتوں میں اسقاط کرانے کی اجازت دے دی ہے۔ حکومت ایک ایسے قانون پر بھی کام کررہی ہے جس کے مطابق اسقاط حمل کو مکمل طور پر غیر قانونی قرار دے دیا جائے گا۔ بشپ ایمون کیسی کے واقعہ اس نے سارے عمل میں چرچ کی رائے کو غیر موثر کردیا ہے۔ آئرش چرچ کو ہونے والا یہ نقصان غیر معمولی ہے۔ حکام پچھلے کئی سالوں سے اس قسم کے جرائم میں ملوث افراد کے ساتھ سختی سے معاملہ کرتے آئے ہیں۔ بشپ کیسی جس جرم میں ملوث ہوا اس قسم کے جرائم میں ملوث پادریوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس راستے کو چھوڑ دیں یا پادری کی جگہ کسی اور کے لئے خالی کردیں۔ چرچ کے ترجمان نے کہا ہے کہ بشپ کیسی کو 1974 میں اسی وقت ریٹائر ہوجانا چاہیے تھا جب انہیں علم ہوا کہ ان کی وجہ سے ایک خاتون حاملہ ہوگئی ہے۔ اس معاملے کا ایک حیرت انگیز پہلو بھی ہے کہ ایمون کیسی کو چرچ کے لبرل حلقوں کا نمائندہ کہا جاتا رہا۔ وہ وسطی امریکہ کے بارے میں امریکی پالیسی پر تنقید کرنے میں مشہور تھا اور اسے بائیں بازو کے آئرش حلقوں کے قریب سمجھا جاتا تھا"۔ 6

مئی 1990 میں پولینڈ میں وزارت صحت نے بعض قواعد کی منظوری دی جن کے ذریعے اسقاط حمل کرانے کی خواہش مند عورتوں سے کہا گیا کہ وہ کم از کم تین ڈاکٹروں کا تصدیق نامہ پیش کریں کہ وہ طبی بنیادوں پر ایسا کررہی ہیں۔ اس سے ملتا جلتا ایک حکم وزارت نے مئی 1991 میں بھی جاری کیا جس میں یہ اضافہ تھا کہ عوام کیتھولک مذہب کی پابندی کرکے ایڈز کے مرض سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ پھر مئی 1992 میں نیشنل ڈاکٹرز گلڈ نے ایک ضابطہ اخلاق کی منظوری دی جو قانون تو نہیں ہے لیکن دور رس اثرات کا حامل ہے۔ اس کے تحت ڈاکٹروں کو اسقاط حمل کرنے سے منع کردیا گیا ہے انہیں ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ آبرو ریزی کے واقعات اور حاملہ عورت کی جان کو خطرہ کے علاوہ کسی اور صورت میں یہ عمل نہ کریں۔

خود فریبی کا جال ہم مغربی ماحول کے ان مضر اثرات پر کسی اور جگہ بات کریں گے۔ اپنی اصل بحث کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ مغربی تہذیب خود فریبی کے جال سے نہیں نکل سکی۔ وہ دنیا بھر کو اور بالخصوص ایشیا کو مذہبی بنیاد پرستی

کے القابات سے نوازتا ہے۔ خواہ یہ مسلم بنیاد پرستی ہو یا عیسائی تاہم وہ اس رویے پر غور کرنے پر تیار ہی نہیں ہے۔ جو اس نے اقتصادی میدان میں اختیار کررکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ڈارون کا انسان ہاتھ میں لٹھ لئے کھڑا ہے اور اپنی جبلی ضروریات کے لئے دوسرے انسانوں سے نبرد آزما ہے۔ مغرب میں بنیاد پرستی سے نفرت اور سیکولر ازم سے محبت کو اکیسویں صدی کا رویہ قرار دیا جاتا ہے۔ مغرب ابھی تک اپنے پانچ سو سالہ دور اقتدار کی چند یادوں میں گم ہے جس میں غریب اقوام کی پامالی سے لے کر انسان کی ہر قسم کی توہین بھی شامل ہے اور مغرب مسلسل اس کوشش میں ہے کہ وہ عیسائیت' تجارت اور مغربی تہذیب کو ایک ہی عینک سے دنیا کو دیکھنے اور دیکھے جانے پر مجبور کردے۔ وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں کی آزادی کے بعد مغرب کو اسلامی یا مسلم بنیاد پرستی کے خطرات نے پریشان کررکھا ہے حالانکہ مسلم ریاستوں کی صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ ہے اور وہاں اسلام کا علم بھی مناسب نہیں ہے۔ مغرب اور اس کے اعلیٰ حلقوں میں بنیاد پرستی ایک ایسی لٹکتی ہوئی تلوار ہے جو صلح جوئی' محبت' اصول پسندی اور علم سے تعلق کو ایک ہی وار سے ہلاک کردیتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ خطرہ اس بات سے ہے کہ مذہب قوت اختیار کرکے اقتدار پر قبضہ کرے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ فرد کی حکمرانی کا خاتمہ ہوجائے گا اور شخصی آزادیوں اور انسانی حقوق کی ضمانت کون فراہم کرے گا۔

بنیاد پرستی ایک سیاسی نعرہ مغرب کے ہی بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ بنیاد پرستی دراصل ایک سفارتی اور سیاسی نعرہ ہے جس کی آڑ لے کر مغربی ممالک دنیا میں اقتصادی اور معاشی برتری کی منزل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں مذہبی بنیاد پرستی کا مقابلہ کرنے کے لئے معاشی بنیاد پرستی کا نظریہ پیش کیا جارہا ہے۔ آدم سمتھ سے لیکر صنعتی انقلاب کے زمانے تک اور آج کے دن تک بھی اقتصادیات پر حاوی مغرب کا موقف ہے کہ مارکیٹ اکانومی ہی تمام مسائل کا حل ہے۔ بنیاد پرستی انسان کو روایتی اعتقاد اور عمل کی طرف لے جاتی ہے جبکہ سرمایہ داری ایسا نہیں کرتی۔ جبکہ خود سرمایہ داری نے ابھی تک صدیوں پرانا راستہ ترک نہیں کیا۔ اس کی روایات میں آج بھی نجی منافع کا حصول' سرمائے میں اضافے کی ہر جائز و ناجائز کوشش' مصنوعات کے خام مال کی قیمت میں کمی اور منافع میں اضافہ' مارکیٹ کے حجم میں اضافہ' یہ تمام روایات ثابت کرتی ہیں کہ سرمایہ داری اپنی سرشت میں

بنیاد پرستی کے ہم پلہ ہے اور اقتصادی بنیاد پرستی ہے جس سے اسی طرح نفرت کی جانا ضروری ہے جس طرح مغرب مذہبی بنیاد پرستی سے نفرت کرتا ہے۔ مارکیٹ میں سامان لے جانے والا تاجر اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں راتوں رات اضافے کے خواب دیکھتا ہے۔ دوکاندار کم قیمت پر وصول کرکے خریدار کو اس قیمت سے بھی زیادہ پر فروخت کرنا چاہتا ہے جو مصنوعات بنانے والا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب اس صورتحال کو دیکھ کر مغرب میں یہ کہا جانے لگا ہے کہ بنیاد پرستی کا یہ انداز زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے۔ مغرب کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کے ہاں امیر اور غریب کا فرق بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ امیر ترین صنعتی معاشروں میں بھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ تیسری دنیا کے لوگوں کی محنت کا پھل کھا رہے ہیں۔ وہ خود تو دولت' سرمائے اور وسائل کے جزیروں میں رہتے ہیں اور تیسری دنیا کو انہوں نے غربت' جہالت اور مایوسی کے سمندر میں اٹھا کے پھینک دیا ہے۔ اس رجحان کو ریگن اور مارگریٹ تھیچر کے امریکی برطانوی اتحاد نے زیادہ شدید کیا ہے اور قدامت پسندی کی حد تک دنیا کی اقتصادیات کو برباد کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ امریکہ اور برطانیہ کی اقتصادیات کو درست کیا جاسکے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ تھیچر کے دور اقتدار میں برطانیہ کے دس فیصدی طبقہ امراء کے معیار زندگی میں پہلے کی نسبت 62 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ غربت کے انتہائی درجے پر رہنے والے دس فیصدی برطانوی عوام کے معیار زندگی کی پستی میں مزید چودہ فیصد کی شرح سے پستی آئی ہے اور وہ مسائل کے جنگل میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ خود برطانوی ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ جب ہم اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ معیشت تباہ حال ہے اور اسے سہارا دینے کی ضرورت ہے تو ہمارا اصل مدعا یہی ہوتا ہے کہ ہم طبقہ امراء کے دس فیصدی کے لئے طبقہ غرباء کے دس فیصدی کی مزید سہولتیں چھین لیں۔ یہی مارگریٹ تھیچر کی اقتصادی پالیسی تھی اور ہر آنے والے حکمران کی سوچ یہی ہوگی۔ اس کا دوسرا رخ یہ ہوتا ہے کہ غریب ملکوں سے قدرتی وسائل' معدنیات اور دیگر صلاحیتوں اور خدمات کو امیر ممالک کے لئے وقف کردیا جائے۔ ٹیکساس سول رائٹس پراجیکٹ کے ڈائریکٹر ہیرنگٹن کا کہنا ہے کہ جب امریکی حکومت دوسروں کو انسانی حقوق کی حفاظت کا درس دیتی اور سیاسی طور پر استعمال کرتی ہے تو ہم خود امریکہ کے اندر شہری آزادیوں کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ صورتحال دوسروں سے زیادہ مختلف نظر نہیں

آتی۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ امریکہ اور یورپ کے ہاں آزادی کا معیار بھی ایک مسئلہ ہے۔ امریکی معاشرہ میں قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ پولیس ہمسائے کی ایک بلاجواز شکایت پر بھی کسی کا سارا گھر کھنگال لے۔ ہزاروں لوگوں کو جبری مشقت کے ذریعے ذہنی پسماندگی کا شکار بنا دیا جائے۔ غیر ملکیوں کو گرفتار کرکے ان پر مقدمے چلائے جائیں اور انہیں عجیب و غریب جرائم میں ملوث کیا جائے۔ کیرنگٹن کا دعویٰ ہے کہ امریکی جیلوں میں مقید ستر فیصد قیدیوں کو محض رنگ کی تفاوت نے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ گلف و۔کلی کے 4 مارچ 1993 کے شمارہ میں کیرنگٹن نے انکشاف کیا کہ خود امریکہ کے اندر امریکیوں پر مشتمل تیسری دنیا آباد ہے جو میکسیکو کے سرحدی علاقوں کے ساتھ ساتھ زندگی بسر کررہی ہے۔ یہاں کسی کو بنیادی انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ صحت' تعلیم' کاروبار اور سیاسی حقوق نام کی کسی چیز سے یہ امریکی آشنا نہیں ہیں۔ یہ نیو ٹیکساس کی ایک اندھی تصویر ہے۔ یہاں غربت راج کرتی ہے اور انسانی جانوں سے کھیلتی ہے۔ تپ دق' مرگی' غیر متوازن جسم اور ذہن والے بچوں کی پیدائش یہاں کے مسائل ہیں۔ یہاں ایک ہزار کے قریب ایسی آبادیاں اور علاقے ہیں جن پر گمان ہوتا ہے کہ وہ نو آبادیاتی تسلط کا شکار ہیں اس لئے کہ یہاں نہ پینے کا پانی میسر ہے اور نہ ہی روزگار کا کوئی ذریعہ ہے۔

یورپ کے امیگریشن قوانین دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔ وہاں یہ تصور ہی نہیں کہ کوئی رنگ دار آدمی بھی یورپی ہوسکتا ہے۔ برطانیہ میں نسلی فسادات پر قابو پانے کی کسی حد تک کامیاب کوشش ضرور ہوئی ہے لیکن جرمنی اور فرانس میں اس مسئلے کا حل نہیں مل سکا۔ برطانیہ میں مشرقی لندن کے علاقے میں ایک سیاہ فام کے ساتھ ہونے والا سلوک بہت شہرت کا سبب بن گیا جب وہ اپنی سفید گرل فرینڈ کے ہمراہ ایک دکان سے دودھ خریدنے گیا۔ ایک گاڑی میں سوار تین انگریز اس لڑکی پر نسلی حوالوں سے آوازے کستے رہے۔ پھر انہوں نے ہیرس (سیاہ فام) کو اس کی کار سے گھسیٹ کر باہر نکالا مکوں اور لاتوں سے اس کی خوب مرمت کی ۔ سکریو سے اسکی پشت میں سوراخ کردیا اور اسے زمین پر لٹا کر سات بار اس کے جسم سے اس کی کار کو گذارا اور کار چھین کر لے گئے۔ ہیرس کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ برطانیہ کے ہوم آفس نے بتایا کہ 1992 میں اس قسم کے نسلی بنیادوں پر حملوں کے 7734 واقعات ہوئے تھے (گلف و۔کلی 28 اکتوبر 1993)

دنیا کے مہذب لوگوں کے اس طرز عمل کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے ان کی حکومتیں بھی اسی قسم کے معاملات میں شریک رہتی ہیں۔ ان کا دائرہ کار وسیع ہے اور ان کا ہتھیار ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف ہیں۔ جن ممالک سے مغربی تہذیب کو مذہبی بنیادوں پر دشمنی یا مخالفت ہے۔ اس دائرہ کار میں ان کے ساتھ "حسن سلوک" کیا جاتا ہے۔ ان ممالک سے کہا جاتا ہے کہ زراعت پر چھوٹ کا خاتمہ کرو' نج کاری کی پالیسی پر عمل کرو اور ہماری امداد حاصل کرو' ٹیکسوں میں اضافہ اس لئے تجویز نہیں کیا جاتا چونکہ ایسا کرنے سے کاروباری سرگرمیوں میں فرق آئے گا اور مارکیٹ اکانومی پر برے اثرات مرتب ہوں گے۔ ملکی منڈیوں کو غیر ملکی مصنوعات کے لئے کھولنا تیسری دنیا کے ممالک کی کمزوری بنا دی گئی ہے۔ مغربی نو آبادیاتی پالیسی نے اب اقتصادی جنگ کو سب سے موثر طریقہ بنا کر اقوام کو غلامی میں دھکیل دینے کا پروگرام اپنا رکھا ہے۔ اس اقتصادی بنیاد پرستی نے تیسری دنیا کو رشوت' سفارش' اقربا پروری' مایوسی اور ماحولیاتی آلودگی کے تحفے دیئے ہیں۔

اچھائی کا برائی سے موازنہ انسانی حقوق کی مسیحی تعبیر' مارکیٹ اکانومی اور دنیا پر اقتصادی و سیاسی برتری کے مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم مغرب کے رویوں پر تنقید کرنے والوں نے مغرب کی اچھائیوں کو مسلمانوں کی برائیوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کو مسلمانوں کی برائیوں کے حوالے سے دیکھنا انصاف نہیں ہے۔ اسلام مغربی تہذیب کے نظریات کے علی الرغم صورتحال پیش کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا موجودہ زمانے میں اظہار بنیاد پرستی کے ضمن میں آتا ہے تو پھر مغرب کا مسلسل زمانہ قدیم پر اصرار کن حوالوں سے بنیاد پرستانہ نہیں ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ فرد' خاندان اور سماج کے رشتوں' سماجی اداروں اور سیاسی نظریات کے حوالے کیا کہتے ہیں۔ مغرب نے فرد کو ذات کے خول میں بند کیا ہے جبکہ اسلام ایسا نہیں کرتا۔ مغرب میں خاندان ٹوٹ رہا ہے لیکن اسلام کی تعلیمات پر بننے والے خاندانوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ مسئلہ تو صرف یہ ہے کہ مغرب اپنی پیدائشی کمزوریوں کو جانتا ہے وہ سرمایہ داری کے کمزور ہونے کا بھی قائل ہے اسی لئے تو وہ اسلام کو ایک خطرہ سمجھتا ہے۔ اشتراکیت کے خاتمے کے بعد سرمایہ داری کے نظام کا تحفظ اس کی قدروں کے تحفظ کا مسئلہ بھی ہے۔ جسے یورپ کے انقلابات میں اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اسلام مغربی تہذیب کے خاتمے میں بلکہ اس کی اصلاح کا خواہش

مند ہے۔ اس تطہیر کے دوران میں نشتر کا استعمال بھی ہے اور دوائی بھی ہے۔ پرہیز بھی تجویز کیا جاتا ہے اور بڑا آپریشن بھی خارج از امکان نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جہالت' تشدد اور انسانی احترام کی خلاف ورزی کے جرائم کا ارتکاب کرنے والا بنیاد پرست ہے تو پھر اسلام کے اصولوں پر کاربند شخص ان جرائم کا مرتکب نہیں ہوسکتا خواہ مغرب اسے بنیاد پرست کہے یا نہ کہے۔

حکومت اور اجتماعیت اسلام میں معاشرت اور حکومت جدا جدا تصور نہیں ہیں جبکہ مغربی تہذیب کی معاشرت اور حکومت جدا جدا ہیں۔ فرد کو اسلام معاشرت کی اکائی بناکر جوابدہ تصور کرتا ہے جبکہ مغرب فردکو اجتماعیت کے فیصلوں پر برتر قرار دے کر اسے معاشرت کے سامنے جوابدہ ہونے سے روک دیتا ہے اور جبلی خواہشات کی تکمیل تک کے جملہ مراحل کو فرد کی آزادی سے مربوط کردیتا ہے۔ سادہ لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک فرد کا اسلامی معاشرے میں شخصی یا انفرادی وجود خود اس کے مکمل اظہار کے لئے ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ایک مسلمان کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ اس میں جیتا ہے اور اسی میں مرنا چاہتا ہے۔ تو اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ عیسائیت اور بدھ مت کی طرح تھپڑ مارنے والے کے آگے اپنا دوسرا گال پیش نہیں کرے گا۔ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کا خود ذمہ دار ضرور ہے لیکن اس دوران میں وہ سماج کے اجتماعی نظام کو نہیں عبور کرسکتا۔ اسی لئے اسلام کے حوالے سے چلنے والی تمام تحریکوں میں قدر مشترک یہی ہے کہ وہ اپنے دینی تشخص کے ساتھ ساتھ سیاسی پہچان بھی رکھتی ہیں۔ ان کی یہ پہچان اس حقیقت سے ابھرتی ہے کہ اسلام ایک دین ہے محض قواعد کی کوئی کتاب نہیں ہے جس کا زندہ لوگوں سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ انہی زندہ لوگوں میں جب فرد زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو وہ ان لوگوں میں اخلاقی قدروں کا بھی پابند بنتا ہے تاکہ معاشرہ اس کرب سے بچ سکے جس سے مغربی تہذیب گزارتی ہے۔

فرد کے رویوں کو درست رکھنے کے لئے اسلام مادر پدر آزادی کے تصور کی مخالفت کرتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ اسلام پر ایمان لاکر وہ اپنی سابقہ مشغولیات میں مصروف نہیں رہ سکتا۔ گویا وہ منافقت نہیں کرے گا۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ مسجد کے اندر تو یاد اللہ میں مشغول رہے اور مسجد کے باہر سود کی حمایت کرے اور اس ذریعے سے کمائی کرے۔ مسلمان خود سماج ہے جو اسے دوسروں سے ملنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ مغربی تہذیب سماجی نظم و ضبط

کے لئے قانون کا سہارا لیتی ہے لیکن اسلام کا مطالبہ ہے کہ اس مقصد کے لئے اللہ سے تعلق اور اخلاقی قدروں کا تحفظ کیا جائے۔ اس کی مثال خود پاکستان میں دیکھی جاسکتی ہے کہ معاشرے میں جرائم پر قابو پانے کے لئے بارہا قانون سازی ہوتی ہے کبھی فوری سماعت کی عدالتیں لگتی ہیں تو کبھی خصوصی عدالتوں پر توجہ دی جاتی ہے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں اخلاقی قدروں کی تباہی وجود پارہی ہے اس لئے قانون پر عملدرآمد کے لئے کوئی تحریک موجود نہیں ہے جو کسی بھی شہری کو اس بات پر آمادہ کرسکے کہ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ یہ کرے اور یہ نہ کرے۔ قوانین کے سلسلہ میں قرآن کا طریقہ کار بہت واضح ہے وہ قوانین دے کر عملی اقدامات کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ جو معاشرے مسلسل قانون سازی کے عمل میں مصروف رہتے ہیں وہاں قانون کی کتابوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ معاشرے کی اچھی قوتوں کو لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت نہیں ملتا جبکہ قانون کو دیمک لگتی رہتی ہے اور اس کے کھوکھلے ہونے کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مغرب میں قانون کا احترام اسکی تہذیبی قدروں کی علامت ضرور ہے لیکن اخلاقیات کے انفرادی فلسفے نے مغرب کو مسلسل عذاب میں مبتلا کررکھا ہے اور وہ سیاسی اور سماجی رابطوں میں اخلاقی قدروں اور روایات کے خلاف چلنا کوئی عار نہیں سمجھتا جس سے قانون ایک مجرد حقیقت میں سامنے آتا ہے جس کا مقصد افراد میں تنظیم نہیں بلکہ افراد کو تنظیم کے لئے مجبور کرنا ہے۔ یہ چیز پورے ماحول میں جرائم اور سماجی برائیوں کا راستہ کھول دیتی ہے۔

اسلامی نظام اور موجودہ دور کی مشکلات اسلامی نظام سماجی اور سیاسی نظام کے ایمان کے ساتھ مربوط اور منظم ہونے کا نام ہے۔ سوال یہ ہے کیا آج دینی احیاء یا سیاسی انقلاب کی شاہراہ اس تقاضے کو پورا کررہی ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلامی انقلاب اسلامی احیاء کے بغیر ممکن نہیں ہے تاہم اسے سیاسی انقلاب سے الگ رکھ کر منظم اور مسلسل جاری رکھا جاسکتا ہے۔ یہ جواب اسلامی نشاۃ ثانیہ کے دو پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے یہ دو پہلو اخلاقی اور سماجی ہیں۔ ان دو پہلوؤں کی زیادہ اہمیت تو وہاں ہے جہاں دینی احیاء کا کام اولین ترجیح رکھتا ہو اور اسلام کی فطرت اور اصولوں سے راہنمائی لیتا ہو۔ لیکن وہاں ان کا اثر نظر نہیں آئے گا جہاں عالم

اسلام کے موجودہ دھندلاتے ہوئے کردار کو سامنے رکھا جارہا ہو۔

عالم اسلام کی اخلاقی حالت ان حقائق سے مسلم دنیا کی اخلاقی حالت کی پستی کا اندازہ ہوتا ہے کہ بدعنوانی اور اوہام طرازی عروج پر ہیں۔ آرام طلبی اور منافقت' غیر اسلامی رسوم و عادات' سخت مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ مایوسی نے ہمیں گھیر رکھا ہے جوش و جذبے کی کمی ہے کیا ان حالات میں کسی بھی قسم کی سیاسی یا مذہبی اصلاح کی تحریک اٹھ سکتی ہے؟

ہر قوم تاریخ میں اپنا کردار ادا کرنے سے پہلے اندرونی صفائی اور متعین بنیادی اخلاقیات کے سیاسی طور پر تسلیم کئے جانے کے عمل سے ضرور گزری ہے۔ دنیا بھر میں قوت اور اختیار اخلاق کی برتری تسلیم کرکے ہی سامنے آتے رہے ہیں۔ اخلاقی قدروں کی تباہی نے شکست کے راستے کھولے ہیں جس کام کے کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کی روح انسان کے اندر موجود ہو۔ پہلے اندرونی تکمیل ضروری ہے۔ اسلامی نظام کے ابتدائیے کے طور پر دینی احیاء سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد اسلام کی اخلاقی قدروں عملی طور پر کا تسلیم کیا جانا ہے تاکہ ایک نیا شعور اور ایک نیا عزم ابھر سکے۔

دینی احیاء کا پہلا عنصر دینی احیاء زندگی کے حقیقی مقصد سے آگہی کا نام ہے۔ ہم کس لئے زندہ رہنا چاہتے ہیں اور کس طرح ہمیں زندہ رہنا چاہیے۔ کیا ہمارا مقصد حیات ذاتی ہے یا وہ ملت کے مشترکہ مفاد سے عبارت ہے۔ اس کے سامنے امت مسلمہ کی شان و شوکت ہے۔ کسی قوم کی عزت ہے یا کسی نسل کی برتری۔ اپنی ذاتی شخصیت کی پہچان کرانا ہے یا پھر خدا کی زمین پر خدا کے قانون کی حکمرانی ہے! ہمارے ہاں اس سے مراد لوگوں کو اسلام سے روشناس کرانا ہے۔ مسلمانوں کی اسلامائزیشن ہے۔ اسلامائزیشن کا نقطہ آغاز اللہ پر گہرا اور مکمل ایمان اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دینی اور اخلاقی اصولوں کی مسلمانوں کے ذریعے مکمل پابندی ہے۔

دینی احیاء کا دوسرا عنصر دوسرا عنصر یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد سے آگہی سے ابھرنے والے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سرگرم عمل ہوجائیں۔ گویا دینی احیاء دراصل اخلاقی عمل اور اس کا گہرا جذبہ ہے۔ مفادات پر مقاصد کی حکمرانی ہے۔ زندگی کی ایک ایسی حالت ہے جس میں عام آدمی بھی حوصلے اور قربانی کی انتہاؤں کو حاصل کرسکے۔ یہ ایمان کا ایک

اور خوبصورت اظہار ہے یہ ایک ایسا عزم ہے جو روزانہ قدروں کو ختم کرنے والے ہتھکنڈوں کے سامنے ڈٹ جائے سارے لوگ اعلیٰ مقصد کے لئے جمع ہو کر بھی اور انفرادی طور پر بھی قربانی دینے کے لئے تیار رہیں۔

روح اور احساس میں اس بنیادی تبدیلی کو لائے بغیر ہم کسی بھی طرح آج کی مسلم دنیا کی موجودہ حالت نہیں بدل سکتے۔ جب ہم ان معاملات پر غور کرتے ہیں تو پہلا مخمصہ ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ شاید اسلامی نظام کو نافذ کرنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ ہم اقتدار پر قابض ہوجائیں۔ جس کے ذریعے ہم اداروں کا قیام عمل میں لائیں۔ لوگوں کی دینی' اخلاقی اور ثقافتی تربیت کریں تاکہ ایک اسلامی معاشرہ وجود میں لایا جاسکے۔

ایک غلط سوچ کا ازالہ یہ سراسر لالچ ہے تاریخ نے کسی ایسے انقلاب کا حوالہ ہمیں نہیں دیا ہے جو اقتدار کے ذریعے آیا ہو۔ ہر انقلاب تعلیم اور اخلاقی قدروں کی اعلیٰ تربیت سے ہی آیا ہے۔ دوسری طرف یہ سوال ابھرتا ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے اقتدار تفویض کرنے کا راستہ کون سا ہے یا یہ کہ اس سوال کا جواب کون دے گا کہ اقتدار اور اختیار کہاں سے آئے گا ؟ کون اسے قائم کرے گا اس پر عمل کرائے گا یہ کس قسم کے لوگوں اور کس نوعیت کے اداروں پر مشتمل ہوگا۔ کون اقتدار کے کردار کو درست کرے گا اور یہ کہ اقتدار کو ایک عفریت بننے سے کون روکے گا۔ ذاتی مقاصد کی تکمیل کی راہ کیسے روکی جائے گی۔ لوگوں کی خدمت کا راستہ کون سا ہوگا ؟

گروہی ظلم کے طریقے یہ امر قابل عمل ہے کہ اقتدار میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے بدل دیا جائے۔ ایسا تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک گروہ کے ظلم کو ختم کرنے کے لئے دوسرے گروہ کو ظلم کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس دنیا میں دولت کے مالکان تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ نام' جھنڈے' نعرے اور ترانے بدلے جاسکتے ہیں لیکن اس راستے سے اسلامی نظام کے قریب ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ یہ نظام اور انسان کے درمیان ایک الگ نوعیت کا تجربہ ہے۔ دنیا کے درمیان اور مسلمان کے درمیان اس کی پہچان اور ہے۔

اپنی مدد کے لئے کبھی ایک قوت کو اور کبھی دوسری قوت کو بلانا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان اپنی ابتدائی اور سخت جہادی کوشش سے گھبرا رہا ہے۔ وہ اپنے خلاف

اپنے نفس کے خلاف جہاد کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ آپ لوگوں کو ایک دم کھڑا کردیں حتیٰ کہ آپ خود بھی ایسا نہیں کرسکتے۔ دینی احیاء تو اپنی ذات سے شروع کرنے کا نام ہے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر دوسروں کو فائدہ دینے کا نام ہے۔ دوسری طرف بدامنی اور قوت کے غلط استعمال نے ہمیشہ متفرق مقاصد کے حصول کی کوشش کی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس سے یہ نظریہ بدلتا ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی تحریک چنانچہ جو بھی اسلامی تحریک دینی احیاء اور اسلامی نظام کا مقصد لے کر اٹھی ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک اخلاقی تحریک بھی ہو۔ یہ تحریک اپنے مخاطب لوگوں کو اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کرے اور ان کے سامنے ایک اخلاقی مقصد رکھے۔ اس سے لوگوں کو حوصلہ ملتا ہے اور وہ بلندی کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہی اصل فرق ہے ایک سیاسی جماعت اور ایک اسلامی تحریک میں۔ سیاسی جماعت میں فکر کی یکجہتی تو مل سکتی ہے لیکن اخلاقی نظام کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اسلامی احیاء کی جدوجہد کو اسلام نے بھی لازمی قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

> "یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں" (العنکبوت۔)

اس قانون کی اسلام کے ابتدائی دور میں تصدیق ہوگئی تھی۔ تاریخ میں پہلی بار اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مساعی جمیلہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس کا اظہار اس حقیقت سے ہوتاہے کہ قرآن نے پہلے تیرہ سال صرف ایمان اور ذمہ داری کی اہمیت پر زور دیا۔ اس دوران کسی سماجی یا سیاسی مشکل پر غور نہیں کیا گیا۔

دینی احیاء کے لئے توجہ طلب امور

دینی احیاء کے لئے مزید تین امور توجہ طلب ہیں۔

1- احیائے دین کا اولین تقاضا یہ ہے کہ قرآن نے جن سماجی برائیوں کی گہری جڑوں کو اکھاڑنے کا شعور دیا ہے ان پر عملدرآمد کے لئے مضبوط عزم ہوتا کہ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور سمجھوتے کے اسے بروئے کار لایا جاسکے۔ احیائے دین سے مراد یہ ہے

کہ یہ بدامنی کے بغیر کیاجانے والا کام ہے نفرت سے دور رہ کر۔ اگر ایسا راستہ اختیار کیا جائے تو اسلامی معاشرے کے قیام کا راستہ یوں ہموار ہوتا ہے کہ لوگوں کے بڑے بڑے گروہ اسے اللہ کا عطا کردہ حکم سمجھ کر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔

2- اسلامی نشاۃ ثانیہ کا تصور لوگوں کے ذاتی اور مادی ایثار کے جذبے کے بغیر ناممکن ہے۔ باہمی اعتماد اور وفاداری و تعاون لازمی اجزاء ہیں۔ اس بات کی یقین دہانی لازمی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ کسی دوسرے فرد یا گروہ کی قربانیوں اور ایثار پر اپنے مفادات کے محل تعمیر نہیں کرے گا۔ اسلامی تاریخ میں یہی چیز اخلاقی انحطاط کے المیئے کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ ہر نظام کے لانے والے اس نظام کا دعویٰ کرنے والوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

3- جہالت کی جن گہرائیوں میں اسلامی امت اس وقت گرفتار ہے اس سے نکلنے کے لئے اسے تعلیم اور صنعت کاری کی رفتار عمل کو بہت زیادہ تیز کرنا ہوگا۔ جب ترقی کی رفتار بہت تیز ہو تو چند برائیاں لازمی طور پر سراٹھاتی ہیں جن میں اقربا پروری' بدعنوانی' رشوت خوری' خاندان کی بربادی' دولت کی فوری اور بے دھڑک لالچ اور حصول' متمول اور نقصان پہنچانے والے عناصر کا آگے آجانا' شہروں میں تیزی سے اضافہ اور روایات کی شکست و ریخت' سماجی تعلقات کا بگڑنا اور شراب کا عام ہوجانا' منشیات اور عصمت فروشی کی فراوانی۔ برائیوں کے اس شدید سیلاب کے آگے مضبوط بند باندھنے کے لئے اللہ کے احکام پر عملدرآمد لازمی ہے۔ دین کے چھوٹے چھوٹے اصول کی پاسداری بھی ضروری ہے تمام طبقوں میں اس کا شعور ہونا چاہیے۔ صرف دین ہی اس بات کو یقینی بنا سکتا ہے کہ کسی وجہ سے ثقافت برباد نہ ہوجائے۔ تیز رفتار مادی اور صنعتی ترقی بغیر حدود کے بربریت کے دور میں واپس لے جاسکتی ہے۔

اسلامی حکومت جب ہم دینی اور اخلاقی قدروں کے احیاء پر زور دیتے ہیں اور اسے دینی احیاء اور انقلاب کے راستے کی پہلی ترجیح قرار دیتے ہیں تو اس سے ہرگز مراد یہ نہیں کہ اسلامی نظام اسلامی حکومت کے بغیر قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا کام اقتدار کے حصول سے شروع نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کے دل جیتنے سے شروع ہوتا ہے۔

اسلامی احیاء دراصل تعلیمی انقلاب کا نام ہے اس کے بعد سیاسی انقلاب کی منزل آتی ہے۔ اس لئے ہم پہلے مبلغ ہیں بعد میں سپاہی۔ ہمارا ہتھیار ہماری ذات ہے جو مثال ہونا چاہیے۔ ہمارا ہتھیار قرآن ہے ہمارے الفاظ ہیں۔ ان ہتھیاروں کو قوت دینے کے صحیح وقت کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔

اس وقت کے فیصلہ کے لئے چند عوامل کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے ایک عام قانون تو یہ ہے کہ اسلامی تحریک اقتدار حاصل کرسکتی ہے اگر وہ اس قدر افرادی حمایت' اخلاقی مدد حاصل کرلے کہ وہ غیراسلامی حکومت کو جمہوری طریقے سے ختم کرسکتی ہو تو اسے ایساہی کرنا چاہیے لیکن اسے ایک اسلامی حکومت بنانا ہوگی۔ یہ فرق لازمی پیش نظر رہنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک حکومت کو گرا کر نئی حکومت بنانا ایک ہی جیسے نفسیاتی معاملے نہیں ہیں۔ اس کام کے لئے غیر محتاط اور قبل از وقت کوئی قدم اٹھانا نہ صرف خطرناک ہے بلکہ یہ تاخیر کے جرم کے برابر جرم ہے۔

اگر ایسا موقع مل جائے تو مطلوبہ اخلاقی اور نفسیاتی تیاری' اور ضروری لیکن کم از کم فعال اور تربیت یافتہ افراد کار کی غیر موجودگی ایک بغاوت تو ہوسکتی ہے۔ اسلامی انقلاب نہیں کہلا سکتی یہ بغاوت اسی غیراسلامی حکومت کا تسلسل بن جائے گی۔ ایک گروہ جائے گا اور دوسرا گروہ آجائے گا اگر اسلامی تحریک شرائط پورا ہونے کے بعد تاخیر کرتی ہے تو اس سے غیراسلامی اقتدار اسلامی تحریک پر کاری ضرب لگا دے گا اسلامی تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں پیچھے رہ جائے گی۔ حالیہ اسلامی تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

پاکستان۔ ایک اسلامی ریاست جب ہم اسلامی حکومت کا ذکر کرتے ہیں تو پاکستان کا تذکرہ نہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے کہ یہ واحد ملک ہے جو اسلامی کہلاتا ہے۔ پاکستان کی بعض ناکامیوں کے باوجود تعریف کی جاتی ہے۔ مشکلات بھی ہیں اس کی اس لئے حمایت کی جاتی ہے۔ یہ ملک اس نظریئے پر قائم ہوا تھا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ پاکستان اسلامی نظام کے نافذ کئے جانے کے عمل کی ایک ریہرسل بھی ہے جو موجودہ شرح ترقی اور جدید حالات میں اس جانب کوشش کررہا ہے۔ اسلامی نظام کے حامیوں کو کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ پاکستان سے یہ سبق بہت اچھے طریقے سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے لئے پاکستان کے تجربے کے کامیاب ہونے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو بھی جاننا ضروری ہے

جو یہ ہیں۔

1۔ اقبال کے نظریہ پاکستان کو عملی شکل دینے والی قوتیں غیر متحد اور غیر منظم تھیں۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ مسلم لیگ نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے عناصر جمع کرلئے ہیں۔ اس بات کا کوئی خیال نہ رکھا گیا کہ ریاست اور معاشرے کو چلانے کے لئے کیسے لوگ چاہئیں۔ اس اعتبار سے مسلم لیگ بمشکل ایک اوسط درجے کی سیاسی جماعت تھی۔ مسائل سے دوچار یہ جماعت اتحاد قائم کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

2۔ پاکستان میں فارمولا اور اعتقادی قسم کے اسلامی مفروضات کو بروئے کار لائے جانے کا عمل جاری ہے۔ علماء اور قانون دان تعلیم کے بنیادی مسئلہ پر پیش رفت کرنے کی بجائے اسلامی سزاؤں کے سخت ہونے اور شادی بیاہ کے معاملات پر اپنی توانائیاں صرف کررہے ہیں۔ بے نتیجہ مباحث ہوتے ہیں کہ آیا چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے یا اسے جیل ہی بھیج دیا جائے۔ لیکن چوری کی ایک اور قسم رشوت اور بدعنوانی ___ پاکستان میں اس قدر عام ہے کہ اس سے ملک کی بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد حاصل ہونے والے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ

(الف) اسلامی نظام کے لئے جدوجہد اور مکمل طور پر تعمیر نو کا کام ایک اسلامی معاشرے میں صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو پہلے سے آزمائے جاچکے ہوں اور جن کا تعلق ایک مضبوط نظریاتی اور ہم آہنگی کی حامل تنظیم سے ہو۔ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مغربی جمہوریت کے آلات میں سے کسی قسم کی سیاسی جماعت برآمد کی جائے۔ بلکہ ایک ایسی جماعت چاہیے جو اسلامی نظریے پر کام کرنے والی تحریک ہو جو اپنے ارکان سازی کے کام میں اخلاقی اور نظریاتی معیار کو بہرطور قائم رکھے۔

(ب) فی زمانہ اسلام کے لئے جدوجہد دراصل اسلام کے واجبات اور فرائض کے لئے ہی جدوجہد کرنے کا نام ہے تاکہ دینی اور اخلاقی تعلیم کو یقینی بنایا جاسکے تاکہ لوگوں میں ان اقدار کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف بھی پہنچ سکے۔ اس کی کیا شکل ہو یہ ایک پرائمری نوعیت کا مسئلہ ہے۔

(ج) اسلامی ریاست کا مدعا کام نہیں ہے کہ وہ آدمیوں اور تمام مسلمانوں کے بھائی چارے یا برادری کے درمیان مساوات کا اعلان کرے بلکہ اسے تو ان اعلیٰ اصولوں پر عملدر آمد کرنا چاہیے۔ اسلامی بیداری کا عملی ثبوت تو یہ ہے کہ آپ ایک منصفانہ سماجی نظام قائم کرنے کا علم ہاتھ میں پکڑیں اور یہ یقین دلائیں کہ آپ کی جنگ جہالت' ناانصافی اور غربت کے خلاف ہے یہ ایک جنگ ہے جس کے مقاصد اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ کیا اسے ناکام ہوجانا چاہیے ؟ پھر جھنڈا تو وہ لوگ اٹھالیں گے جو معاشرے کے تحفظ کے لئے نامناسب ہیں۔ اس طرح ان کے منافقانہ عزائم کی تکمیل کی راہیں کھل جائیں گی۔

ان اسباق کاذائقہ بہت تلخ ہے۔ ہمیں اب بھی اسلام کے حوالے سے پاکستان پر یقین ہے کہ یہاں سے بین الاقوامی سطح پر اسلام کے لئے جدوجہد کی جاسکتی ہے۔ آج کے مسلمان کے دل میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے "محبت" کی طرح پیاری ہو اگر کوئی ہے تو وہ پاکستان ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہاں خوف اور لرزہ ہے لیکن پاکستان امت مسلمہ کی بہت بڑی امید ہے۔ یہ امید آزمائشوں اور حرص و طمع کے مرحلوں سے گذرتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ کب پوری ہوتی ہے۔

تصور امت اور قوم پرستی آج اسلام نظام کے حق میں دیئے جانے والے دلائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بنیاد پرست تمام مسلمانوں اور مسلمان معاشروں کو اکٹھا کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی نظام کا ایک فطری عمل ہے۔ جس طرح کے حالات آج ہیں اس کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑی اسلامی فیڈریشن بنانا چاہتے ہیں جو مراکش سے انڈونیشیا اور گرم افریقہ سے وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہو۔ اس سوچ سے بہت سے ایسے لوگ بھی ناراض ہیں جو خود کو "حقیقت پسند" کہتے ہیں۔ ان کی یہ روش مسلمانوں کو ایک کمتر حالت میں ذلیل کر کے رکھنا چاہتی ہے۔ جو جدوجہد' امید اور ترنگ کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔ یہ سوچ کہتی ہے کہ آقاؤں کو آقا ہی رہنا چاہئے دنیا میں جو زبردست ہے اس کی عزت ہونی چاہئے۔ غلاموں کو غلام ہی رہنا چاہئے۔ تاریخ تو مستقل تبدیلی کا نام ہے یہ تو ناممکن کو مستقل طور پر حاصل کرنے کی جدوجہد سے عبارت ہے آج کی دنیا میں جو کچھ ہے وہ 50 سال قبل ناممکن نظر آتا تھا۔

ظاہر طور پر "حقیقت پسندی" کے رخ ہمارے سامنے ہیں۔ ہماری "حقیقت پسندی کا رخ" کمزور اور بزدل ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ مسلمانوں کے اتحاد کے مقابلے میں کوئی اور چیز فطری اور حقیقی نہیں ہے یہی راستہ ہے جس کے ذریعے ہم مشترکہ مسائل حل کر سکتے ہیں لیکن پھر مافوق الفطرت نظاموں کی بات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلامی تحریک کے کارکن' معاشی' ثقافتی اور سیاسی میدانوں میں ربط اور باہمی عمل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ان کے "حقیقت پسند" دوستوں کو غیر حقیقی لگتی ہے وہ حالات کو جوں کا توں رکھنے پر بضد ہیں جو غیر فطری اور نقصان دہ ہے۔ آج کے دور میں جب کہ دنیا سمٹ رہی ہے ارتکاز اور اتحاد کے لئے جدوجہد جاری ہے ساری عرب دنیا ٹوٹ پھوٹ کر تیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہے۔ مسلمان ممالک آج بین الاقوامی معاملات میں ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہیں۔ ہمیں بوسنیا' اراکان یا کشمیر کے مسلمانوں کے زخموں سے کوئی غرض نہیں ہے اسرائیل کے ساتھ عربوں کے تصادم کے شدید ترین دباؤ کے دنوں میں مسلم ایران نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات برقرار رکھے۔ اگر کوئی بات غیر حقیقی ہے تو یہ مسلمانوں کا اتحاد نہیں بلکہ اس اتحاد کا نہ ہونا ہے۔ ان کے درمیان تقسیم اور تنازعہ ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جو آجکل ہمارے اردگرد موجود ہیں۔

مثالی ریاست کی ضرورت ہمارے سامنے کوئی تاریخی مقصد نہیں ہے صرف ایک چیز ہمارے سامنے ہے جو ہمارے فطری اور تاریخی سچ کے خلاف ہے۔ جسے لوگ اپنی مرضی اور کوشش سے بروئے کار نہیں لا سکتے۔ جسے وہ ایک مثالی ریاست سمجھتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ مثالی ریاست نہیں ہے۔ ہماری کمزوریاں ایمان اور عمل سے عاری ہونے کا نتیجہ ہیں۔ جو "حقیقت پسندی" کے لئے جواز فراہم کرتی ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ مسلم اتحاد ایک خواب ہے جو کبھی سچا ثابت نہ ہو گا تو وہ صرف اس مایوسی اور بے یارو مددگار حالت کا ذکر کرتے ہیں جسے وہ خود محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت کی دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے یہ تو دلوں کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کے اتحاد کا خیال کسی کے ذہن کی ایجاد نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کسی مصلح یا نظریاتی کی بے کار خواہش ہے۔ یہ قرآن کا پیغام ہے جس کا مشہور نظریہ ہے کہ "مسلمان بھائی بھائی ہیں" اس پیغام کو محفوظ رکھا گیا ہے اسلام نے اسے انسانوں کے ذہن میں تازہ رکھا ہے۔ خانہ کعبہ جانا ایک روحانی تجربہ ہے۔ اس سے

مستقل طور پر یکساں جذبات، تعلق داری اور متحد سماج ابھرتا ہے۔ وہ مسلمان جسے اپنے دیگر مسلمان بھائیوں کے ساتھ کسی جگہ مصائب کا سامنا رہا ہو یہاں آکر ہمدردی اور یکجہتی کے جذبات موجزن پاتا ہے۔

مسلمانوں کو باہم جوڑنے کا یہ عوامی انداز بلاشبہ مسلم گروہوں پر زبردست احساسات کا دور لے کر آتا ہے لیکن آج مسلم ممالک میں عملی اور روزمرہ کی زندگی ان احساسات سے کیوں خالی ہے۔ یہ محض ایک احساس ہی بن کے کیوں رہ گئی ہے۔ یہ ہماری مشترکہ عظمت کی نقیب کیوں نہیں بن رہی۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمان فلسطین، کریمیا، سنکیانگ، کشمیر اور بوسنیا میں ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہیں مسلمان کا دل دھڑکتا ہے اسے احساس ہوتا ہے کہ اسے تکلیف دی گئی ہے اسے کچلا گیا ہے لیکن ان مظلوموں کی مدد کی سطح یا تو بہت کم ہوتی ہے یا مدد ہی نہیں کی جاتی۔ احساس زیادہ ہوتا ہے اور عمل کم۔

عوام اور حکومتوں میں فاصلے عالم اسلام میں ایک اور رویہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمران طبقوں اور عوامی جذبات میں بہت زیادہ فاصلے ہیں حکمران طبقے اسلام کے اتحاد، مسلم عوام کے احساسات اور امیدوں سے بالکل بے بہرہ ہیں انہوں نے مغرب کے تعلیم کدوں میں وقت گذارا ہے جن کی فضا نے انہیں امت کے تصور کے بجائے قوم پرستی، نسل پرستی، علاقہ کی بنیاد پر عصبیت اور لسانی پہچان دی ہے۔ اس صورت نے مسلمانوں کے جذبہ اور شعور کو زک پہنچائی ہے انہیں "حقیقت پسندی" اور "سیکولر نظریات" کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس اندرونی کشمکش نے حکمرانوں کے لئے عوامی شعور اور جذبے کو حاصل کرنا ممکن نہیں رہنے دیا اور نتیجہ عمل کی سمت غلط ہونے کی صورت میں نکلا ہے۔ موجودہ دور میں امت کے تصور کو اس کی عملی حیثیت میں دیکھنا ہی اصل مقصد ہے جس سے مسلمانوں کے شعور اور احساس کو یکجا کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اسلام کی پیروی کرتے ہوئے وہ بننے کی کوشش کریں جو اسلام ہمیں بنانا چاہتا ہے۔ وہ نہ بنیں جو اسلام کا مطلوب نہیں۔ اور نہ ہی ہم اسلام کو اپنے اعمال کے حوالے سے دنیا میں متعارف کرائیں اور اس کی شناخت کو اپنی بداعمالی سے مسخ کرتے رہیں۔

جدید عالم اسلام نے قومی پرستی کو اختیار کر کے ہی تصور امت سے ناآشنائی کی سزا پائی ہے قوم پرستی عصر حاضر کا عظیم فتنہ ہے۔ دنیا بھر میں اس کے لائے ہوئے فتنے انسانیت

کے لئے تباہ کن اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ اقوام اور ممالک کی شکست و ریخت کا سلسلہ جاری ہے ہم قوم پرستی اختیار کر کے عالم اسلام کے اتحاد کی منزل حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے پہلا قدم عربی زبان کی ترقی و ترویج ہے اس سمت میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس سمت میں کوئی کام ہوا بھی ہے تو اس میں ولولے کی کمی ہے۔ اس کے برعکس یہودیوں نے بڑی کامیابی سے اسرائیل میں عبرانی زبان کو رواج دیا ہے عربی زبان عربوں سے زیادہ مسلمانوں کی ہے اسلام کی ہے۔ قوم پرستوں نے اس کا بالکل درست اندازہ لگایا ہے وہ اور ان کی انتظامیہ اپنے پرانے آقاؤں کی زبان بولتے ہیں۔ عالم اسلام میں اسلام کے ساتھ کوئی محبت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ عربی زبان کو خود عرب ممالک میں بالخصوص اور دیگر مسلم ممالک میں بالعموم سرکاری سرپرستی حاصل نہیں ہے۔

یہ نتائج بذات خود اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عالم اسلام میں قوم پرستی کے نظریات غیر اسلامی ہیں۔ یہ مشرق وسطی میں زیادہ واضح شکل میں موجود ہیں جہاں قوم کے بانیوں کا حوالہ اور اثر شام کے دانشوروں' لبنان کے عیسائیوں میں ملتا ہے جو امریکی انسٹی ٹیوٹ جو ابتدائی طور پر شام کا پروٹسٹنٹ کالج تھا اور سینٹ جوزف یونیورسٹی آف بیروت میں پڑھے تھے۔ ترکی میں اتاترک' انڈونیشیا میں سوکارنو' عرب ممالک میں بعث پارٹی کی تحریکیں اور خاص طور پر سارے عالم اسلام میں قوم پرستانہ اور "انقلابی" گروہوں کی روحانی اور تاریخی جڑوں میں ان نتائج کی حقیقت واضح ہے۔ امت تو مسلم عوام کے دلوں میں بستی ہے جب کہ قوم پرستی نے ہمیشہ مادیت کا سہارا لیا ہے۔

اگر ہم چند لمحوں کے لئے اس بات کو فراموش کر دیں کہ روحانی سماج کی حیثیت ایک قوم سے برتر ہوتی ہے۔ آج قومی گروہ اس بات کی جدوجہد میں ہیں کہ انہیں قوم بننا چاہئے آنے والے کل محسوس کریں گے کہ وہ عام زندگی کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کریں۔ جس میں زیادہ فرقہ ورانہ ہم آہنگی ہو۔ دوربین نگاہیں رکھنے والے جرمن اور فرانسیسی آج لوگوں کو کہہ رہے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو جرمن یا فرنچ نہ کہیں بلکہ یورپی کہیں۔ یورپی اقتصادی برادری کا وجود میں آنا۔۔۔ بہرحال ایک تعمیری واقعہ تھا جو بیسویں صدی میں رونما ہوا۔

جدید دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا ماضی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے

غیر معمولی حد تک مہنگے تعلیمی پروگرام، تحقیق، کاروبار، دفاع اور دیگر شعبے یہ سب بڑی قوموں کو مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ محض چند لوگوں کی ایک انجمن اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ امریکہ دنیا کی واحد سپرپاور کی حیثیت سے ابھر رہا ہے جب کہ یورپی یونین دوسری قوت کی جگہ لے رہی ہے۔ جو کیمونٹی 20 کروڑ انسانوں اور دو سو ارب ڈالر کی جی این پی کو جمع نہ کر سکے اسے اقدامات اور عزم میں کمتر حالت سے آگے آنے کے لئے بہت کچھ کرنا ہو گا۔ یہ صرف اسی تک محدود نہیں ہے کہ دوسروں پر حکمرانی نہ کرے بلکہ یہ خود کو بھی نہیں چلا سکے گی۔ ترقی کی شرح ایک فیصلہ کن عامل کی حیثیت سے ختم ہو رہی ہے۔ اسکی جگہ ان مطلق ہندسوں نے لی ہے۔ چین میں ترقی کی شرح انگلینڈ اور فرانس سے کہیں کم ہے لیکن لوگوں اور وسائل کی زبردست یکجہتی نے اسے ایک مقام عطا کر دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عالم اسلام کے لئے بھی ایک موقع موجود ہے جو غیر ترقی یافتہ تو ہے لیکن بہت بڑا بھی ہے۔

یہ تو واضح ہے کہ مسلمان اس مسئلے کا اکیلے حل تلاش نہیں کر سکتے۔ ہم حالات کا سامنا کرتے ہوئے ماضی کی پستی اور جمود کا صرف ایک خصوصیت کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں کہ ہم اتحاد کی شاہراہ پر قدم رکھیں۔ جن مسائل کے حل کے لیے عرب، فلسطینی، ترکی یا ایرانی یا پاکستانی قدرت نہیں رکھتے وہاں ایک متحد عالم اسلام ان تمام ممالک کے مسائل حل کر سکتا ہے ہر مسلمان ملک اپنی آزادی اور خوشحالی کو یقینی بنا سکتا ہے اگر وہ عالم اسلام کی آزادی اور خوشحالی کا ضامن بن جائے۔ کویت اور لیبیا زندہ نہیں رہ سکتے اس لئے کہ دکھوں کے سمندر میں خوشحالی کے جزیرے آباد نہیں ہوا کرتے۔ اگر وہ اسلامی یکجہتی کو پروان نہیں چڑھائیں گے۔ ہمسایہ ممالک کی مدد نہیں کریں گے، ان میں خود پسندی اور ذاتی مفاد کی حکمرانی رہے گی ان ممالک کا حشر بھی دیگر ممالک جیسا ہو گا جس سے نفرت اور تباہی کے سوا کچھ نہ ملے گا جو ان کے دشمنوں کا مطلوب و مقصود ہے۔ اپنی اسلامی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے دراصل یہ مسلمان ملک اپنے ہی عظیم مفادات کا تحفظ کریں گے۔

متبادل راستے اب متبادل راستہ صرف ایک ہے کہ دیگر مسلمان ممالک کے ساتھ اتحاد کرتے ہوئے وہ اپنی بقا کو یقینی بنائیں ترقی کی راہیں تلاش کریں اور لالچی قوموں کے سامنے قوت بن سکیں یا پھر دوسروں پر انحصار کی موجودہ روش کو برقرار رکھتے ہوئے روز قدم بہ

قدم زوال کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ حالیہ تاریخ نے امت مسلمہ کو اتحاد کے حوالے سے نئے زاویے دیئے ہیں یہ اب محض ایک عمدہ خیالی نہیں بلکہ ایک حقیقت اور ضرورت بن چکا ہے۔ بقا کا قانون اور اس دنیا میں اپنی عزت برقرار رکھنے کا یہ واحد راستہ ہے۔ جو لوگ انجانی وجوہات یا مقاصد کے تحت عالم اسلام کی موجودہ منقسم حالت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ مقاصد اور نیت دونوں کے اعتبار سے دشمنوں کے حواری ہیں۔

عیسائیت اور یہودیت جگہ کی کمی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اسلام سے باہر نظاموں اور مکاتب فکر پر تفصیلی بحث کریں۔ تا ہم یہ ضروری ہے کہ ہم یہودیت اور عیسائیت کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر پر بات کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری اور سوشلزم پر بھی اظہار خیال کیا جائے گا۔

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اور چرچ میں فرق کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو چند حوالوں سے خدائی الفاظ کہا جاتا ہے جب کہ چرچ ایک تنظیم ہے جو مذہبی پیشواؤں کی حکومت' سیاست' دولت اور مفادات کیوجہ سے نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ عیسائیت کے بھی خلاف ہے۔ جو شخص عیسائیت کی طرف مائل ہو اُس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے بارے میں دلچسپی رکھتا ہے یا ان کے بارے میں تحقیقات کرنا چاہتا ہے۔ چرچ اپنی ساری تاریخ میں ان دونوں قطبوں کے درمیان رہا ہے چرچ جس قدر زیادہ پہلے چار عہدناموں کا ترجمان اور شارح ہو گا اتنا ہی وہ تحقیق سے دور ہو گا۔

یہودیت کے بارے میں اسلام کا رویہ بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ فلسطین میں یہودیوں کا صیہونیت کے زیر اثر کردار نہ صرف غیر انسانی اور ظالمانہ ہے بلکہ وہ کوتاہ بینی اور مسلم کش رویوں کا عکاس ہے۔ ان کی موجودہ پالیسی صرف واقعاتی اور لمحاتی معاملات پر نظر رکھنے تک محدود ہے۔ وہ دنیا میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان اہم عناصر اور محرکات پر نظر رکھنے میں ناکام ہو گئے ہیں فلسطین پر وہ عالم اسلام کو دعوت مبارزت دے رہے ہیں مقبوضہ بیت المقدس صرف فلسطینیوں یا عربوں کا نہیں ہے بلکہ اس سے سارے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اس پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے انہیں مسلمانوں اور اسلام سے لڑنا پڑے گا۔

یہودیت اور صیہونیت دو الگ الگ چیزیں ہیں اس فرق کی بنیاد یہودیوں نے خود ہی رکھی ہے۔ اگر وہ اپنے تکبر کو ختم نہیں کریں گے جیسا کہ ان کے موجودہ طرز عمل سے ظاہر ہو رہا ہے تو عالم اسلام کو اپنی جدوجہد جاری رکھنا ہو گی اور اسلامی تحریکیں اس کی پشت پناہ رہیں گی خلا دن بدن بڑھتا اور پھیلتا جائے گا اس کے لئے ہر قسم کی قربانی دی جائے گی حتیٰ کہ یہودی قبضہ شدہ زمین کا ایک ایک انچ مسلمانوں کو واپس کر دیں۔ کسی قسم کی سودے بازی یا سمجھوتہ فلسطینی بھائیوں کے حقوق کو خطرے میں ڈال کر دھونس کا راستہ کھول دے گا۔ جس سے وہ اخلاقی نظام بھی تباہ ہو جائے گا جس پر آج کی دنیا فخر کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور سیکولرازم احیائے اسلام کے لئے جو میدان کھلا ہے اس کے ڈھانچے اور سیاسی شکل و صورت جائزہ لینا ضروری ہے جس میں اسلام نے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ کیا موجودہ سماج اور اس کی تنظیم سرمایہ داری' سیکولرازم' نمائندہ جمہوریت اسلام کے لئے موزوں ہیں یا نہیں؟ کیا اسلامی سماج بھی ان رویوں اور نظاموں میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے؟۔

پچھلے دو برسوں میں یہ نظریہ پروان چڑھا ہے کہ ہر ملک کو اپنے لئے نمائندہ جمہوریت کا انتخاب کرنا چاہئے۔ حالیہ تبدیلیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر سماج کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سامنے آنے والے حالات میں اپنی سیاسی حیثیت کے اظہار کے لئے اس جمہوریت کو ترک نہ کر سکے۔ اسی طرح دوسری طرف وہ لوگ بھی ہیں جو سیکولرازم کو لازمی قرار دے رہے ہیں خواہ لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ تا ہم عصری تبدیلیوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لازمہ نہیں ہے اس کے علاوہ بھی ترقی ممکن ہے اور مختلف صورتوں میں جاری ہے۔ جاپان نے استعماری معیشت سے نکلنے کے بعد نئے راستوں کے ذریعے ایک لمبی چھلانگ لگائی ہے جسے یورپ والے سرمایہ داری کی ایک شکل کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں لوگوں نے جو طریقے وضع کئے ہیں وہ بہترین حوالے کا کام دے سکتے ہیں۔ تا ہم یہ بات واضح ہے کہ آج جو اصول کام کر رہے ہیں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں ان کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

اس تخلیاتی جبر سے شعور پر چوٹ لگتی ہے پچھلی نسلوں کا شعور دبتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے نفسیاتی حربے کے طور پر سامنے لا کر نظریات کو پھیلانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نظام کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کو کام کے لئے تیار کرنے کی غرض سے تنظیم نو کرتا ہے۔ جو ہر قسم کی دولت کا حقیقی ذریعہ ہے۔

ہم موجودہ نظاموں کے اچھے برے پہلوؤں کا اس طور سے جائزہ لے سکتے ہیں کہ تاریخی ضرورت کی نفسیات سے آزاد رہیں اور اس مقام پر اظہار تشکر کریں جو اسلام کو درمیانی قوت کی حیثیت سے حاصل ہے۔ ہم اسے سرمایہ داری اور سیکولرازم کے حوالے سے نہیں۔ بلکہ موجودہ معاشروں کے بعض اعمال کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔

اگر ہم اصطلاحات اور نعروں کے ذریعے کسی کی قیادت کا انکار کر دیں اور صرف حقائق پر نظر رکھیں ہم پچھلے سالوں میں دیکھیں گے کہ سرمایہ دار یورپ نے غیر معمولی ارتقاء کیا ہے۔ اس کا محرک' قابل طرز عمل سائنس اور معیشت کو مربوط کرنے کا سبب رہا ہے۔ سیاسی آزادی اور قانونی تحفظ کی ایک اچھی منزل انہوں نے حاصل کی ہے۔

تا ہم ان دونوں نظاموں کے کمزور اور تاریک پہلوؤں کو ان کی ترقی کے باوجود نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا حقیقی کھلا انداز اسے یہ مقام دیتا ہے کہ وہ ان دونوں نظاموں کے ناکام ہونے' ان کے منفی اور مثبت تجربات کا جواب دے اور عالمی سماج کو ان سوالوں کا حل بتا سکے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر امریکہ سوویت یونین (سابقہ) اور جاپان کے تجربات پر غور کرنا چاہئے۔ یہ تینوں ممالک تین مختلف نظام' تین الگ الگ رویوں اور طریقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ماضی میں سرمایہ داری کی ترقی نے مارکسزم کی بعض بنیادی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے تین نکات یہاں بیان کئے جاتے ہیں۔

1- سرمایہ داری میں پیداواری قوتوں اور پیداواری تعلقات کے درمیان اختلافات لازمی سر اٹھاتے ہیں۔ سرمایہ داری نے ان اختلافات کو کسی حد تک ختم کیا ہے بلکہ پیداوار' علم اور پیداواری عامل کی رفتار ترقی کو تیز کیا ہے۔

2- بڑے سرمایہ دار ممالک میں مزدور طبقے نے انقلاب کا راستہ اختیار نہیں کیا ہے۔

3- انسان اور شعور کے درمیان تعلق' بنیاد اور عظیم ڈھانچے کے درمیان رشتے کو سرمایہ داری نے اپنے دعوے کے مطابق پورا نہیں کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سرمایہ داری نظام سوئیڈن میں ہے دوسرا ارجنٹائن میں۔ ان دونوں ممالک میں "بنیاد" کا جو فرق ہے وہ

ان کی سطح کا ہے۔ وہاں سیاسی قوت' قانون' مذہب' حکمران فلسفہ آرٹ اور دوسری چیزیں ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔

چنانچہ دنیا نے ترقی کے لئے مارکس کے طے کردہ راستہ کو اختیار نہیں کیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے سرمایہ داری کو برقرار رکھا ہے اور اسے ترقی دیتے رہے ہیں۔ سوشلزم کو کئی ایک ترقی یافتہ ممالک میں اقتدار میں آنے کا موقع ملا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے اس کی کوئی وضاحت مارکس کے ماننے والے نہیں کر سکے۔

سوشلسٹ معیشت سے ترقی پذیر ملکوں نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس بارے میں بھی ہمیں غور کرنا چاہئے۔ ترقی پذیر ملکوں کے حوالے سے مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

1- ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی معیشت کو منظم کرتے ہوئے ان ممالک کے پاس نہ تو سرمایہ ہے نہ ہی مہارت اور کام کی عادت پائی جاتی ہے۔

2- زیادہ پسماندہ ماحول میں لوگ پابندیوں کو قبول کرتے ہیں جو سوشلزم کے قریب ہوتی ہیں جن میں شخصی آزادی کو محدود کرنا' مرکزیت' مضبوط حکومتیں شامل ہیں۔

3- سائنس کی حیثیت سے زندہ نہ رہنے کے باوجود سوشلزم ایک مہم جوئی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس اعتبار سے اس کے کیتھولک اور لاطینی ممالک میں پھلنے پھولنے کے امکانات زیادہ تھے۔ جب کہ پروٹسٹنٹ اور جرمن کے زیر اثر ممالک میں کم۔

ایک اہم سوال ان حالات میں جب کہ دنیا بھر میں مسلمان تیزی سے احیائے اسلام کی تحریک سے وابستہ ہو رہے ہیں اخلاقی سماجی اور سیاسی حوالوں سے اس پیش رفت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ شکست اور مایوسی کے احساسات کی موجودگی میں احیائے اسلام نئی امیدوں کے ابھرنے اور دنیا کے بہت بڑے حصے کے ابھرنے کے لئے ایک پیغام ہے کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو گا جس کی ان مقاصد سے گہری وابستگی نہ ہو اسے وہ اپنا پروگرام اور فرض سمجھتا ہے۔ لیکن عدم فیصلہ کی صورت میں وہ یہ ضرور سوچتا ہے کہ انہیں دنیا پر سچ کے طور پر کون ثابت کرے گا!

اس سوال کا جواب ضروری ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سوال کا جواب عالم اسلام کی نئی نسل ہے۔ جو جلد ہی معاملات اپنے ہاتھ میں لینے والی ہے۔ یہ نسل جو لاکھوں کروڑوں نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اسلام میں داخل ہے اسے یہ شدید احساس بھی ہے

کہ وہ مایوسی اور شکست خوردگی کے تحت رہ رہی ہے۔ وہ یقیناً ان حالات میں بدنامی کی زندگی بسر کرنے سے انکار کر دے گی اور اس مقصد کے لئے اکٹھی ہو جائے گی جس کا مطلب ہی سچائی ہے۔ زندگی ہے عظمت ہے۔ وہ یہ ناممکن چیلنج قبول بھی کرے گی اور ہر آزمائش میں سے کامیاب گزر جائے گی۔

یہ نسل پہلے ابھر نہیں سکی۔ غلطیاں آخر تک ساتھ رہی ہیں۔ جن سے جھوٹے خداؤں کی قوت کے خاتمے کا اعلان بھی ہوتا ہے یہ جھوٹے خدا معاشرے کے نام نہاد محافظ اور ممالک کے باپ بنے ہوئے ہیں۔ یہ خود کو بادشاہ اور مہدی کہتے ہیں۔ وہ ہمیں کبھی سینائی میں شکست دینا چاہتے ہیں تو کبھی انڈونیشیا میں عدم استحکام ان کا مقصد ٹھہرتا ہے تو کبھی وہ پاکستان میں بے چینی پھیلاتے ہیں۔وہ آزادیوں' خوشحالی اور ترقی کی باتیں کرتے ہیں لیکن سوائے ظلم کے کچھ نہیں کرتے۔ غربت اور بدعنوانی کو عام کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ضروری تھا تاکہ آنے والی نسل کو یہ پتہ چل جائے کہ اب تک ہم آوارہ سرگرداں رہے ہیں جب کہ عالم اسلام کی نجات کا راستہ صرف ایک ہی ہے۔ وہ متانت اور سنجیدگی کا راستہ ہے۔ اپنے روحانی اور مادی ذرائع کی طرف پلٹنے کی راہ ہے جس کا مطلب صرف اور صرف اسلام اور مسلمان ہیں۔

آج کا عالم اسلام مختلف قسم کے انسانوں' نسلوں' قوانین اور اثرات کا امتزاج ہے۔ لیکن ان تمام میں ایک چیز ایسی ہے جو سب میں مشترک ہے جس کے سب وفادار اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ وہ قرآن ہے۔ امت مسلمہ سے جڑنے کا اور اس سے ملنے کا احساس ہے۔ امت مسلمہ اور قرآن پاک سے وفاداری کے یہ دو بنیادی احساسات لوگوں میں توانائی اور قوت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور سارے عالم اسلام میں اس کی قوت یکساں ہے۔ اس میں امت مسلمہ آج بھی عالمی زاویوں سے ایک جذباتی وحدت رکھتی ہے۔ جو شاید آج دنیا کی سب سے بڑی کثیر القومی لیکن غیر منظم سچائی ہے۔ جس کو منظم کرنا ہی احیائے اسلام کی تحریک کا نقطہء عروج ہو گا۔

دنیا میں ان جذبات سے یکجہتی کے طور پر اور اسلام کے اخلاقی اثرات کے تحت ہم دنیا میں مستقل ایک دوسرے سے ملتے ہیں ہمارے ہاں کی ذہانت ایک ہے جو انسانی برابری' سماجی انصاف' قوت برداشت اور ترحم کے جذبوں سے مالا مال ہے۔ ان حقائق کے باوجود

ان کے سامنے ایک اچھی اور انسانی دنیا نہیں رہی بلکہ وہ ایک دوسرے کے وعدوں کو دیکھتے ہیں۔

ان احساسات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم دنیا ایک زندہ حقیقت ہے۔ وہ زندہ ہے اس لئے اُس میں محبت اور ایک دوسرے کے احساس کی قدر ہے۔ موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ اسلامی دنیا کوئی صحرا نہیں ہے یہ وہ پاک مٹی ہے جو دہقان کا مسلسل انتظار کر رہی ہے ہمارا چیلنج ان کی وجہ سے حقیقی اور ممکن بن جاتا ہے۔ ہمیں ان جذبات کا' ان احساسات کا رخ طے کرنا ہے۔ ان قابل قدر قوتوں کو ایک کرنا ہے۔ قرآن سے وفاداری کو ایک منظم اور باخبر سماج میں بدلنا ہے۔ زندگی کو سچے انسانی رویوں سے جوڑنا ہے تاکہ واضح نظریات ابھر سکیں جو اخلاقی اور سماجی کردار کے ساتھ مستقبل میں قانون اور ادارے دے سکیں۔

ہر وہ قدم جو واقعات کی روشنی میں اٹھایا جائے سماجی قدم بن جاتا ہے کوئی بھی کوشش مشترکہ اور منظم قوتوں کے ملنے سے ہی کامیاب ہوتی ہے۔ نوجوان نسل تبدیلی کے اس عمل کو لا کر رہے گی لیکن اس کے لیے ہمیں نوجوان نسل کو منظم تحریک میں بدلنا ہو گا۔ شرط یہ ہے کہ جوش اور ذاتی عظمت کو مشترک اور مربوط قدم سے منسلک کر دیا جائے۔ اس تحریک کو اسی ایک بنیادی مقصد کے لئے وجود میں لانا لازمی شرط ہے۔ اور یہی احیائے اسلام کی تحریک کا پہلا نکتہ بھی ہے یہ تحریک خود طے کرے گی کہ کیا تعمیر کرنا ہے' جو تعمیر نہیں اس کا مستقبل بہتر کرنا ہے۔ لوگوں کا مورال بلند کرنا اور انہیں اس کام کی دعوت دینا ہے مقاصد طے کیجئے اور انہیں حاصل کرنے کا راستہ نکالئے۔ اس سے گہری نیند میں سوئی ہوئی مسلم دنیا کو زندگی' فکر اور عمل طے گا۔ یہ باشعور بن جائے گی۔

اسلام کا مطالبہ سکون اور اطمینان قلب کے لئے اسلام مسلمان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شیطانی آلات کو توڑ دے جن سے اخلاقی برائیوں کا احتمال رہتا ہے۔ وہ انسان کے دنیا کے ساتھ تعلقات کا آغاز کرتے ہوئے اسے صرف ذات سے شروع نہیں کرتا بلکہ وہ ایک جامع شخصیت کے لئے اپنی تعلیمات پیش کرتا ہے۔ انسانی فطرت کو بروئے کار لاکر اس کے ذریعے سماجی رابطوں کی تنظیم کراتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ذریعے اس تنظیم کو قوت کا سرچشمہ بناتا ہے تاکہ یہ سارا سلسلہ فرد سے لے کر پورے سماج تک ایک نظام تشکیل دے سکیں۔ فرد کو محض عبادات تک محدود رکھنا بھی اس کا مقصد نہیں ہے۔ اس طرح وہ دیگر

مذاہب سے ایک مختلف نظریہ پیش کرتا ہے۔ مشاہدے اور سوچ کی قوت عطا کرنے والا دین اسلام انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بیک وقت ظاہر و باطن کو بیدار رکھے' وجود اور روح کے تال میل کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ اس پر لازم ہے کہ زندگی میں اسلام کے تقاضوں کو پورا کرے نہ کہ وہ سماج سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کے شخصی مطالبوں کو پورا کرنے میں ہی وقت صرف کردے۔ نماز اور ایمان میں ان تقاضوں کا اہتمام کرے فیکٹری' سکول' مسجد اور دکان میں اپنے کردار کو یکساں رکھے۔ اسی لئے وہ انسان سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دین اور سیاست کے لئے الگ معیارات قائم نہ کرے۔ جس سے سماجی زندگی میں متضاد کیفیات اور ماحول سامنے آتا ہے۔ اس ماحول میں مسلمان غیر اسلامی سماجی اداروں اور سیاسی تنظیموں سے اتصال نہیں کرسکتا۔ ہاں اسے یہ حق حاصل ہے کہ زندگی کے جملہ کاموں میں ان اداروں اور تنظیموں سے رابطہ رکھ سکتا ہے تاکہ زندگی جمود کا شکار ہونے اور دوسروں تک اپنی آواز پہنچانے سے ناکامی کا سامنا کرنے سے محفوظ کرسکے۔ مغربی تہذیب کے اداروں کا باہمی اور مجموعی تاثر بتاتا ہے کہ امن کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ قانون اور سماج ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں۔ اسلام اس چیز کا سدباب کرتا ہے اسلام کی اس خوبی کا مغربی دنیا نے یہ حل نکالا ہے کہ مسلم سماج کو یکسوئی سے محروم کردیا جائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم حکومتیں عدم استحکام کا مسلسل شکار رہتی ہیں ان کے خلاف بغاوتیں ہوتی ہیں اور یہ حکومتیں اپنے مسلم عوام کو ہر دم دبا کے رکھنے کے بارے میں زیادہ توانائیاں خرچ کرتی ہیں اور ترقی کے لئے کم۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اپنی رعایا کو حزب اختلاف بنا رکھا ہے۔ مغرب نے سبق یہ دیا ہے کہ اس حزب اختلاف کی قیادت اسلامی تحریک کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو اس حزب اختلاف کی "قیادت" کو ابھرنے کی جرات نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام تو اس بات کے لئے آمادہ کرتا ہے کہ ہر ملک میں مسلمان اپنے مخصوص حالات کے مطابق اس کی تعلیمات کی اصل روح کو اختیار کریں اور خود ایسی تعبیرات سے اجتناب کریں جو اصل الاصول کے خلاف ہو۔ اسلام نے جن قوانین کو ناقابل تغیر رکھا ہے وہ انسانی زندگی میں باہمی اور اجتماعی تعلقات کو باقاعدہ بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن سیاسی زندگی میں کوئی مستقل مطالبہ صرف اس لئے نہیں کیا گیا کہ راست بازی اور حق گوئی کا پرچم بلند کئے رکھنا ضرور لازم آتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

(الف) اسلام دنیا میں سماجی و سیاسی اور دیگر ضروریات اور مقاصد کے لئے ایک بہترین نظام دیتا ہے اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جس سے اسے بہتر بنایا جاسکتا ہے تو اسلام اسے فوراً" رد کرنے سے منع کرتا ہے۔

(ب) اسلام انسانی فطرت کے مطابق یہ مطالبہ رکھتا ہے کہ فرد کو حتمی فیصلے کا اختیار نہیں ہے بلکہ وہ مامور ہے جس کی تربیت اور تعلیم ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اس لئے وہ سماج سے مشاورت کا پابند ہے اس کے لئے دین حق اسے حقیقی طرز فکر کی دعوت دیتا ہے۔

(ج) اسلام عصری دنیا کو تقسیم کرنے والے سوالات کا جواب دیتا ہے۔ دین اسلام کا اخلاق اور حکمت عملی' انفرادی اور اجتماعی عمل' روحانی اور مادی سرگرمی کو مربوط کرنے کا واحد مقصد سماج کی یکجہتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان دین کو تصوف سے اور علم کو جہالت سے الگ کرکے دیکھیں اس عمل کو سب کے لئے فائدہ مند بنایا جائے۔

انسان اور معاشرے کا رشتہ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدمی اور سماج کا رشتہ کیا ہوگا ؟ ایک منظم سماجی قوت کی حیثیت سے اسلامی معاشرہ نجات کے اصول کو راہنما بناتا ہے جو نجات اسے اندر کے کرب سے آزادی نہیں دلا سکتی وہ مکمل نجات نہیں ہے سائنس کی ترقی اور ارتقاء کے عمل سے عبارت کوئی بھی رویہ اس وقت نجات کا سبب نہیں بن سکتا جب تک آدمی اور سماج میں تعلقات کی مضبوطی کے لئے روح کی اہمیت کو نہ تسلیم کرلیا جائے۔ آدمی اور سماج کے اس رشتہ کو محض معاشرتی یا اقتصادی حوالوں سے دیکھنا شاید درست نہ ہوگا۔ آدمی کو اس کا ایمان دوسرے آدمی سے منسلک کرتا ہے جس سے الجماعتہ کا تصور سامنے آتا ہے اسلام جماعتی زندگی کے علاوہ ہر قسم کی زندگی کو سماجی ترقی کے منافی خیال کرتا ہے کیونکہ اجتماعیت سے انسان کے اندرونی اور حساس رویوں کا مکمل اظہار ممکن ہوپاتا ہے۔ جو براہ راست ذاتی تعلقات کی شرط بھی عائد کرتا ہے۔ یہ رویے انسان دوسرے انسانوں تک منتقل کرتا ہے۔ محبت تقسیم کرتا ہے اور دکھ درد سمیٹتا ہے۔ یہی زندگی انسان کو اجتماعیت کی بھلائی اور فلاح کے لئے متحرک کرتی ہے تاکہ روح کی تنہائی اور دوسروں سے علیحدگی کا خاتمہ ہوسکے۔ مغربی تہذیب اس حقیقت کو نہیں پاسکی اور فرد کی

شخصیت کی تعمیر میں ناکام رہی ہے۔ آدمی اور سماج کے اس رشتے سے جو اسلام پیدا کرتا ہے عوامی رائے کا بھی اظہار ہوتا ہے جو مغرب کے اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے فلسفے کو نہیں مانتی بلکہ وہ اس وقت اپنا اظہار کرتی ہے جب قانون اور اخلاق کی خلاف ورزی ہوتی ہے خواہ یہ خلاف ورزی کسی عامی نے کی ہو یا خاص نے۔ یہی رویہ ہے جو ایک عام دیہاتی کو جرات دیتا ہے کہ وہ خلیفہ وقت سے سوال کرتا ہے کہ عمرؓ تمہارے پاس دوسری چادر کہاں سے آئی؟ ان رویوں سے کسی کے الگ تھلگ رہنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ وہ اپنی انفرادی مرضی کے مطابق معاملات کو چلانے میں اختیار نہیں رکھتا۔ مسلم معاشرے کی ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمان نے دوسرے مسلمان کے قرب اور تعلق کو محسوس کرنا چھوڑ دیا ہے۔

-1 Asiaweek - 10 January 1992.

-2 The Economist - 4 July 1992

-3 Newsweek - 2 March 1992.

-4 "Fundamentalism is out there"

ضیاء الدین سردار صفحہ 17

"Impach International" London, 9 April 1993

-5 The Economist - 28 Nov. 1992

-6 The Economist - 16 May 1992

۶

اسلام ـــــ سماجی عامل

اسلام سے خطرہ محسوس کرنے والے عناصر نے ایک نکتے پر ہمیشہ اتفاق کیا کہ اسلام کو بحیثیت متحرک سماجی عامل ختم کرنا ان کا مشترکہ مفاد ہے اس لئے کہ جب اسلام متحرک سماجی عامل کے طور پر انسانیت کی فلاح کے کاموں کو کرنا چاہتا ہے تو دیگر تمام سماجی عامل اپنی نامکمل اور متنازعہ حیثیت کی وجہ سے انسان کے بنیادی سماجی' تمدنی اور اخلاقی مسائل کا حل پیش کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اسلام سے "خوفزدہ" ان عناصر میں لا دینی' غیر مسلم' اشتراکی اور لبرل طبقوں کے علاوہ خود ایسے مسلمان طبقے بھی موجود ہیں جنہیں اس خدشے نے پریشان کر رکھا ہے کہ اسلام متحرک سماجی عمل ادا کرتے ہوئے ریاست اور حکومت کی ہیئت اور مقاصد پر اثر انداز ہوتا ہے وہ اقتدار اعلیٰ کے حق دار حکمران کو نہیں بلکہ اس کائنات کے خالق کو ٹھہراتا ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کے نائب یا خلیفہ کا کردار ادا کرے۔ یہ کردار بقول اس خوفزدہ مسلمان کے ایک ثانوی کردار ہے اور اس میں وہ کشش اور لطف نہیں ہے جو ہر قسم کے تفکرات سے آزاد اور مطلق العنان حکمران کے کردار میں ہے۔ انہیں یہ بھی شکوہ ہے کہ اسلام انسان کے جذبہء حریت کو پروان چڑھا کر اسے ہر دم باخبر اور باعمل رکھتا ہے حریت فکر ریاست اور حکومت کے اقدامات کے جواز اور عدم جواز کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے حکمرانوں کی غلط کاریوں اور غلط پالیسیوں کا محاسبہ کرتی ہے حریت عمل اس محاسبے کو تحریک بناتی ہے اور حریت تحریر اس تحریک کو تاریخ کا حصہ بنا کر حکمرانوں کے لئے مستقل بدنامی کا سامان پیدا کرتی رہتی ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ اسلام جذبہء جہاد کو کبھی سرد نہیں ہونے دیتا اور ایک شہری اپنے خلیفہ سے یہ بھی دریافت کرنے کا حق رکھتا ہے کہ سب کو تو ایک ایک چادر ملی تھی آپ نے دو چادریں کہاں سے حاصل کیں اور خلیفہء وقت چیں بہ چیں ہوئے بغیر وضاحت کرنا اپنا فرض سمجھتا

ہے' جب اس قدر بیدار عوام ہوں گے تو ان کے جذبہء جہاد کو سرد کرنا یا دبا کے رکھنا حکومت کے زوال کا سبب بن جائے گا۔ اقتصادی مفادات پر نظر رکھنے والے عناصر کو اسلام سے شکوہ یہ ہے کہ وہ سود کے خلاف جہاد کا درس دے کر ناجائز منافع اور مزید منافع کو روکتا ہے اسلام جسے مال حرام قرار دیتا ہے یہ عناصر اسے منافع قرار دے کر اپنا حق قرار دیتے ہیں۔ لیکن شاید ان تمام الزامات سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اسلام شہری کو جمہور کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرتا ہے اور اسے ایک تہذیبی اکائی اور ثقافتی عامل کا درجہ دے کر اقوام کے مستقبل کے فیصلوں کا سزا وار ٹھہراتا ہے انسان کی یہ تہذیبی اور ثقافتی شناخت اسے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے اظہار پر آمادہ کرتی ہے اور عمل کا روپ دھار کر سماج کے ان بندھنوں کو توڑنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ جو ظلم اور ناروا سلوک کا راستہ بناتے ہیں۔

الزامات اور شکوے شکایتیں کرنے والے ان مسلمان طبقوں کو ان باتوں کا بھی علم ہو گا کہ اسلام سماجی قوت کی حیثیت سے ماحول کو تمام تر الائشوں سے پاک کر دیتا ہے اور اسلامی قدروں کے حامل معاشرے میں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ قانون سماج کو جکڑ کے رکھنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ عوام اور حکومت کے درمیان تعلقات کار اور ذمہ داریوں کا ایک ضابطہء عمل ہے جو ہر دو عوامل کو اس امر پر متحرک رکھتا ہے کہ حقوق و فرائض کا تعین کیا جائے ذمہ داریوں کو ادا کیا جائے اور غیر ذمہ دار عناصر کو اولاً اس جانب راغب کیا جائے کہ وہ اپنے مقررہ سماجی کردار کو ادا کریں۔ اگر وہ اس مقررہ سماجی کردار کو ادا نہیں کرتے اور اس کے خلاف تخریب کا سبب بنتے ہیں تو پھر یہ قانون انہیں سزا وار ٹھہراتا ہے یہ خیال بالکل لغو اور بے بنیاد ہے کہ محض اسلامی تعزیرات سے سماج بدلا جا سکتا ہے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں وہ اسلام سے عدم واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ اسلام کو اجزاء کی صورت میں نافذ کرنے کا راستہ اسلام سے عدم واقفیت کا راستہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ اسلام کو مکمل طور پر ریاست' سماج اور حکومت کے معاملات کا نگران بنایا جائے تا کہ وہ ایک بھرپور اور مکمل نظام کی حیثیت سے حالات و واقعات کا تجزیہ کر سکے اور ان کے مطابق مسائل اور الجھنوں کا حل تجویز کر سکے اسلام کے ساتھ مذاق کرنے والے اور اسے ایک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے والے حکمرانوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ کبھی صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں تو کبھی زکوٰۃ کا۔ اور ان اقدامات

میں تشنگی بھی رکھتے ہیں اپنی نامکمل اور نا آسودہ خواہشات کی تکمیل کے لئے ان کے یہ اقدامات دراصل اسلام کے غلط تعارف کا سبب بنتے رہتے ہیں اور مستقبل میں بھی اسلام کے غلط تعارف کا سبب بنتے رہیں گے۔ اسلام ایک سیاسی عنصر نہیں ہے بلکہ یہ ریاست و حکومت کے لئے ایک مکمل سیاسی نظام دیتا ہے جب اسے ایک نظام سے محدود کر کے عنصر تک لے جایا جائے گا تو پھر ان نتائج کی توقع عقل مندی نہیں ہو سکتی جو اس کے بحیثیت نظام رائج ہونے سے متوقع ہیں اس سے تو یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ اسلام کو ٹکڑوں میں متعارف کروا کے یہ ثابت کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے کہ اسلام جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے امر واقعہ تو یہ ہے کہ سودی نظام معیشت میں زکوٰۃ کو نافذ کرنا اور اس سے ان نتائج کی توقع کرنا جو زکوٰۃ کے لئے موزوں اسلام نظام معیشت سے مخصوص ہیں کس طرح دانش مندی قرار دی جا سکتی ہے سارا سماج تو لہو و لعب میں مبتلا ہو اور اسلامی تعزیرات کو محض اس لئے نافذ کر دیا جائے کہ اس سے جرائم رک جائیں گے یہ اسلام کے ساتھ مذاق ہے۔ اسلامی تعزیرات کا نظام نافذ کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ سارے قانونی اور آئینی نظام کو اسلام کے حوالے سے مرتب کیا جائے اور سماجی سطح پر اسے متحرک عامل کا کردار ادا کرنے دیا جائے۔ اسلام محض سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹنے' کسی کی گردن مارنے اور سرعام پھانسی پر لٹکانے کی اجازت نہیں دیتا یہ ایک ایسا غلط تعارف ہے جو اسلام کو بدنام کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جب دین اسلام کہا جاتا ہے تو پھر دین اور سیاست' دین اور ریاست یا دین اور حکومت کی جداگانہ حیثیت اور ان میں فرق نہیں ہو سکتا۔ ان سب چیزوں کو دین کے تابع رکھ کر ہی ان کی افادیت معلوم کی جا سکتی ہے جو دین کے حوالے سے مسلمہ ہے۔

غیر مسلموں کے اہداف غیر مسلم عناصر نے اسلام کے حوالے سے جن مسائل کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی ہے ان میں سب سے اہم تو "اسلام بطور دین" ان کا ہدف رہا ہے۔ مغرب کو صدیوں سے یہ تجربہ حاصل رہا ہے کہ اسلام بے جان مادوں میں جان ڈالنے والا دین ہے معاشرے کو اس کا ایک ایک پہلو متاثر کرتا ہے اسلام انسان کی انفرادیت کو اجتماعیت سے مشروط کرتا ہے اور یہ تعلق صرف سماجی رشتوں' معاشی تعلقات اور عمرانی تقاضوں میں ہی موجود نہیں ہے بلکہ عبادات کا مرکزی نکتہ بھی یہی ہے کہ یہ عبادات انسان

کے اندر کو مضبوط اور شفاف کر کے ایک ایسا رشتہ اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہیں جس کے ذریعے وہ ایک طرف اپنے رب سے تقویٰ اختیار کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے اردگرد بسنے والے انسانوں کو اس تقویٰ کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ ایک باعمل داعی بن کے ابھرتا ہے اور انقلاب کا نکتہء آغاز ٹھہرتا ہے جہاد اس کی ہر رگ میں خون تمنا بن کے دوڑتا ہے جو سود کے خلاف ہردم مصروف عمل رہتا ہے اور سماج میں موجود منفی اور تخریبی عوامل کا خوب تعاقب کر کے ان کا مکمل خاتمہ کرتا ہے۔ اہل یورپ نے جب تہذیب اور تمدن کی دنیا میں آنکھ کھولی تو اسلام کو مجسم اپنے سامنے ایک بھرپور تہذیبی قوت کے موجودپایا۔ انہوں نے اپنے تاریک دور سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اسلام کے مضبوط بندھن میں بندھے مسلمانوں کے کردار کو زندہ و جاوید دیکھا اور انہیں علم و آگہی کے خزانوں کا علم ہوا۔ اگر آج وہی یورپ اسلام کے اس احسان کو فراموش کر کے کسی اور رویے کی بات کرے جس سے اسلام کی تضحیک مقصود ہو تو یورپ کو احسان فراموش کہا جائے گا آج کا یورپ اسلام کے بارے میں کس طرح سوچتا ہے یہ کوئی پوشیدہ بات نہیں رہی۔ اس کے مطابق اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک عوام کا اسلام اور دوسرا حکمرانوں کا اسلام۔ عوام کا اسلام بنیاد پرست ہے۔ جب کہ حکمرانوں کا اسلام ترقی پسند اور لبرل۔ یہ وہ تفریق ہے جس پر ہمارے حکمرانوں کو بے شمار فوائد نظر آتے ہیں۔ اور اسی "تعریف اور تفریق" نے انہیں اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ وہ وقت آنے پر اسلام کو ٹکڑوں میں متعارف کروا کے عوام کے شدید جذباتی لگاؤ کو سرد کرنے کی کوشش کریں۔ "متعارف کروانے" سے مراد یہ ہے کہ جب حکمران اسلام کو نافذ کرنے کا اعلان کرتے ہیں تو وہ دراصل عوام کو ایک ایسی ملمع شدہ چاکلیٹ دیتے ہیں جس کا خول بہت خوبصورت ہوتاہے لیکن اصلی مادہ کڑوا اور بے جان ہوتا ہے۔ مغرب اسلام کے اسی کردار کا خواہش مند ہے وہ اصل کردار کے حوالے سے اسلام کی عملی، علمی اور تہذیبی و سیاسی قوت کو دبا کے رکھنا چاہتا ہے تاکہ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے درمیان موجود اس تفاوت کو ابھارا جا سکے جو مغرب کے مفادات کے عین مطابق انہیں اسلام سے جدا کر دے۔ اسلام اور مسلمان کو دو الگ سمتیں دے کر بھی اسلام کے ساتھ ایک سنگین مذاق کیا جاتا ہے۔ اسلام کے عملی اظہار کا نام مسلمان ہے گویا قرآن اگر کتاب ہے تو اس کا عملی اظہار

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے یہ ممکن ہی نہیں ہے بلکہ خارج از امکان ہے کہ اسلام کا تعارف کرانے کے لئے یہ کہا جائے کہ اسلام محض قرآن ہے۔ اسلام کے ساتھ یہ برتاؤ مسلمانوں نے یورپ کے زیر اثر کیا ہے اور اندھا دھند کیا ہے حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن و سنت کو مسلمان کی عملی زندگی سے آہستہ آہستہ ایک متحرک عنصر کی حیثیت سے جدا کر دیا گیا ہے اور اعتقادات کی حد تک تعلق رکھا جا رہا ہے قرآن اسلام کے تعارف کے حوالے سے انسان سے جو مطالبہ کرتا ہے وہ محض اعتقادات اور عبادات کا مطالبہ نہیں ہے وہ درحقیقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اس طریقے سے ادائیگی کا مطالبہ ہے جس کا ذکر قرآن کی ان آیات میں واضح طور پر ملتا ہے۔

"جو کوئی عاجلہ کا خواہش مند ہو ہم اسے یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے کرنی چاہئے اور ہو وہ مومن توایسے شخص کی سعی مشکور ہوئی۔ ان کو بھی اور ان کو بھی ہم سامان زیست دیتے جا رہے ہیں یہ تیرے رب کا عطیہ ہے اور تیرے رب کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے پس اللہ کے ساتھ دوسرا کوئی معبود نہ بناؤ ورنہ ملامت زدہ اور بے یارو مددگار بیٹھا رہ جائے گا تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اگر ان میں سے تمہارے پاس ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں "اف" تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھکے رہو اور دعا کیا کرو "پروردگار! ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا" تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لئے درگذر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ رشتہ داروں کو اس کا حق دو اور مسکین کو اس کا حق دو۔ فضول خرچی نہ کرو فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور اگر ان سے (یعنی حاجت مند رشتہ داروں مسکینوں اور مسافروں سے) تمہیں کترانا

ہو اس بنا پر کہ تم اللہ کی اس رحمت کو جس کے تم امیدوار ہو تلاش کر رہے ہو تو انہیں نرم جواب دے دو نہ تو اپنا ہاتھ گریبان سے باندھ رکھو اور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ تیرا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی در حقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے زنا کے قریب نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔ مگر جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے پس چاہیئے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گذرے اس کی مدد کی جائے گی۔ مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ اپنے شباب تک پہنچ جائے۔ عہد کی پابندی کرو بے شک عہد کے بارے میں تمہیں جواب دہی کرنی ہو گی۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظ انجام بھی یہی بہتر ہے کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو یقیناً آنکھ ناک کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔ زمین میں اکڑ کر نہ چلو تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو ان میں سے ہر ایک برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے رب نے مجھ پر وحی کی ہیں۔ اور دیکھ! اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنا بیٹھ ورنہ تو جہنم میں ڈال دیا جائے گا ملامت زدہ اور بھلائی سے محروم"۔

(بنی اسرائیل 18 تا 39)

یہ ہے اسلام----- اسلام بحیثیت ایک سماجی عامل۔ اس چارٹر میں مسلمان سے جو مطالبے کئے گئے ہیں ان کا عملی زندگی میں اظہار ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلام فطری اور عملی طور پر تعمیر کردار کا داعی ہے ترقی اور خوشحالی اس کا مقصد ہے انسان کو بہترین اخلاقی اقدار اسلام سے ہی میسر آ سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اخلاقی اقدار اور سیرت و کردار کے بغیر کسی بھی سماج اور معاشرے کو تعمیر کی طرف راغب نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس نکتے کی بہت خوبصورت وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"سیرت و کردار کا معاملہ بڑے عزم و جزم اور ریاضت و تربیت کا محتاج ہوتا ہے جہاں تک

ظاہری عقائد و عبادات کا تعلق ہے۔ ان کو نبھانے والے تو دین کے زوال و انحطاط کے بعد بھی بہت سے نکل آتے ہیں لیکن کردار جو مغز دین اور روح دین ہے اس کا اہتمام بڑے بڑوں کے اندر بھی نہیں پایا جاتا۔ اہل مذہب میں یہ کمزوری بڑی نمایاں رہی ہے کہ انہوں نے عقائد و عبادات کے ظواہر پر تو بڑے بڑے معرکے اٹھائے ہیں لیکن کردار کی تعمیر پر انہوں نے بہت کم توجہ کی ہے یہاں چونکہ اس آخری امت کی راہنمائی مقام بروا طاعت کی طرف کی جا رہی ہے اس وجہ سے کردار کے پہلو پر خاص طور پر زور دیا گیا کہ یہ مقام بغیر اعلیٰ کردار کے جن میں ایفائے عہد اور صبر کو اولین اہمیت ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

مسلمان کی سیرت و کردار دوسری بات پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ تمام عقائد و عبادات کے اہتمام سے اصل مقصود اعلیٰ سیرت و کردار کی تعمیر ہی ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور نماز روزے کے اہتمام سے مقصود صرف چند باتوں کو مان لینا یا چند رسموں کو بجا لانا ہی تو نہیں ہے ان کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان لانے سے انسان کے اندر جو روشنی پیدا ہوتی ہے اس سے ہمارے دل جگمگا اٹھیں اور نماز روزے سے جو مضبوط انفرادی و اجتماعی کردار پیدا ہوتا ہے وہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کی خصوصیت بن جائے یہ نہ ہو تو تمام عقائد و عبادات سمجھئے کہ بالکل بے جان و بے روح ہیں یہی نکتہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ عقائد و عبادات کے پہلو بہ پہلو ان کے عملی اثرات کی طرف ضرور توجہ دلائی ہے تاکہ ان سے غفلت نہ ہونے پائے۔

تیسری یہ کہ امتحان و آزمائش کا اصلی میدان سیرت و کردار ہی کا میدان ہے انسان کا اصلی خزانہ جو وہ دین کی مدد سے فراہم کرتا ہے یا کر سکتا ہے مضبوط اور پاکیزہ سیرت ہی ہے۔ یہی چیز اس کو انفرادی زندگی میں بھی مقام بر و تقویٰ پر سرفراز کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں بھی اس کے لئے براء صالحین اور شہدا و صدیقین کی معیت ضامن بنتی ہے۔ اسی وجہ سے ضروری ہوا کہ اس پر خاص طور پر زور دیا جائے کہ مسلمان ہر قسم کی آزمائشوں اور ہر طرح کے فتنوں میں اپنے اس خزانہ کی حفاظت کے لئے چوکنا رہے"۔ ۱

گویا مسلمان کا ایمان اور عقیدہ کوئی جامد اور مہمل شے نہیں ہے بلکہ یہ متحرک اور

مکمل قوت ہے۔ جو اسے اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ معاشرے کی صورت گری کرتے ہوئے وہ اپنے اسی ایمان کا عملی اظہار کرے۔ اس عملی اظہار کا اثر اس کے دوسرے مسلمان بھائی پر پڑے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور شادی و مرگ میں شریک ہوں۔ وہ سماجی تعامل کو یقینی بنائیں امور خیر اور اس کو انجام دینے والی رفاہی اور فلاحی تنظیموں سے تعاون کریں معاشرے میں نظم و ضبط اور کردار کو اہمیت دے کر اسلام دراصل انسانیت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ جس کا ہر ذرہ وہیں جا کر اپنا کردار ادا کرتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہے اس قدر متحرک اور عامل دین کو ریاست و حکومت کے معاملات سے جدا کر دینا ممکن ہی نہیں ہے۔ جب بھی یہ دوئی پیدا ہو گی اسلام کے بحیثیت سماجی عامل بھرپور کردار کی نفی ہو گی یہ اسلام کی ناکامی نہیں ہے بلکہ ان مسلمانوں کا کمزور عمل ہے جو اس دوئی کی وجہ بنتے ہیں اور جن کے پاس کا کوئی معقول جواز بھی موجود نہیں ہے۔

اس مضمون میں زیر بحث مسئلہ اسلام کو سماجی عامل ثابت کرنا نہیں ہے۔ جیسا کہ آغاز میں بھی ذکر ہوا ہے کہ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان با عمل نہیں رہا جس سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں نے بلا تخصیص اسلام پر اس قدر شدید حملے کئے ہیں کہ یہ بے عمل مسلمان اظہار افسوس کی حالت میں نظر آتا ہے اس کے حاصل زندگی کو عالمی سطح پر اس کے مجہول اور مہمل کردار نے سوالیہ نشان بنا دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حاصل زندگی' عمل کا منتظر ہے۔ غیر مسلم بجا طور پر جانتے ہیں کہ مسلمان کا عمل ان کی تمام تدبیروں کو الٹ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے اس کے عمل کو مشکوک کرنے' عمل پر اس کا ایمان اور اعتقاد مجروح کرنے کے لئے بالخصوص یورپ اور امریکہ نے اسے قدامت پسندی اور بنیاد پرستی کے القابات سے نوازا ہے۔ مسلمان قرآن سے دور اور عمل سے تہی ہونے کی وجہ سے ان القابات کے شافی جوابات نہیں دے رہا۔ اسے تابڑتوڑ حملوں سے فرصت ہی نہیں لینے دی جاتی۔ وہ جواب در جواب کے ایک ایسے سلسلے میں الجھا دیا گیا ہے جس کا کوئی سرا نہیں اور جس کا کہیں اختتام نہیں سوائے اس کے کہ مسلمان خود آگے بڑھ کے قرآن کو سینے سے لگائے اسے پڑھے' علم حاصل کرے اور دور حاضر کے تقاضوں کا اسلام کی رو سے حل پیش کر کے ثابت کرے کہ جن اصولوں اور قوانین پر آج وہ عمل پیرا ہے اور جو اصول و قوانین اسلام نے اسے عطا کئے ہیں ان میں بعد المشرقین ہے۔ ایک ایسے فرد کو

اسلام کا نمائندہ بنا کر پیش کرنا جدید دور میں مناسب نہیں ہے جو اسلام کی ابجد سے بھی آگاہ نہیں وہ ناخواندہ ہے۔ اس کے ایمان کی قدر اپنی جگہ ہے لیکن اس کا ناخواندہ ہونا اسلام کا جرم نہیں ہے۔ بلکہ اس کا جرم ہے۔ اس کا بے عمل ہونا اسلام کی کمزوری نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اپنی کمزوری ہے اس کا ضعیف العقیدہ ہونا بھی کسی طور سے یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس کے عقائد ہی اسلام کے پیش کردہ عقائد ہیں۔ مسلمان کو اگر خود کو مسلمان کہلوانا ہے تو اسے سب سے پہلے ان تاریکیوں کو دور کرنا ہو گا جو اس کی وجہ سے اسلام کے روشن چہرے کو دھندلا رہی ہیں اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ وہ خود کو اسلام کے اس روشن پہلو کے حوالے کر دے۔ بلکہ اسلام کے حوالے مکمل طور پر کر دے اس میں پورے کا پورا داخل ہو جائے اور اس ایمان کے ساتھ داخل ہو کہ اسے ہر علمی' عملی' فکری اور تہذیبی محاذ پر اسلام کا صحیح نمائندہ بننا ہے۔ اسے اپنے وجود' روح اور عمل کو اسلام کے حوالے کرنا ہو گا اس کے اصولوں اور قوانین کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ہو گا۔

"جب مہذب لوگ اپنے اپنے ملک کے قانون کی پابندی کرتے ہیں تو وہ صحت مند شہری اور اپنے اپنے معاشرہ کے سچے دیانتدار افراد ہیں کوئی بھی ذمہ دار شخص نہ تو ایک لحمہ کے لئے یہ سوچے گا یا کہے گا کہ ایسے (پابند قانون) شہری قانون کا احترام کر کے اپنی آزادی کھو بیٹھتے ہیں کوئی بھی معقول ہستی یہ نہ سوچے گی نہ ایسی بات کہے گی کہ اس طرح کے پابند قانون لوگ چار و ناچار قسمت پر شاکر اور بے بس ہیں اس طرح وہ شخص بھی جو اللہ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے جو ہمہ تن خیر ہے اور اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرتا ہے جو بہترین قانون ہے۔ ایک صحت مند اور دیانت دار شخص ہے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کی ضمانت پا رہا ہے اور دوسروں کے حقوق کا حقیقی احترام کر رہا ہے اور اس طرح وہ ایک اعلیٰ درجے کی تخلیقی آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اللہ کی مرضی کے سامنے سرتسلیم خم کر دینا انفرادی زندگی پر پابندی لگ جانے کے مترادف نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس سے تو ایک بلند تر درجے کی بھرپور آزادی میسر آ جاتی ہے۔ یہ ذہن کو توہمات سے خالی کر کے حق و صداقت سے لبریز کر دیتا ہے یہ روح کو گناہ اور ظلم سے آزاد کر کے اس میں نیکی' بھلائی اور پاکیزگی سے جان ڈال دیتا ہے ہر نفس کو غرور اور لالچ' حسد اور فکر کے بوجھ اور خوف اور عدم تحفظ اور بے ایمانی کی کیفیت سے پاک کر دیتا

ہے۔ یہ انسان کو جھوٹے خداؤں اور اسفل خواہشات کی غلامی سے آزاد کر دیتا ہے اور اس کے سامنے نیکی، بھلائی اور حسن و خوبی کی راہیں کھلتی ہیں"۔ 2

مسلمان کو ایمان پر عملی طور پر قائم ہونے سے ظلم و ستم، جبرو استبداد، غلامی و محکومی، حقوق کی سلبی کے خوف اور شخصی آزادی کے چھن جانے کے ڈر سے نجات مل جاتی ہے۔ وہ معاشرے میں ایک ایسے فرد کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے جسے کسی حکمران کے رعب و دبدبے کی وجہ سے حق سے دور نہیں کیا جا سکتا وہ اپنے اعمال کی داد نہیں طلب کرتا اور اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ صرف اپنے حقوق کے لیے لڑنے والے اور دوسروں کے حقوق کے لیے کوشش نہ کرنے والے ظالم ہوا کرتے ہیں اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد نہ کرنے والے اور ہر کسی کی اطاعت میں سر تسلیم خم کرنے والے بزدل ہوا کرتے ہیں وہ ان دونوں رویوں کے برعکس توازن کی راہ اختیار کر کے معاشرے میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کے نظام کا ایک کارآمد حصہ بنتا ہے۔ ایک بھرپور سماجی عامل بنتا ہے۔ تاریخ نے اس سماجی عامل کو بروئے عمل دیکھا ہے اور اگر آج اسلام کو اس بھرپور سماجی عامل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تو یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ تو ترقی کی دشمنی ہے یہ تو روشن راہوں پر ماضی کے بند دروازے کھولنے والی بات ہے۔ راہیں تو اسے روشن کرنا ہیں اس لیے کہ اگر راہیں روشن ہوتیں تو اس کی اپنی شخصیت بھی روشن ہوتی اس کا عمل بھی بیدار ہوتا اور عالم اسلام کے چہرے پر کامرانیوں اور بیداریوں کا سورج کبھی غروب ہی نہ ہوتا۔ اس کا اصل المیہ ہی تو یہ ہے کہ اس نے واقعی ماضی کو ایک بند گلی قرار دے کر اس سے دور بھاگنے کی کوشش کی ہے اس نے ایسے بے ڈھب انداز میں ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھنے کی شعوری اور غیر شعوری کوشش کی ہے کہ اس کا شعور اور وجدان دونوں محل نظر ٹھہرے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کے مضبوط اور روشن حوالوں سے محض اس لیے خوفزدہ ہے کہ اگر یہ حوالے اس کی ذات اور شخصیت کا حصہ بنتے چلے گئے تو مغرب اسے قدامت پسند کہے گا اور یورپ میں اس کا تعارف بنیاد پرست کے طور پر کرایا جائے گا۔ اس رویے نے عالم اسلام کے دانشوروں اور مفکروں کو عاجز کر رکھا ہے۔ وہ بند گلیوں میں داخل ہونے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ان بند گلیوں میں ان کی صدا گونج بھی پیدا نہیں کرتی یوں یہ بند گلیاں بلیک ہول بنتی جا رہی ہیں۔ فکر اور شعور کا قرآن سے رشتہ کیا ٹوٹا ہے دونوں

بانجھ اور ناخواندہ ہو کے رہ گئے ہیں۔

"مسلم مفکرین نے عرصہ ہوا اسلام کو فراموش کر رکھا ہے انہوں نے اسلام پر ہونے والے حملوں کا کبھی دفاع بھی نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے اسلام کے کسی اصول کی غلط تعبیر کی صحیح صورت بیان کی ہے یا اس غلط تعبیر پر احتجاج ہی کیا ہے۔ انہوں نے اسلامی قانون و فقہ کو مدون کرنے کے لیے کسی ادارے کو بھی منظم نہیں کیا۔ حکمرانوں نے سنگین جرائم کے ارتکاب' مجرموں کو معاف کرنے' خون بہانے' عورتوں کی عصمت دری کرنے' برائیوں کے پھیلانے اور ان چیزوں کو عام کرنے کا کام کیا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ مفکروں نے ان اقدامات پر کسی قسم کی برہمی یا مخالفت کا بھی اظہار نہیں کیا ہے۔ انہوں نے صرف خاموشی کو اپنی صدا قرار دے لیا ہے وہ سمجھ رہے ہیں کہ اسلام انہیں اس بات کی دعوت نہیں دیتا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔ وہ اسے اپنی ذمہ داری ہی نہیں خیال کرتے کہ وہ حکمرانوں کو اسلام کے قوانین نافذ کرنے کی نصیحت یا مشورہ ہی دیں۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین مسلم ممالک میں رائج ہیں وہ اسلام کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اسلام کے اقتدار کو ختم کرتے ہیں اللہ نے جسے حرام کہا اسے حلال کرتے ہیں اور جسے حلال کہا اسے حرام کرتے ہیں پھر بھی مسلم مفکرین اس خلاف ورزی اور بغاوت پر آزردہ خاطر نہیں ہوتے نہ ہی انہیں اپنے مستقبل کی فکر ہے۔ حالانکہ انہوں نے اسلام کو اپنا دین قرار دیا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ وہ کسی ایسی مجلس کا بھی اہتمام نہیں کرتے جس میں اپنے ہاتھوں ہونے والے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف واقعات کا جائزہ ہی لے لیں کہ ان سے انہیں اور ان کی عظمت کو کیا دھچکا لگا ہے۔"[3]

سورۃ کہف میں ارشاد ہوتا ہے:

"اے نبیؐ! ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام نامراد کون لوگ ہیں وہ کہ (دنیا کی زندگی میں جن کی ساری جدوجہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ (کہف ۱۰۳-۱۰۴)

روشن فکر اور اسلام اسلام تو اس قدر روشن خیال دین ہے کہ وہ باپ دادا کی جاگیروں کی طرح فکر کو انسان کی جاگیر قرار نہیں دیتا بلکہ انہیں مسلسل غور و فکر اور متحرک

عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام پر یہ الزام عائد کرنا ہی کم علمی کی دلیل ہے کہ اسلام روشن فکر کا مخالف ہے۔ پرانا مذہب ہے اور انسان کو تنگ دائروں میں تقسیم کرتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آج دنیا بھر میں انسانی حقوق کا بہت بلند آہنگ میں ذکر کیا جاتا ہے انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر قوموں کی امداد بند کر دی جاتی ہے۔ سفارتی تعلقات ختم کر دیئے جاتے ہیں لیکن کتنے ستم کا مقام ہے کہ اس کے باوجود یہ دنیا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روک نہیں سکی اور اسی کشمکش میں مسلمانوں نے اسلام کی صحیح تصویر کشی نہیں کی۔ مخالفوں کے تیز اور زوردار' پروپیگنڈے نے ان کے اعصاب کیا شل کئے ہیں کہ وہ اسلام کے صاف ستھرے نظام کو پیش کرنا ہی شرم کی بات سمجھتے ہیں۔ اسلام انسانی حقوق کی بات کرتا ہے تو تمام انسانوں کو ایک ہی قطار میں کھڑا کر دیتا ہے محمود و ایاز بھی' عثمانؓ و بلالؓ بھی' آقا و غلام بھی گورا اور کالا بھی' چھوٹا اور بڑا بھی' غرض تمام انسان ایک ہی قطار میں کھڑے ہیں نہ کوئی رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک کا سزاوار ہے نہ کوئی ذات و علاقے کی وجہ سے ممتاز و سربلند کہلوا سکتا ہے۔

"جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اہتمام فرما کر باہمی اجتماع اور میل و محبت کے ایک مرکز کو وجود بخشا اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی کا ایک اور نہایت تابناک کارنامہ سرانجام دیا جسے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات اور بھائی چارے کے عمل کا نام دیا جاتا ہے۔ ابن قیم لکھتے ہیں

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس بن مالکؓ کے مکان میں مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ کرایا۔ کل نوے آدمی تھے۔ آدھے مہاجرین اور آدھے انصار۔ بھائی چارے کی بنیاد یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے کے غمخوار ہوں گے اور موت کے بعد نسبی قرابت داروں کے بجائے یہی ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ وراثت کا یہ حکم جنگ بدر تک قائم رہا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

واولوا لارحام بعضھم اولی ببعض (۳۳/۶)

" نسبی قرابت دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ "

تو انصار و مہاجرین میں باہمی توارث کا حکم ختم کر دیا گیا لیکن بھائی چارے کا عہد باقی رہا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور بھائی چارہ کرایا تھا جو خود باہم مہاجرین

کے ہی درمیان تھا۔ لیکن پہلی بات ہی ثابت ہے یوں بھی مہاجرین اپنی باہمی اسلامی اخوت' وطنی اخوت اور قرابت داری کی اخوت کی بناء پر آپس میں اب مزید کسی بھائی چارے کے محتاج نہ تھے۔ ـــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بھائی چارے کو محض کھوکھلے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا تھا بلکہ اسے ایک ایسا نافذ العمل عہد و پیمان قرار دیا تھا جو خون اور مال سے مربوط تھا۔ یہ خالی خولی سلامی اور مبارک باد نہ تھی کہ زبان پر روانی کے ساتھ جاری رہے مگر نتیجہ کچھ نہ ہو بلکہ اس بھائی چارے کے ساتھ ایثار و غم گساری اور موانست کے جذبات بھی مخلوط تھے اس لیے اس نے اس نئے معاشرے کو بڑے نادر اور تابناک کارناموں سے پر کر دیا تھا۔"۔ (4)

اگر آج کی دنیا انسانی حقوق کے احترام کے لیے بنیادی شرط یہ بھی عائد کرے کہ انسان بحیثیت انسان احترام اور تکریم کا حق دار ہے۔ اس کے تمام حقوق کا تحفظ سب کی اجتماعی ذمہ داری ہے تو بھی دنیا کو انسانی حقوق کے چارٹر کی بنیاد کردار کو ہی بنانا پڑے گی نہ کہ رنگ و نسل اور زبان و وطن کو۔ آج کی دنیا میں ہونے والے انسانی حقوق کے خلاف جرائم کی فہرست میں سب سے مظلوم اور حقوق سے محروم مسلمان ہی ہے جسے اسے اپنے ممالک میں بھی آزادی سے اپنے دین پر عمل درآمد کا حق حاصل نہیں ہے۔ تازہ ترین حالات سے بھی ایک آدمی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اسلام کو اور مسلمانوں کو آزادی حاصل نہیں ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد وسطی ایشیا کی مسلم ریاستیں آزاد ہوئیں تو امریکہ نے اپنے خدشات کا اظہار کیا کہ یہاں اسلام قدم جما لے گا اور ایک وسیع و عریض بلاک وجود میں آجائے گا۔ امریکہ کے خدشات یہ تھے۔

"امریکی دو وجوہات کی بناء پر ان علاقوں میں مضبوط قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ اکثر امریکی تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ سوویت یونین کی ان مسلم ریاستوں کے ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان اشتراکیت کے زوال کے بعد نظریاتی راہنمائی کے لیے اسلام کی طرف دیکھ رہے ہیں اور اسلام اس خلا کو پر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۵ میں میخائیل گوربا چوف برسر اقتدار آئے تو سمرقند کے قدیم اسلامی مرکز میں صرف تین مساجد کھلی تھیں۔ آج اسی شہر میں ۱۵۰ مساجد ہیں بعض رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ پچھلے چند برسوں میں وسطی ایشیائی ریاستوں میں مساجد کی تعداد دوگنی ہو کر دو ہزار تک جا پہنچی ہے۔

امریکی حکومت نے پہلے ہی ایسے افراد کو وسط ایشیائی ریاستوں میں متعین کر دیا ہے جو ان خطوں کی بولیاں اور زبانیں جانتے ہیں وہ یہاں اسلام کے کمزور اور مضبوط پہلوؤں کا مطالعہ کریں گے۔ دوسرے یہ کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ خطے میں ہونے والی تبدیلیوں کا بغور مطالعہ کر رہا ہے اس کا تجزیہ ہے کہ اسلام ان علاقوں میں سالوں کی سیکولرازم کے خلاف ایک ردعمل ہے۔ جسے وقت کے ساتھ ساتھ معدوم کیا جا سکتا ہے۔ ـــــ مغرب کو اس امر پر اطمینان ہے کہ اسلام اس خطے میں ایک سیکولر تحریک سے زیادہ نہیں ہے ـــــ عیسائی مشنریاں پہلے ہی ان علاقوں میں کام کا آغاز کر چکی ہیں اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ عراق پر امریکی بمباری کے بعد ان مشنریوں کا کہنا تھا کہ اب زیادہ بہتر حالات ہیں۔ اس لیے کہ لوگ پریشان ہیں۔ غربت اور مایوسی کی حکمرانی ہے۔ چنانچہ یہ مشنریاں لاکھوں ڈالر اکٹھے کر کے عیسائیت کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اور یہ کام نو آزاد مسلم ریاستوں میں بھی جاری ہے۔"5

روشن خیالی کا دعویٰ کرنے والے اور اسلام پر بنیاد پرستی کا لیبل چسپاں کر کے بدنام کرنے والے مغربی اور مغرب نواز عناصر کو سوچنا چاہیے کہ نظریاتی بالادستی کے لیے بھی کوئی ضابطہ و اخلاق ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ اور اگر موجودہ ترقی پسند اور روشن خیال انسان کے لیے یہ حرکت جائز ہے کہ وہ پہلے کسی مقام پر مصائب و آلام کا سبب بنے اور پھر خود ہی مسیحا بن کر چلا جائے تو اسے کم از کم کوئی بھی باشعور انسان روشن خیالی یا ترقی پسندی نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھی بہت عجیب و غریب عمل ہے کہ آپ مخالف کی قوت سے خائف ہوں اور اس کی قوت کا سامنا کرنے کی بجائے اس کی پیٹھ میں خنجر اتار دیں۔ امریکہ اور مغرب کے اسلام کے بارے میں یہ خدشات ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام سماج کی تعمیر و تشکیل کے جس پروگرام کو پیش کرتا ہے وہ اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر امریکہ اور اس کے یورپی اتحادی اقتصادیات کے حوالے سے سارے معاملے کو دیکھ رہے ہیں تو ان کا سارا دعویٰ ہی محل نظر ہے اس لیے کہ محض اقتصادیات کی بنا پر عالمی سماج کی تشکیل ممکن ہی نہیں ہے یہ صرف ایمان اور نظریے سے ہی وجود پا سکتا ہے۔

ایک اہم تضاد امریکہ کو اس حقیقت کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ جس سماج کے لیے وہ

کوشاں ہے اس کی بنیاد اگر اس کا اپنا سماج' امریکی طرز زندگی کو بنتا ہے تو معاملہ مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑا اور اہم ٹکراؤ تو یہی ہے کہ ایک متفرق اور منتشر سماج ایک عالمگیر سماج کی قیادت کرنا چاہتا ہے اور جس ہمہ گیر سماج کی اسے قیادت کرنا ہے اسے وجود بھی اسی متفرق اور منتشر سماج نے عطا کرنا ہے۔ ان حالات میں ایک ایسے سماج کا وجود میں لانا کیونکر ممکن ہے؟ اگر یہ "ہمہ گیر عالمی سماج" امریکی عزائم کے عین مطابق وجود میں آبھی جائے تو اس کے تمام اجزاء اور ارکان کو شدت سے احساس رہے گا کہ وہ امریکی سماج کے زیر اثر ہیں۔ ان کی تہذیب' ثقافت' دین و ملت کو اس قسم کے حالات و واقعات کے تابع ہونا ہے جو امریکی اور مغربی طرز زندگی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں ان کے لیے نہیں۔ یہ ایک زبردست توڑ پھوڑ کرنے والا ردعمل پیدا کرے گا دنیا بھر کے انسان اپنے سماجی رویوں کے ٹوٹنے کے خلاف مزاحمت کریں گے اور کوئی بھی اپنی پہچان کھونا پسند نہیں کرے گا۔ امریکہ میں عیسائیوں کے بلی گراہم سنٹر میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کا موضوع تھا کہ شمالی امریکہ میں رہائش پذیر مسلمانوں میں تبلیغ کے کام کو کیسے منظم کیا جائے۔

"سرکردہ مقرر' ماہر بشریات' مصنف اور ہندوستان میں کام کرنے والے سابق مشنری پال ہیبرٹ کی تقریر سے شرکاء کو بالجملہ یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اس تصور کو درست کرنا ضروری ہے کہ جدت (Modernity) اور عیسائیت یکساں ہیں انہوں نے مزید کہا کہ مشنریوں کو اپنے فرسودہ تصورات سے نکل کر مسلمانوں کے ساتھ روابط استوار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اکثر مسلمانوں کو ثقافتی ہم آہنگی کے سلسلے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

جناب ہیبرٹ نے کہا کہ "ہمارا واسطہ اسلام سے نہیں افراد سے ہے اگر ہم نظریات کی سطح سے نیچے نہ آئے تو ہم اس حد تک نفوذ حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے جہاں ہم انسانی ناطے سے مسلمانوں سے تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔"

کانفرنس کے بعض شرکاء نے جو تجربے اور مہارت کے لحاظ سے مختلف سطح کے حامل تھے' یہ ظاہر کیا کہ وہ اب بھی سیکھ رہے ہیں کہ روایتی انداز کی سوچ سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ مسلمانوں کے "مرکزی موضوعات" پر گروپ ڈسکشن میں ایک فرد نے اپنے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم لفظ "مسلم" استعمال کرتے ہیں اور پھر اسے فوراً ہی "عرب مسلم" بنا دیتے ہیں میرے خیال میں یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

کانفرنس میں شریک ایک دوسرے شخص نے یہ بات نوٹ کی کہ ڈسکشن گروپ کے شرکاء کی سوچ روایتی اسلام مثلاً پانچ ارکان تک محدود تھی اور انہوں نے امریکہ اور کینیڈا میں مسلمانوں کی ثقافتی ضروریات کا بہت کم جائزہ لیا۔ اس نے سوال کیا کہ "شمالی امریکہ کے تقاضوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں وہ لوگ تبدیلی کے عمل سے گزر چکے ہیں اور ہم اس تبدیلی کو کیسے دیکھتے ہیں۔"

جناب ہیبرٹ نے کہا کہ بہت سے مسلمان مغرب کے بارے میں یکسو نہیں ہیں ایک طرف وہ اسے زوال پذیر خیال کرتے ہیں اور دوسری جانب اسے مواقع کی سرزمین سمجھتے ہیں انہوں نے کہا کہ مذہب تبدیل کرنے والے نئے لوگوں سے متعلق کلیدی سماجی مسائل میں موزوں عیسائی کی تلاش' ان کے پرانے اور اب مخالفانہ معاشروں کے ساتھ مطابقت کا حصول اور دوسرے عیسائیوں اور چرچوں کے ساتھ تعلق استوار کرنے کے چیلنج درپیش ہیں۔

------ ------ جناب سروش نے بتایا "خدا نے جب مناظرے کا خیال میرے دل میں ڈالا تو میں زندگی میں پہلی دفعہ اپنی بیوی کو قبرستان لے گیا تدفین کی جگہ جا کر میں نے ایک تابوت اٹھایا میں نے کہا کہ اگر تم اتنے ہی مقدس ہو تو یاد رکھو کہ ہمارا خدا ان کے خدا سے بڑا ہے۔ ان کی امیدوں سے بھی بڑا ہے اور ہر اس چیز سے جو ان کے پاس ہے۔ اگر مسلمانوں کو عیسائیت کے دائرے میں لانے کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑی تو ایسا کروں گا۔ یہ وقت تھا جب ہم نے اپنے خوف پر قابو پا لیا اور کہا "خداوندا! یہ تیری ہستی ہی کے شایان شان ہے کہ میرا جینا بھی تیرے لیے ہو اور میرا مرنا بھی تیرے لیے ہو"۔ 6

بنیادی نکتہ جس پر مسلمانوں کو توجہ کرنا چاہیے وہ یہی ہے کہ ہمیں کس طرح اپنے سماجی اور تمدنی رشتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اسلام کو اس کا اصل کام کرنے کے لیے اختیار کرنا ہے۔ اسلام میں جس قدر انقلابی عمل موجود ہے۔ وہ کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔ ہمیں اسلام اور مسلمانوں کی دوئی کے مسئلہ کا حل بھی تلاش کرنا ہے جو ہمارے اسلام پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ مسلمان دانشوروں اور مفکرین کو اس جانب توجہ مبذول کرنا چاہئے کہ دور حاضر میں اسلامی علوم و فنون کی تدوین جدید ان کی اصل ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی سے وہ خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔ انہیں

وقت کا امام ہونے کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے اسلام کے اصل اور حقیقی ماخذ قرآن و سنت سے رابطہ بڑھانا ہی نہیں ہے گہرا اور ناقابل شکست بنانا ہے۔

مسلم ممالک میں اسلامی معاشروں کے قیام کے لیے عدل و انصاف اور معاشی فلاح کے اسلامی پروگرام کو عملی صورت میں سامنے لانا بھی دور حاضر کا ایک اہم چیلنج ہے۔ فی زمانہ رشتے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ انسان کی قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔ اور وہ قناعت کے جوہر سے مرحوم ہوتا جا رہا ہے اس کی سوچ مفلوج ہونے کا خدشہ موجود ہے۔ سائنس کی تیز رفتار ترقی کا ساتھ دینے کے لیے ضروری تھا کہ اس کا قبلہ اور زندگی کا نظریہ درست رہے یہ کام نہیں ہو سکا ہے۔ عالم اسلام کو اس اعتبار سے دوہرا چیلنج درپیش ہے ایک طرف تو اسے سائنس کی اس تیز رفتار ترقی کو اپنے معاشروں کی مادی فلاح کے لیے بروئے کار لانا ہے اور دوسرے اس ترقی کو بروئے کار لاتے ہوئے روح کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اسلام ہی اس تیز رفتار سماجی عمل کے لیے بہترین محرک بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور مذہب یا نظریے میں یہ اہلیت نہیں ہے۔

1- تفسیر تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی۔
جلد اول صفحہ 428

2- "اسلام ایک روشن حقیقت" ڈاکٹر محمودہ عبد العاطی صفحہ 31
ہندوستان دہلی کیشنز. دہلی۔ شائع شدہ مئی 1982ء

3- "The Journal of Rabitatal Alam-al-Islami Makkah 1400 A.H."
صفحہ 31-32

4- "اسلامی معاشرے کی تشکیل" مولانا صفی الرحمان مبارک پوری
اردو ڈائجسٹ۔ رحمت اللعالمین نمبر مئی 1989 صفحہ 85

-5 "Us Moves to Check Islam In Central Asia"

By Gulfashan K. Alavi, New York

Daily the News - 11 March, 1992

-6 "عالم اسلام اور عیسائیت" فروری 1992 صفحہ 15-16

مغرب کے خدشات

- پس منظر
- دین و مذہب کا کردار
- یورپ کی قدیم سوچ
- اسلام کا پیش کردہ حل
- مغرب کے خدشے کی اصل حقیقت
- سیاست سے بے دخلی
- سیکولر حلقوں کے خطرات

مغرب کے خدشات

پس منظر   اشتراکیت کی حتمی شکست کے اسباب تلاش کرتے ہوئے مغربی سیکولر حلقے افغانستان میں جہاد کے چودہ سالہ کردار کو دیکھتے ہیں تو انہیں یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس جہاد نے اشتراکیت کے خاتمے کا کام تو خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے تاہم دنیا بھر میں اپنے اثرات بھی مرتب کئے ہیں جن سے امریکی اور یورپی مفادات کو خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے یہ بات ثابت کریں کہ افغان جہاد سے ابھرنے والے تاثرات "اسلامی بنیاد پرستی" کی ایک عالمی تحریک کو مضبوط کر رہے ہیں۔ جس سے مہذب دنیا میں عقل و دانش' ترقی' معاشی خوشحالی اور عالمی امن کو سنگین خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ ان بنیاد پرستوں کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ تاکہ "جدید تہذیب" کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو ختم کیا جا سکے اور Post modernism کا فلسفہ پوری دنیا میں جاری و ساری ہو سکے۔

اسلام کے بارے میں امریکہ اور مغرب کے خدشات کی تاریخ بہت طویل ہے۔ لیکن ان خدشات کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو بطور نظام زندگی کہیں بھی نافذ ہونے سے روکنے کے لیے جو اقدامات کئے ہیں وہ نہ صرف مہذب طرز سے ہٹے ہوئے ہیں بلکہ ان سے صریحاً" اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک "دشمن نظریے" کے طور پر دیکھتے ہوئے مستقبل میں اسے ایک رکاوٹ سمجھتے طور پر دیکھتے ہیں اور اس رکاوٹ کو دور کرنا ان کی ضرورت ہے۔ مغرب میں آج کے دور میں نئے نئے مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ جن میں نسلی قومیت' وطنی قومیت' یورپی قومیت کے معاملات کے ساتھ ساتھ انفرادی اور سماجی زندگی میں جنس' صحت' روحانیات اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت بھی اہم مسائل ہیں۔ ان مسائل کی گوں ناگوں حیثیت کے پیش نظر مغربی تہذیب اسلام کی مربوط اور منظم قوت کو ان کا حل تصور کرتی ہے۔ جس کے بروئے عمل آنے کی صورت میں یورپ کی سیاسی زندگی پر براہ راست اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ مشہور مستشرق اور میک گل یونیورسٹی کے انسٹیٹیوٹ برائے اسلامک سٹڈیز کینیڈا کے پروفیسر چارلس آدم نے اپنے ایک انٹرویو میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے

ہوئے کہا تھا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ اسلامی تحریکوں پر غور کیا جانا ضروری ہے۔ جب ہم ان تحریکوں کے منفی پہلو کو دیکھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ تحریکیں اپنے معاشروں میں عام مسلمانوں کے معاملات اور مسائل سے لاتعلق ہیں۔ میں ایک ایسے قلم نگار کا حوالہ دوں گا جس کا اس حوالے سے بہت مقام ہے اس کا کہنا ہے کہ سارا عالم اسلام ایک گہرے سماجی بحران کا شکار ہے۔ اس بحران کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں دور غلامی کے تجربات' غیر ملکی غلبے' غیر ملکی فوجی قوتوں کے ہاتھوں شکست' اقتصادی عوامل اور غربت بھی شامل ہیں۔ عرب دنیا میں عرب اسرائیل تنازعہ اور اس قسم کے دیگر مسائل سے افسوس ناک صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس سماجی بحران کے خاتمے کے لیے بہت قابل قدر کوششیں ہوئی ہیں تاہم انہیں کامیابی نہیں مل سکی۔

اگر مثبت انداز سے دیکھا جائے تو میں ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا جن کا کہنا ہے کہ عالم اسلام میں جوش و جذبہ ایک عارضی لہر کی صورت میں سامنے رہتا ہے اور یہ کہ اس جوش و جذبہ پر مبنی لہر کا واحد مقصد مسلمانوں کو عبادات کے حوالے سے زیادہ متحرک بنانا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ایک ایسی مربوط اور مسلسل جدوجہد دیکھ رہے ہیں جو اسلام کے موجودہ سماجی بحران کے حل کے لئے کر رہی ہے اس کے ثمرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ "اسلام کی طرف پلٹنے" کی دعوت اپنے اندر تحریک بھی رکھتی ہے۔ اور اس کی اپنی خصوصیات بھی ہیں۔ میرے خیال میں جب کوئی بھی اس مثبت نتیجے تک پہنچتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس مربوط اور مسلسل جدوجہد کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گی اور وہ اس کوشش کے نتیجے میں یہ ضرور جان لیں گے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟

کسی بھی قیمت پر یہ کوشش ان لوگوں کے لیے پرکشش بھی ہے اور فائدہ مند بھی جو عالم اسلام کے سماجی بحران کا حل چاہتے ہیں یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جسے وہ اختیار کر سکتے ہوں۔

اسلام کا مستقبل دو باتوں سے منسلک ہے اس مستقبل سے ان حکومتوں کی فتح و شکست بھی وابستہ ہے جو اس وقت موجود ہیں اور وہ حکومتیں اسلامی معاشرے کو وجود میں لانے اور اسلامی کردار اختیار کرنے پر بھی تیار ہو سکتی ہیں۔ ان حکومتوں کے حوالے سے

پہلی بات جو انہیں اسلام کے مستقبل میں جگہ دے سکتی ہے ان کی وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے یہ حکومتیں عوام کو خوراک، صحت، علاج، ہاؤسنگ، تعلیم کی سہولتیں دینے کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کے حل پر بھی توجہ دے سکیں۔ اگر حکومتیں بہتر طریقے سے ان خامیوں پر قابو پالیں تو وہ اپنی بنیادیں مضبوط کر سکتی ہیں۔ اور جدید دنیا میں وہ مستقل اور دائمی کردار بھی ادا کر سکتی ہیں۔ دوسری بات قیادت سے متعلق ہے۔ اگر عالم اسلام میں سے کوئی ایسا فرد سامنے آتا ہے جو انفرادی طور پر قیادت کی جملہ خوبیوں سے متصف بھی ہو اور عالم اسلام میں اس کو قبول کر لیا جائے، وہ حقیقت پسندی سے تمام مسائل کے حل کے لیے کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کے لیے بہت ہی زیادہ مواقع موجود ہیں۔ اگر ایسی قیادت اختیار اور اثرات سمیت ابھرتی ہے تو میرا یقین ہے کہ اسلامی تحریکوں کی زندگی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا اور وہ اپنے اپنے ممالک میں ایک طاقتور اثر قائم کر سکیں گی۔" 1

چارلس آدم کے ان خیالات کو پڑھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عالم اسلام میں سیاسی قوت میں کمی سے پیدا ہونے والے مسائل محض سماجی ہی نہیں تھے ان کی اثر پذیری کا دائرہ ہر شعبہ زندگی تک پھیلا ہوا تھا۔ سیاسی قوت میں کمی اور اس کے بتدریج خاتمے میں معاشی عامل کو بہت عمل دخل رہا ہے۔ خلافت عثمانیہ کے زوال اور خاتمے کی راہیں تلاش کرتے ہوئے جناب الطاف گوہر نے بالکل درست تجزیہ کیا وہ کہتے ہیں۔

"چلئے اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ نے اپنی خود مختاری کو اس وقت گروی رکھ دیا اور اپنی سلطنت کو گم کر لیا جب وہ غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دب گئی تھی سلطنت عثمانیہ کی سیاسی آزادی اس وقت سلب ہو گئی تھی جب یورپی ممالک نے اس پر اقتصادی حملہ کر دیا تھا۔ البرٹ ہورانی اپنی کتاب ہسٹری آف دی عرب پیپل (شائع کردہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1991 میں لکھتے ہیں کہ 1850 کے عشرے سے بعد تک عثمانی حکومت کو فوج اور انتظامیہ کو ادائیگی کرنے کے لیے رقم کی ضرورت رہتی تھی اس بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ یورپ تھا۔ جہاں صنعت و تجارت کے ذریعے سرمایہ کی بہت فاضل مقدار جمع ہو رہی تھی اور اس سرمائے کو بنک کے ادارے کے ذریعے ایک چینل میں لایا گیا تھا۔ عثمانی حکومت نے بہت بڑے پیمانے پر قرضوں کے حصول کا کام کیا یہ

قرضے انتہائی غیر مناسب شرائط پر بھی قبول کئے جاتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ 23 کروڑ 60 لاکھ کو ترکی پاؤنڈز (ترکی پاؤنڈز اس وقت 0.9 برطانوی پاؤنڈ کے مساوی تھا) کے قرضے میں سے عثمانیوں کو صرف 13 کروڑ نوے لاکھ ملے باقی رقم کاٹ لی گئی

"1757 میں یہ حکومت سود اور ادائیگیوں کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ چنانچہ 1881ء میں ایک Public Debt Administration بنائی گئی جو غیر ملکی قرض خواہوں پر مشتمل تھی۔ اس کو عثمانی سرمایے اور آمدنی کے ایک بڑے حصے کا نگران بنا دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عثمانی حکومت کے معاملات میں اقتصادی محرکات کو گہرا عمل دخل حاصل ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک عمل مصر اور تیونس میں دہرایا گیا جس نے دونوں ملکوں کو فرانس کے براہ راست کنٹرول میں دے دیا۔ مصر میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے بے شمار مراعات کے اعلانات نے غیر ملکی مداخلت کے لیے مواقع فراہم کر دیئے۔ مصر اپنی ترقیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے بری طرح قرض لے رہا تھا"۔ 2

جناب الطاف گوہر نے آگے چل کر ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے کردار اور حکومتوں پر اس کے کنٹرول اور اثرات کا جائزہ پیش کیا۔ پاکستان کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔

"ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف نے بالکل اسی طرح ہمارے اقتصادی معاملات کا کنٹرول سنبھال لیا ہے جیسا کہ فرانسیسیوں نے Public Debt Administration بنا کر عثمانی حکومت کے ذرائع آمدن کے بڑے حصے پر کنٹرول کر لیا تھا۔ ہمیں ایک نگران حکومت دی گئی ہے جس کے سربراہ ورلڈ بنک کے ایک انتہائی بااعتماد افسر ہیں جو ہمارے ملک میں ایسے اقدامات کرنے اور انہیں نافذ کرنے میں مصروف ہیں جو دراصل آئی ایم ایف کی شرائط ہیں۔ اور جنہیں ہمیں قرض دینے والے غیر ملکی عناصر لازمی نافذ کرانا چاہتے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ تمام اقدامات ملکی مفاد میں کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمیں قرض دینے والے غیر ملکیوں کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔"۔ 3

دین و مذہب کا کردار عصر حاضر کی اقتصادیات میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہے۔ سلام سیاسی غلبے کے معاشی عامل کے اس خطرناک رجحان کی روک تھام کرنا چاہتا ہے تاکہ اقتصادیات کے ذریعے قوموں کی غلامی اور آزادی کا فیصلہ نہ ہو جبکہ یہ خود اقوام کے عمل

سے انجام کو پہنچے۔ عالم اسلام کو سیاسی غفلت سے بیدار ہونے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہب کو سیاست اور اقتصادیات میں بھرپور کردار ادا کرنے سے روکا جائے۔ مسلم ممالک میں ایسی حکومتوں کا تسلسل جو عثمانی حکومت کے نقش قدم پر چلتی رہیں اور حقیقی معنوں میں خود انحصاری کی پالیسی اختیار نہ کریں۔ مغرب اور امریکہ کا سب سے بڑا مفاد ہے۔ صرف مذہب کی ایک ایسی قوت ہے جو اس مفاد کا راستہ روکتی ہے۔ اس قوت کو بے اثر کرنے کے لیے اسے بنیاد پرست کہا جاتا ہے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ

i) اسلام کے چودہ سو سالہ پرانے نظام پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے ان تعلیمات سے دور حاضر میں زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی۔ جو عناصر ان تعلیمات کو مشعل راہ بتاتے ہیں وہ ترقی کے عمل سے ناواقف ہیں اور بنیاد پرستی کے شکار ہو رہے ہیں۔

ii) اسلام بطور نظریہ زندگی انتہائی مبہم نظریہ ہے۔ جو یہ نہیں بتاتا کہ جدید دنیا کے مسائل کا حل کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اسلام سے اشکالات تو ابھرتے ہیں لیکن وہ ان کا حل پیش نہیں کرتا۔

iii) جو لوگ آج بھی اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ مذہبی جنونی اور بنیاد پرست ہیں اور عملی زندگی سے بہت دور رہتے ہیں۔

اسلام کے بارے میں اہل مغرب اور امریکہ کے یہ نظریات ان کی اسلام اور اسلامی تاریخ سے عدم آگہی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اسلام کے بارے میں کم علمی اور کج خیالی وہ اصل وجوہ ہیں جن کے تحت یورپ اور امریکہ میں اسلام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ اس عمل ناسمجھی میں اسلام کے خلاف ان کے نظریاتی اور تاریخی تحفظات کو بھی گہرا عمل دخل ہے۔

یورپ کی قدیم سوچ سب سے اولین بات تو یہ ہے کہ یورپ آج بھی اسلام کو صلیبی دور کی سوچ کے حوالے سے دیکھتا اور سوچتا ہے۔ اس نے شاہ رچرڈ آف انگلستان کے دور سے آگے ترقی نہیں کی اور نہ ہی وہ شاہ رچرڈ کے اثرات سے آزاد ہو سکا ہے۔ یہ درست ہے کہ مغرب کی موجودہ نسلوں کو صلیبی جنگوں کے اصل کردار کا علم نہیں ہے لیکن ان کے تجربات اور اثرات نے یورپی ذہن کو جو رخ دیا تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ جس طرح برصغیر پاک و ہند میں آج بھی مسلمان ہندووانہ رسوم کو مشرقی تہذیب کی علمبردار سمجھ کے قبول

کرتے ہیں۔ دوسرے مستشرقین نے اپنی نسلوں تک جو پیغام دیا ہے وہ بھی تعصب سے خالی ہرگز نہیں ہے۔ ان کے پیش کردہ تصور اسلام اور اسلامی تاریخ میں صلیبی شکست بہت نمایاں ہے جو انہیں صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی۔ آج کے دور میں بھی جب وہ اس نام کی بازگشت سنتے ہیں کہ مسلمان کسی اور صلاح الدین ایوبی کو تخلیق کرنا یا جنم دینا چاہتے ہیں تو ان کا تاریخی تعصب عود کر آتا ہے اس بازگشت کا باقاعدہ تذکرہ یورپی تعلیمی اداروں کی نصابی کتب میں بھی ملتا ہے اور دیگر تحریروں میں بھی یہ نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً اس حوالے سے بھی اپنی نسلوں کو اسلام کے بارے میں گمراہ کرتے ہیں کہ یہ پرانا مذہب ہے۔ مسلمان ایک پتھر جس کا نام حجرا سود ہے کو بوسہ دیتے ہیں اور پتھروں کی ایک عمارت کعبہ کا حج کے دوران میں طواف کرتے ہیں۔ آب زم زم کو متبرک پانی کے طور پر پیتے ہیں اور اسے بھی ثواب کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا اسلام کے بارے میں عمومی علم محض اس قسم کے نامکمل اور نا آسودہ رویوں پر ہی مشتمل ہے۔

عالم اسلام میں بیداری کی لہر کو بھی اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے یورپ کے بوڑھوں کو ڈر لگتا ہے کہ یہ لہر متنوع اور قوت سے بھرپور ہو گئی تو ایک بار پھر عالم اسلام متحد ہو جائے گا اور ان کٹھ پتلی حکومتوں کو گرا دے گا جو مسلمانوں کو ان کے پہلے "دور غلامی سے نجات" کے آخر پر ورثے میں ملی تھیں اور "دوسرے دور غلامی" کا آغاز بنی تھیں۔ ان حکومتوں کا خاتمہ یورپ اور امریکہ کی سیاسی شکست ہو گی۔ اور اقتصادی نو آبادیات کا وہ نظام تلپٹ ہو جائے گا جس نے انہیں مسلم آبادیوں پر قبضہ کرنے کے لئے فوجیں بھیجنے کی تکلیف سے آزاد کر دیا ہے۔

اسلام کا پیغام بھی بذات خود ان قوتوں کے لئے ایک چیلنج ہے اس لئے کہ یہ پیغام سب سے پہلے انسان کی جبلی ضروریات غذا' لباس اور رہائش کے مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے تاکہ جب انسان عبادت کے لئے آئے تو وہ یکسوئی سے مالا مال ہو زندگی کی بے چینی اور مصائب اسے کفران نعمت کا مرتکب نہ بنا دیں ان اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ذرائع ابلاغ' ذرائع رسل و رسائل' ذرائع مواصلات اور دیگر سہولتیں سماجی زندگی کی معاشی و سیاسی اور عائلی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ معاشی ضروریات جب حدود سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ اور انسان

ان کا اسیر بن کے رہ جاتا ہے تو پھر وہ اجتماعی سوچ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ سماجی مسائل میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ معاشرے میں اقتصادی ناہمواری' امیرو غریب کی بنیاد پر عدل اور مساوات کے اصولوں کی پامالی اور احتساب کی قوت کے کمزور ہونے کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے علاج کے طور پر اسلام تجویز کرتا ہے کہ اقتصادیات' ریاست' خاندان اور عبادات میں توازن آنا ضروری ہے۔ پہلی تین چیزوں کی عدم موجودگی میں سماجی رویے عبادات کے حوالے سے زیادہ اثر قبول نہیں کرتے۔ اور عبادت ان کے بغیر راہب کی عبادت بن جاتی ہے جس سے سماج میں علیحدگی کا تصور ابھرتا ہے۔

اسلام کا پیش کردہ حل ان مسائل کے حل کے لئے اسلام سماجی اداروں کی مضبوطی پر زور دیتا ہے ان سماجی اداروں کی وحی کئے گئے پیغام یعنی قرآن کی روشنی میں ترتیب و تہذیب کرتا ہے۔ تاکہ ایک امت وسط تشکیل پا سکے جو انسانوں کو مسلسل نیکی اور بدی کے درمیان تمیز کرنا سکھاتی رہے۔ انسان سرمایہ ضرور حاصل کرے لیکن وہ مادہ پرست نہ بن جائے تاکہ سرمایے کے حصول کے طریقوں اور اس کے استعمال سے سماج میں برائیاں نہ پیدا ہوں۔

صلیبی دور سے اسلام سے دشمنی کے رویوں نے اہل مغرب کو اسلام سے آگہی سے دور رکھا ہے اس آگہی سے دوری میں ان مسلم مفکرین نے بھی کردار ادا کیا جنہوں نے مغرب کی سائنسی اور تکنیکی ترقی سے خود تو اثرات قبول کئے لیکن وہ مغربی تہذیب کو اسلام کی اصل تصویر دکھانے کے لئے خود کو کبھی منظم نہ کر سکے۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکے کہ مغرب خوشحالی اور ترقی کے ان راستوں سے مذہب کو الگ کر کے اخلاقی زوال اور تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اور ایک ایسے مقام تک چلا جائے گا جہاں اس کے بنیادی سماجی ادارے یعنی خاندان اور درس گاہیں تباہ ہو جائیں گی۔ اور بالآخر قوم میں نسلی لسانی اور علاقائی تعصبات کو ابھارنے کا سبب بنیں گی۔ سینٹ انتھونی کالج یونیورسٹی آف آکسفورڈ برطانیہ کے سینئر فیلو افتخار ملک لکھتے ہیں کہ :

"مغربی تجزیہ نگاروں نے اسلام اور عالم اسلام کے معاملات کو بہت ہی زیادہ سطحی انداز سے دیکھا ہے جو خطرناک حد تک بھی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اسلام کے نام پر تبدیلی اور ترقی کی ہر تحریک کو ایک بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کو اب بھی ان کے ہاں

ایک گلے بند ھے نظریے کے تحت دشمن ہی تصور کیا جاتا ہے۔ اس مخالفانہ روش کی وجہ سے اہل مغرب مسلمانوں کی حرکت عمل اور ان کے مسائل سے آگاہ نہیں ہو سکے جو مسلمانوں نے نو آبادیاتی دور کے بعد اختیار کئے ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ اور کسی حد تک ان کے تعلیمی ادارے مسلسل اس بات کی جستجو میں ہیں کہ وہ اپنے بیرو میٹر کے مطابق عالم اسلام کو مجبور کریں کہ وہ اقلیتوں کے حقوق' جوہری عدم پھیلاؤ' انسانی حقوق اور جمہوریت کے بارے میں پالیسیاں اختیار کرے۔ وہ اپنے ذرائع سے معلومات جمع کر کے مسلم ممالک کے خلاف فتوے جاری کرتے ہیں ـــــ اسلام کو بطور دین "بنیاد پرستی" کے خود ساختہ نعرے تک محدود کر دیا ہے او وہ اس سے مراد خانقاہی نظام ہی لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام بطور دین اور مسلم سماج اور ثقافت میں فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ معاشروں میں موجود قومی اور نسلی تضادات اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جذبات کو بھی گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغرب کا ایک ایسا نکتہ نظر سامنے آتا ہے جو مسلم دنیا کے ایک بڑے حصہ کو توڑ پھوڑ کا شکار بنا دیتا ہے۔

اس رویے کو نا کافی خیال کرتے ہوئے یہ حلقے اب مسلمانوں کو سرد جنگ کے بعد ایک ایسے خیالی خطرے کی صورت میں دیکھتے ہیں جو ان کے "مستقبل کا دشمن" ہے۔ اس رجحان کی ذمہ داری مسلم دنیا کے مخلوط رویوں' یورپ کے حوالے سے جغرافیائی اہمیت اور اسلام کے یورپ میں دوسرا بڑا مذہب ہونے پر ڈالی جاتی ہے۔ امیگریشن کے حوالے سے مغرب کے جدید خیالات بھی اس رجحان کو تقویت دیتے ہیں۔ جنہیں مسلمان اور عیسائی دنیا کے مابین غیر متوازن تعلقات کی تاریخی تعبیر کے حوالے سے بھی دیکھا جاتا ہے"۔

افتخار صاحب مزید لکھتے ہیں۔

"ہم نے 1980 کے عشرے میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ سوویت یونین کے خلاف جدوجہد میں افغانستان کے اندر دینی قوتوں کو نسلی اور تہذیبی قوتوں کی مشترکہ مدد بھی حاصل تھی۔ اسی طرح وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں نے خود کو اچانک "دریافت" نہیں کر لیا پر ۔ستراییکا سے پہلے بھی ان کی واضح پہچان ماسکو کے سخت گیر حکمرانوں کی موجودگی میں بھی تھی۔ تاہم "اسلامی" اور "مسلم" کی تفریق حیرت انگیز طور پر مخالفانہ تعریف کے طور پر موجود رہی اور غیر مسلم دنیا میں اسلام کی ایک بگڑی ہوئی تصویر پیش کی گئی جس کی پشت پر

صلیبی دور کی تلخ یادیں تھیں۔ اس طرح اسلام کا وہ کردار فراموش کر دیا گیا جو اس نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے درمیان ایک پل بنانے کے لئے ادا کیا تھا۔

اسلام ہمیشہ دائیں اور بائیں کی شناخت کو ختم کراتا رہا ہے لیکن اسے منفی معنوں میں لینا بھی ایک فیشن بن گیا۔ پچھلے بیس سالوں میں اس رجحان میں تیزی پیدا ہوئی جب سرمایہ داری اور اشتراکیت نے ایک دوسرے کے بجائے اسلام کو ایک جنون قرار دے کر اپنے لئے اور ایک دوسرے کے لئے خطرہ قرار دے دیا۔ ہم نے ہمیشہ محسوس کیا کہ جب بھی آیت اللہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو روس کی حمایت ہمیں ملتی ہے۔۔۔۔ کتابیں جلاتے اور ماتم کرتے ہوئے مسلمانوں کی تصاویر شائع کر کے کروڑوں مسلمانوں کو اس طرح پیش کر دیا گیا کہ ان کے اصل معاملات سے آگہی یا واقفیت کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی۔ (مغربی ذرائع ابلاغ نے) جب بھی الجزائر میں انتخابات' مسلم وسطی ایشیا کے واقعات قفقاز کے حالات' بلقان کے معاملات کو پیش کیا تو انہیں سنسنی خیزی کے ساتھ منسلک کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مسلم بنیاد پرستوں کا ظہور ہو رہا ہے اور اس میں بہت تیزی آ رہی ہے۔ اگرچہ بعض آوازوں سے عقل پسندی اور متانت کا اظہار بھی ہوتا تھا جس سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ آوازیں مسلم دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

مضمون نگار نے اس موقع پر اے ایچ ہملٹن کے مضمون BOGEY OF ISLAM TIMETO BURY THE شائع شدہ The Observer مورخہ 14 جون 1990ء کا ایک خوبصورت حوالہ دیا ہے جس میں ہملٹن نے الجزائر کے عام انتخابات کے بعد کے رویوں پر بات کی ہے۔ الجزائر میں انتخابی نتائج کو وڈیرہ ازم کے دوبارہ احیاء سے موسوم کیا گیا تھا۔ برطانوی وزیر خارجہ کے جنوری 1992 کے وسط میں دورہ بھارت کے بعد بھی کہا گیا تھا اسلامی بنیاد پرستی بھارت' دولت مشترکہ (روسی) اور بلقان کے لئے بنیادی خطرہ قرار دیا گیا تھا۔ اے ایچ ہملٹن کا کہنا ہے کہ

"ان میں سے بہت سی باتیں محض نسلی کشیدگی کی پیداوار تھیں۔ مذہب کا یہ مضحکہ خیز استرداد تھا۔ ثقافتوں کے اختلاط کا انکار تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اور باسانی سمجھ نہیں آتے تھے۔ اگر محب وطن ہونا گوروں میں پسندیدہ اور مسلمانوں میں پاگل پن سمجھا جاتا تھا اور جنگ چند مذہبی زخموں کا نتیجہ تھی اس میں سے اکثر

حصہ تو ایک بڑبولے کی باتیں ہیں جس کا مقصد دفاع کے اخراجات میں اضافے کے رجحان کو برقرار رکھنا ہے۔ اور ایک خود ساختہ خطرہ کھڑا رکھنا ہے اگر سوویت یونین کوئی خطرہ نہیں رہا جیسا کہ مارگریٹ تھیچر نے پچھلے ماہ (مئی 1990) میں نیٹو کے اجلاس میں کہا کہ مغرب کو پھر بھی مشرق وسطی سے معاملہ کرنے کے لئے چست افواج کی ضرورت رہے گی۔ اگر مارگریٹ تھیچر اور ان کے پیروکار ابھی تک مشرق وسطی کے بارے میں اس حد تک فکر مند ہیں۔ جس کے لئے ان کے پاس کافی جواز بھی موجود ہے تو پھر اس صورت حال کا جواب گن بوٹ اور سٹرائیک فورس میں نہیں ہے بلکہ اس خطے کے جسم پر فلسطین کے پھوڑے کے خاتمے میں ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے (تو الجزائر کے نتائج کے حوالے سے) فکر کی بات الجزائر کے دارالحکومت کے لئے نہیں ہے بلکہ تل ابیب میں بیٹھے لوگوں کے لئے ہے"۔

مغرب کے ان رویوں کا اسلام کو آنے والے دنوں میں زیادہ شدت سے سامنا کرنا پڑے گا۔ عالم اسلام میں اس پیغام کو وصول کرنے والے بھی متفرق ہیں۔ اور وہ اسلام کی جہادی صفت کو جدید دنیا میں ایک ایسی رکاوٹ قرار دیتے ہیں جو عالم اسلام کے مغرب اور امریکہ سے اتحاد کو ختم کرتی ہے لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بنیاد پرستی کے طعنے کو قبول کر کے بھی اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دی جا سکتی۔ اس کے اثرات قبول کرنے سے نظریاتی اور عملی سطح پر حالات کی گرفت عالم اسلام کے ہاتھوں سے نکلتی رہے گی۔ ہمیں پہلی بات تو یہی دیکھنا ہو گی کہ مغرب میں اسلام کا تعارف غلط طور پر کرایا جاتا ہے اس رجحان کو درست کرنا بھی ہمارے اسلامی ہونے کی شرط ہے۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے اسلام اور مغرب کے درمیان اس فرق کو یوں واضح کیا ہے۔

"مغرب کو اسلام سے خطرہ ہے کہ وہ اس کی تہذیب کو چیلنج کرے گا۔ مغرب کو اشتراکیت سے بھی ایسا ہی خطرہ تھا امریکہ نے جان بوجھ کر مسلم ممالک میں "بنیاد پرستی" کی حمایت کی اور اسے انقلابیت کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا سب سے زیادہ انقلابی فعالیت کا مظاہرہ کرنے والے امریکہ کے قریب ترین اتحادی تھے۔ 8-1977 کے دوران میں امریکہ کے صدارتی مشیر برائے قومی سلامتی مسٹر زبگنیو برزنسکی نے اعتراف کیا ہے کہ سوویت یونین کی مسلم ریاستوں میں بے چینی پیدا کرنے اور انہیں بغاوت پر اکسانے

کے لئے یہ اقدام ضروری تھا"۔ 4

مغرب کے خدشے کی اصل حقیقت آخر مغرب کو اشتراکیت سے کیوں خطرہ تھا؟ اب اسے اسلام سے کیوں خطرہ ہے؟ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مغرب اشتراکیت کی قوت اور سچائی سے خوفزدہ تھا اگر ایسا تھا تو پھر مغرب خود کمزور اور باطل تھا۔ اشتراکیت کے خاتمے نے ثابت کر دیا کہ وہ نہ تو قوت کے طور پر موجود رہا اور نہ ہی ایک سچ کے طور پر۔ اسلام کے مقابلے میں مغرب اپنی قوت کے بارے میں شک کا اظہار اس انداز سے کر رہا ہے تو پھر اس کے دعووں کی سچائی بھی محل نظر ہے۔ دراصل معاملہ خطرے کا نہیں حکمت عملی کا ہے۔ جسے خطرہ قرار دے کر عوام کو اس حکمت عملی کا ساتھ دینے پر رضامند کرنا ہے۔ جو مستقبل میں اسلام کی طرف عالم اسلام کے پلٹنے کے امکانات سے پیدا ہونے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری خیال کی جا رہی ہے۔ اشتراکیت کے خلاف محاذ بھی 1980 کے عشرے سے قائم نہیں کیا گیا جب کہ سرد جنگ کا سارا دور اس محاذ کی سیاست کا دور تھا۔ اشتراکیت کے خلاف مذہب کو لانے کی پالیسی مغرب نے بھی اختیار کی۔ جب پولینڈ کی سالیڈیریٹی کو تحفظ دینے اور اشتراکی حکومت کو گرانے کے لئے محاذ قائم کیا گیا۔ 7 جون 1982 کو ویٹی کن کی لائبریری میں پوپ جان پال دوم اور امریکی صدر رونالڈ ریگن کے درمیان معاہدہ ہوا۔ اس موقع پر موجود ان کے معاونین کا کہنا ہے کہ دونوں راہنماؤں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ یورپ کے حصے بخرے برداشت نہیں کئے جا سکتے اور نہ ہی مشرقی یورپ کو سوویت یونین کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایک آزاد اور غیر اشتراکی پولینڈ سوویت یونین کے سینے میں ایک خنجر ہو گا اگر پولینڈ نے جمہوریت کی شاہراہ پر قدم اٹھایا تو دیگر مشرقی یورپی ممالک اس کی پیروی کریں گے۔ ریگن نے اس موقع پر کہا کہ یالٹا کانفرنس میں ایک سنگین غلطی ہوئی تھی جس کا مجھے اور پوپ دونوں کو شدید احساس ہے۔ سالیڈیریٹی دونوں کے مستقبل کے منصوبوں کا مرکز تھی۔ جسے پولینڈ کے مزدوروں کا اعتماد حاصل تھا۔ ریگن کا کہنا تھا کہ اس جیسی تنظیم پورے مشرقی یورپ میں موجود نہیں تھی۔ اس مشترکہ موقف کو اختیار کرنے سے پہلے ریگن نے کہا تھا کہ پوپ جان پال اور مجھ میں چند مشترک باتیں موجود تھیں جنہوں نے ہمیں ایک جگہ لا کھڑا کیا۔ دونوں پر چھ ہفتوں کے فرق کے ساتھ 1981ء میں قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ دونوں کا کہنا تھا کہ خداوند مسیح نے دونوں کو

کسی بڑے مشن کے لئے زندہ رکھا ہے۔ ریگن کے دوست نے ٹائم کے رپورٹر کو بتایا کہ ریگن کہتے تھے دیکھو برائی کی قوتوں کا راستہ خداوند نے روکا ہے اس ملاقات کے بعد دونوں لیڈروں نے طے کیا کہ ـ

امریکہ ' ہنگری چیکو سلواکیہ اور پولینڈ میں خفیہ کارروائیاں کرے گا تا کہ وہاں موجود تحریکوں کو تقویت مل سکے۔

انسانی حقوق کے تحفظ' سیاسی آزادیوں اور مارکیٹ اکانومی کی حمایت کرنے والے مشرقی یورپ کے ممالک کی اقتصادی امداد کی جائے گی۔

سوویت یونین کو معاشی طور پر تنہا کر دیا جائے گا اسے مغرب اور جاپان سے ملنے والی ٹیکنالوجی روک دی جائے گی۔

نشریاتی آزادیوں کا وسیع استعمال کیا جائے گا مشرقی یورپ کے ممالک تک پیغام رسانی کے لئے وائس آف امریکہ اور ریڈیو فری یورپ کام کریں گے۔

اشتراکیت کے خلاف جدوجہد خود مغرب کی اپنی ضرورت بھی تھی اس کی وجہ اس کے سماجی نظام کی تباہی اور اقتصادی برائیوں کا ظہور تھا۔ خراب معیشت سے خراب سماجی حالات سامنے آ رہے تھے۔ اسلام کی صورت میں مغرب نے اشتراکیت سے بڑا خطرہ محسوس کیا ہے اس لئے کہ سماج کے اخلاقی رویوں کی اصلاح کا کام اسلام تو کر سکتا ہے اشتراکیت اس خوبی سے ہی عاری تھی' آج کا مغرب بھی اخلاقی بحران سے دو چار ہے اسی لئے وہ اسلام کے خلاف محاذ کھڑا کئے رہتا ہے تا کہ اس کے عوام کے سامنے ایک مسخ تصویر ہو اور وہ حال مست رہنے پر ہی ترجیح دیتے رہیں۔ اس سماجی نظام پر سے لوگوں کے اعتماد کے مکمل خاتمے سے فری مارکیٹ کے تصور کو شدید دھچکا لگ سکتا ہے۔ مغربی معاشروں میں اور امریکہ میں اسلحہ کے عام ہونے کے رجحان کی ایک وضاحت یوں بھی کی گئی کہ :

"بندوقیں دراصل بوریت اور خوف کے خلاف ایک دفاع ہیں جو راہنمائی نہ ہونے اور سمت درست نہ رہنے سے سامنے آتے ہیں"۔

(ٹائم۔ 2 اگست 1993ء) ص 37

مغرب میں نوجوان نسل میں قتل گری' گروپ سازی اور جرائم سے تعلق نے ایک ایسی نسل تیار کرنا شروع کر رکھی ہے جو خود سے اور ماحول سے خوفزدہ ہے۔ قانون نافذ

کرنے والے ادارے اور صحت عامہ کے ماہرین کا کہنا ہے کہ "پچھلے پانچ سالوں میں نوجوانوں میں ہنگامہ خیزی اور تشدد کا رجحان بہت شدت سے سامنے آیا ہے۔ امریکہ میں یہ رجحان وسطی علاقوں سے مضافات تک پھیل رہا ہے۔ انڈیانا پولیس کے پراسیکیوٹنگ اٹارنی چیف ماڈیسیٹ نے کہا کہ ہمیں ایسی نوجوان نسل کا سامنا ہے جو دن بدن جرائم سے زیادہ قریب ہو رہی ہے۔ دہشت گردی ان کی زندگی کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ (نیوز ویک 2 اگست 1993ء)

"اگر اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو شدید دھچکا لگتا ہے اس سے کہیں زیادہ دھچکا تب لگتا ہے جب نوخیز ملزموں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور وہ چیخ چیخ کر کہتے ہیں اوگریٹ! ہم نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے۔ ایک سترہ سالہ لڑکے نے ایک نوجوان کو محض اس لئے مار دیا کہ اس نے سن لیا تھا کہ اس کی عمر کے ایک لڑکے نے کسی کو قتل کر دیا تھا"۔

(نیوز ویک۔ 2 اگست 1993ء)

ان رویوں کے حامل معاشروں کے نمائندے جب عالم اسلام کی سیاحت پر نکلتے ہیں تو اسلام کے تعارف کو غلط انداز میں پیش کرنے کے لئے جواز تلاش کرتے ہیں تاکہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی حیثیت کے بارے میں ابہام پیدا کئے جائیں۔ اکانومسٹ لندن کا قاہرہ میں نمائندہ اسی تناظر میں اسلام کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"انقلابی اسلام کا پرچار کرنے والے اپنے آپ کو اسلامسٹ کہتے ہیں۔ شاید یہ مسلمانوں میں سے وہ آخری لوگ ہیں جو آج بھی مغرب کو اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہیں ان کے خیال میں مغرب دنیا میں ایک مخصوص پہچان والی جگہ ہے مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک وہ مغرب کو دوسری چیز سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں مغرب ایک ایسا مخالف ہے جو اسلام کو چیلنج کر رہا ہے۔ ایران کے ملا انقلاب نے دنیا کو یہ باور کرایا تھا کہ مغرب کے بارے میں اسلام سیاسی طور پر تشکیک کا شکار رہا ہے۔ لیکن اب جب کہ ایرانی انقلاب کے دھماکے کو ہوئے تیرہ برس بیت گئے ہیں سرد جنگ کے خاتمے نے مغرب کی ایک پہچان ختم کر دی ہے۔ اسلام کو بھی سوویت یونین میں اشتراکیت کی ناکامی کا فائدہ افغانستان اور وسط ایشیا میں حاصل ہوا ہے اب لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔

مصر کے ایک اسلام پسند ہفت روزہ "الشاب" کے تازہ شمارہ میں کہا گیا ہے کہ

مغرب ایک انچ بھی تبدیل نہیں ہوا وہ اپنے آپ کو اسلام دشمنی کے خول سے نکالنے پر تیار نہیں ہے۔ مصر کا ہی ایک انقلابی ماہنامہ "المختار الاسلامی" لکھتا ہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کے مابین ابتدائی کشمکش کے خاتمے کے بعد ہر کوئی یہ توقع کر رہا ہے کہ آئندہ تصادم اسلام سے ہو گا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو خبردار، ہوشیار اور تیار رہنا چاہئے۔ ملائشیا کی قومی مسجد کے امام نے کہا تھا کہ اسلام واحد قوت ہے۔ جو مغرب کے روحانی خلا کو پر کر سکتی ہے۔ چنانچہ مغربی لوگ اسلام کے عظیم احیاء سے خوفزدہ ہیں اس لئے وہ بچوں کو بوسنیا، برما، اری ٹیریا اور کشمیر میں ذبح کر رہے ہیں ہمیں بیدار ہونا چاہئے۔ ہماری آنے والی نسل کو مغرب سے آزادی چاہئے اسے مغرب کی ثقافتی اور مسیحی ارتداد کی طرف رجوع کرنے اور سیکولر معیشت اور سیاست سے نجات چاہئے۔

یورپ کی ایک صدی قبل کی استعماریت کے خلاف ابھرنے والے اسلام کے سیاسی نظریات آج بھی مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کا مطالبہ سامنے لانے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب انقلاب پسندوں کو پہلے سے زیادہ سیاسی حمایت حاصل ہو رہی ہے۔ ان کا پیغام بہت سرعت سے پھیل رہا ہے۔ وہ 20 ویں صدی کے خاتمے کے ساتھ ابھرنے والے عصری تقاضوں کو بھی زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے لگے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر کام اصول انسداد کے تحت کیا ہے ان کا ہر عمل مخالفت کا رنگ لئے ہوئے ہے جس سے منفی تاثر ابھرتا ہے اسلام امن چاہتا ہے وہ مغرب کی طرح جارحیت پسند نہیں ہے۔ وہ روحانی تعلیم دیتا ہے مغرب کی طرح مادہ پرست نہیں وہ نرم خو ہے مغرب کی مانند تیز رو نہیں ہے وہ نفاست پر یقین رکھتا ہے اس میں مغرب جیسی بے ہنگم زندگی نہیں ہے۔

لیکن اس کے متضاد دیکھا جائے تو اسلام ایک حقیقی خطرہ ہے اسلام کے انقلابی ذرائع ابلاغ اسے پیش کرتے ہیں اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔

(1) اردن کا ہفت روزہ "Al Liwa" اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ عرب راہنما امریکہ کے جارحانہ عزائم کا ساتھ دے رہے ہیں جن سے خانہ جنگی کو ہوا مل رہی ہے۔

(2) مصر کے ہفت روزہ "النور" نے دعویٰ کیا ہے کہ اسرائیل سربوں کو تربیت دے رہا ہے تاکہ وہ بوسنیا کے مسلمانوں کا قتل عام کر سکیں۔

(3) "المختار الاسلامی" نے 1967 کی عرب اسرائیل جنگ کی 25 ویں سالگرہ پر اس وقت کے مصری صدر جمال عبد الناصر کو اسرائیل کا ایجنٹ قرار دیا ہے۔

اس قسم کی بے پر کی عام طور پر اڑائی جاتی ہے کہ خلیجی بحران کا منصوبہ دراصل امریکہ نے تیار کیا۔ الجزائر میں 1991 میں منتخب حکومت کے خلاف بغاوت کا فیصلہ پیرس میں کیا گیا۔ مغرب کشمیر' آذر بائیجان' ایتھوپیا' سوڈان' برما اور لائبیریا میں مسلمانوں کے خلاف ایک عالمی جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ خطرات محض طبعی نہیں ہیں۔ ثقافتی آلودگی ایک اہم ترین خطرہ ہے "الشاب" کے ایڈیٹر عادل حسین کا کہنا ہے کہ ہم معاشیات' ثقافت یا کسی بھی شعبہ پر استعماری حملوں کو قبول نہیں کر سکتے۔ بدقسمتی سے بہت سے اسلامی ممالک ایسے ہیں جن کی حکومتوں نے حملہ آوروں سے اتحاد کر رکھا ہے۔ یہ حکومتیں مغربی ثقافت سے مرعوب ہیں اور اس کی ترقی سے پریشان ہیں۔ اس حملے کو روکنے کے لئے انقلاب پسندوں نے اسلام کی تفسیر میں وسعت پیدا کر لی ہے کچھ عرصہ قبل کسی کے مسلمان ہونے کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ اللہ کی توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے اب انقلابی کہتے ہیں کہ اسلام کے ماننے والوں کو اسلام پر پورے پورے اصول اور ضابطے کے مطابق عمل کرنا ہو گا ہر روایت کو ماننا اور معاشرے کو اس کے مطابق چلانا ہو گا اسلام میں سیاست دین الگ الگ نہیں کئے جا سکتے"۔

مغرب جس سیکولر سوچ کا حامل ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ یہ دراصل انسان کو مذہب سے بے نیاز کر کے عقل کے ذریعے اپنی ما بعد الطبیعی ضروریات پورا کرنے کا راستہ دکھانے کا نام ہے جب کہ عقل مذہب کی راہنمائی کے بغیر ایک خام نظریہ ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ مذہبی اور نیم مذہبی راستوں کو ترک کر کے دنیا پر نظر دوڑائے۔ کائنات' خالق' انجام' آخرت کے تمام حوالوں سے خود کو آزاد کرائے اور تاریخ کو بھی ان کی زہر ناکی سے نجات دلائے۔ انسان اس کائنات میں خود کو اس طرح دریافت کرے کہ اس کائنات اور اس دنیا کو مسخر کرنے' اس کے اندر پوشیدہ خزانوں کو حاصل کرنے اور اس بارے میں جاننے کا راستہ صرف اور صرف اس کے دست و بازو سے کھلتا ہے جو لوگ انصاف اور مذہبی ذمہ داریوں کے ذریعے ہر کام کرنا چاہتے ہیں وہ غلط سوچتے ہیں۔ لیڈن یونیورسٹی (LEIDEN UNIVERSITY) میں فلسفہ کے پروفیسر کار نیلس وان کا کہنا ہے کہ

سیکولر ازم نہ صرف سیاسی اور سماجی زندگی پر حاوی ہے بلکہ ثقافت میں بھی اس کا کردار ناقابل تردید ہے اس کا کہنا ہے کہ یہ ایک تاریخی عمل ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ معاشرے اور ثقافت کو مذہب سے آزاد کرا کے سیکولر ازم کے حوالے کر دیا جائے تاکہ مذہب کو نگرانی اور اتالیقی کے فرائض سے سبکدوش کر دیا جائے ان خیالات کو کارنیلس وان پرسن نے ہاورڈ کے دانشور ہاروے کوکس سے مستعار لیا ہے۔ جنھوں نے اپنی کتاب City The Secular میں 1965 میں ان خیالات کو پیش کیا تھا اس قبل ایسے ہی خیالات کا اظہار Ecumenical Institute of Bossey کی 1959 کی ایک رپورٹ میں کیا گیا تھا۔ ان حوالوں سے سامنے آنے والی سیکولر ترجیحات میں یہ بات شامل ہے کہ ان میں فطرت سے علیحدگی' سیاست سے تقدس کا خاتمہ اور اقدار کے دین سے تعلق کو ختم کرنا ضروری ہے گویا دین کی اخلاقی ساجیات اور با مقصد سیاسیات کے جن نظریات پر زور دیا جاتا ہے۔ سیکولر ازم ان نظریات کو باطل کر کے انہیں قطعی طور پر مادی تعبیر دینا چاہتی ہے۔ فطرت سے علیحدگی کے بارے میں جرمن ماہر عمرانیات میکس ویبر کا کہنا ہے کہ اس سے مراد فطرت کو مذہب کی غلامی سے نجات دلانا مقصود ہے تاکہ اسے روحانی ضرورتوں اور جادوئی کرشموں سے آزاد کرا کے فطری دنیا سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ خدا سے جدا کرتے ہوئے انسان کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ خدا کا پابند نہیں فطرت کا پابند ہے۔ اس لئے اس کے لئے فطرت یا قدرت کسی خدا کے مظاہر نہیں ہیں بلکہ اس مادی دنیا کے حصے ہیں۔ فطرت کی پابندی کے مظاہر تو مغرب میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ نوخیز جوانیوں کے فطرت کے اس فلسفے کے ہاتھوں لٹنے کا منظر Highway of Cheep Love پر دیکھنے کو ملتا ہے جو جرمن اور پراگ کے درمیان 12 کلومیٹر پر محیط ہے یہاں پر ہفتہ کی شب انسانیت نیلام ہوتی ہے ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ

"نوجوان عورتوں کے ساتھ دوسرا ہی معاملہ کیا جاتا ہے ان میں سے بہت سی جنسی غلامی پر مجبور کر دی جاتی ہیں۔ بعض کو رشتہ دار مرد اغوا کر کے بے آبرو کر دیتے ہیں اور نفسیاتی طور پر کاروبار پر لگا دیتے ہیں ۔ وہ اپنے جسمانی حصوں کی نمائش کرتی ہیں اور ان کے بروکر ان کی نگرانی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انہوں نے رات بھر میں کتنے لوگوں کو قریب آنے دیا۔ یہ بروکر لازمی طور پر گروہوں کے افراد نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک باپ یا ماں

بھی یہ کام کرتے ہیں۔ جو پچھلی کار میں بیٹھے اپنی بیٹی کا سودا کرتے ہیں۔ اسی دوران میں اس لڑکی کا چھوٹا بھائی پانچ ڈالر لے کر گاہک کی کار صاف کرنے آ نکلتا ہے"۔ 5

اگست 1993 میں پوپ جان پال دوم امریکہ کے دورے پر گئے تو ہزاروں لوگوں نے پوپ جان پال دوم کا زبردست استقبال کیا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ "پوپ ہم تمہیں پیار کرتے ہیں"۔ پوپ جواب دے رہے تھے۔ "امریکہ! تم خوبصورت ہو! پوپ نے ایک یوتھ فیسٹیول میں شرکت کرنا تھی جس میں دنیا بھر سے شرکت کے لئے ایک لاکھ 80 ہزار نوجوان امریکہ کے شہر ڈینور آئے ہوئے تھے پوپ جب سٹیڈیم میں داخل ہوئے تو جن کا استقبال کرتے ہوئے 85 ہزار افراد نے ڈانس کیا۔ پوپ نے فطری آزادیوں یعنی جنسی آزادی اور برتھ کنٹرول کے بارے میں امریکی رائے سے اتفاق کیا اور اسقاط حمل کی شدید مخالفت جاری رکھی۔ امریکہ میں اسقاط حمل کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو تربیت دینے کے لئے باقاعدہ کلاس لگتی ہے۔ ان لوگوں کو صلیبی جنگوں کے ہیرو قرار دیا جاتا ہے۔

ان فطری آزادیوں کے ہم آہنگ سماجی رویوں کی شکست وریخت کا منظر بھی کچھ خوشنما نہیں ہے۔ امریکہ کے دوسرے بڑے شہرلاس اینجلس کے بارے میں اب کہا جاتا ہے کہ یہ شہر بڑا تو ہو رہا ہے لیکن بالغ نہیں ہو رہا ہے یہاں نسلی جھگڑوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ امریکہ میں ہم جنس پرستوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر و رسوخ نے ری پبلکن اور ڈیموکریٹ پارٹیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ڈیموکریٹ ایسی آزادیوں کے حق میں ہیں اور ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ دینے کے لئے تیار ہیں جب کہ ری پبلکن پارٹی نے امریکہ کی "مسلمہ خاندانی اقدار" کے تحفظ کے لئے ایسی قانون سازی کی شدید مخالفت کی ہے۔ ڈیموکریٹ کہتے ہیں اگر ری پبلکن نے ہم جنس پرستی کی مخالفت کی تو وہ دائیں طرف کے مذہبی گروہ اور قدامت پسند نوجوانوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ انہی "فطری آزادیوں" کی ایک جھلک مختلف معاشروں میں موجودہ صورت حال سے بھی دیکھی جا سکتی ہے اور مذہب سے بیزار اقوام کے حال کو دیکھ کر ان کے مستقبل کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

"جن خاندانوں کے والدین نہیں ہیں انہیں وکٹوریہ جھیل کے کنارے اس بات کا بہترین موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی مشکل زندگی گذار سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان کے بچوں میں سے بڑی ایک بہن بھی ہو۔ ایک نرم و نازک عمر کی یہ وہ سماجی اہمیت ہے جو اس لڑکی

کو ملتی ہے۔ اس کے باوجود عورتوں کو ایک ممکنہ حل کے بجائے ایک مسئلہ ہی خیال کیا جاتا ہے فلپائن میں ملیا کے نئے اور سخت گیر میئر الفریڈولیم اریتا کے ضلع میں ایک آپریشن کر رہے ہیں جہاں نوجوان لڑکیاں اور عورتیں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے طوائف بن جاتی ہیں۔ ایڈز کے بارے میں خبردار کرنے والے لوگ ان میں ایک مشاورتی سلسلہ قائم کر رہے ہیں--- یوگنڈا کے مردوں نے عورتوں کو ایڈز کے خطرے کے پیش نظر اس طرح چھانٹنا شروع کر دیا کہ وہ شادی شدہ عورتوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ تاہم ان کا اعتقاد تھا کہ ایک شادی والی عورتیں ایڈز کے وائرس سے خالی ہوتی ہیں لیکن وہ بھی نہ رہ سکیں کیونکہ ان کے شوہروں نے ایڈز کے وائرس ان میں منتقل کر دیئے تھے۔ آج کل جو پاگل پن جاری ہے وہ بالکل نوجوان بچیوں کا شکار ہے۔ گیارہ سال سے 16 سال تک کی نوخیز بچیاں---- انہیں بے آبرو کرنے کے لئے زیادہ محنت بھی نہیں کرنا پڑتی۔ ایک ٹافی یا چند شلنگ کافی ہیں۔ محفوظ جنسی تعلقات کے خواہش مند بعض مردوں نے تین سال کی کم سن بچیوں کو بھی غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنایا ہے"۔ 6

سیاست سے بے دخلی اسی طرح سیاست کو "تقدس سے پاک کرنے" کی مہم کے بھی واضح مقاصد ہیں جن میں یہ بات بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے کہ سیاست کسی مذہبی قوت کے تابع نہ ہو۔ مذہب اس پر اپنی اصولی اور قانونی حد بندیاں نہ لگائے تاکہ جب بھی سیاسی تبدیلی لانا ہو تو مذہب کے دائرہ عمل کی حدود کا اطلاق نہ ہو سکے۔ آزادی سے یہ تبدیلی لائی جا سکے۔ روایات اور اقدار کی لاتعلقی سے انسان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ کسی بھی خدا کا پابند نہ رہے وہ سماجی عمل سے ایسے رویوں کو جنم دے جو اس کے اپنے "فطری عمل" کی پیداوار ہوں کسی دین کے عطا کردہ نہ ہوں۔ واضح الفاظ میں اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے خواہ عالم بالا میں وہ موجود ہو یا نہ ہو۔ کسی تقدس کی ضرورت نہیں خواہ یہ تقدس رشتوں کا ہو یا سماجی تعلقات سے متعلق ہو۔ کسی ایسے مقدس رویے کی بھی ضرورت نہیں جو قدروں اور رویوں کو ترتیب دے کر سماج میں تنظیم پیدا کر سکتا ہو۔ جس سے خوف الہٰی کے ذرائع حاصل ہو سکتے ہوں۔ مذہب تو ایک افیون کی حیثیت سے رہ جاتا ہے جس کے کھانے والے مدہوش اور کاہل الوجود افراد کہلاتے ہیں۔ جبکہ اس کے علی الرغم سیکولرازم پر یقین رکھنے والے دور جدید کے معمار ہیں وہ دورجدید سے آگے

کے زمانے کے موجد ہیں انسان کی ذہنی ترقی کے راہنما ہیں جن کے ہتھیار سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں اور کائنات تعقل اور مجرد فلسفہ۔ ان کا پیدا کردہ ادب روشن خیال اور ترقی پسند ہے۔

ان نظریات کو سامنے لانے والوں کو سب سے بڑی کامیابی یہ ملی کہ انہوں نے مذہب کو ایک قدیم طرز فکر قرار دے کر اس کے پیروکاروں کو ایمان محکم سے کافی حد تک محروم کر دیا اور ایسے شکوک پیدا کر دیئے جو سائنس کی زبان سے نکلتے تھے اور سچ لگتے تھے سوال یہ ابھرتا ہے کہ کیا مذہب قصور وار تھا؟ اس کا جواب ہے کہ مذہب کے پیروکار قصوروار تھے جنھوں نے مذہب کو اپنی زندگی پر قسطوں میں نافذ کیا۔ جو حصہ آسان لگا اختیار کر لیا جہاں مشکل ہوئی ترک کر دیا۔ ان کے اعمال میں یقین کی کمی تسلسل عمل سے محرومی اور استقامت کی کمزوریاں شامل ہو گئی تھیں۔ مذاہب کی تعلیمات کتابوں سے باہر نہ نکل سکیں جدید دور کے پیش کردہ مسائل لاینحل نہیں تھے لیکن مذہب کو محض عبادت کا نام دے کر سوچوں پر پہرے بٹھانے والوں نے انہیں اس مقام تک پہنچایا۔ اس صورت حال کے پیش نظر دیکھا جائے تو یہ امور سامنے آتے ہیں۔

1۔ دنیا میں کہیں بھی سچی اسلامی حکومت نہیں ہے دنیا کے باہم اقتصادی طور پر قریب ہو جانے کی وجہ سے سودی معیشت نے کوشش کا مرحلہ بھی نہیں آنے دیا۔ سماجیات اور حکومت سازی کے لئے کسی بھی اسلامی جدوجہد کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ لوگوں کو اور قوموں کو اقتصادی طور پر زندہ رہنے کے راستے بتائے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ موجودہ نظام میں سے کوئی نظام لانے کے بجائے اسے ہٹا کر نیا نظام لانے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ علاوہ ازیں اس حکومت کے قیام کے لئے اس رجحان کا مقابلہ بھی ضروری ٹھہرتا ہے کہ سیاست کو تقدس سے پاک کرنے والی قوتوں کو سیاست سے آؤٹ کیا جائے۔ یہ جدوجہد بھی گہری' دیرپا اور مستقل ہونا لازمی ہے تاکہ اس کا عوام کے وسیع حلقے سے تعلق بن سکے سیکولر حلقے کا کہنا ہے کہ قانونی اختیار صرف اس کو حاصل ہو سکتا ہے جو حقائق کا زیادہ گہرا اور واضح علم رکھتا ہو یہ بات ممکن نہیں ہے کہ جانوروں پر حکمرانی کرنے والے اس بات کو اہمیت دیں۔ کہ ان کا حکمران بھی ایک جانور ہو۔ ان کے حکمرانوں کو عوام سے زیادہ باصلاحیت' زیادہ ذہین اور زیادہ سمجھدار ہونا چاہئے خواہ وہ ایک چرواہے کا بیٹا ہی کیوں نہ

ہو۔

2- سیکولرازم کے سائنسی ہتھیاروں میں جدید ذرائع ابلاغ کو بہت بنیادی مقام حاصل ہے۔ صحافت' ریڈیو ٹی وی' سینما اور دیگر ذرائع ابلاغ و نشریات کے وسیع تر استعمال کے لئے ضروری ہے کہ ایک ماحول ایسا بنایا جائے جہاں اسلامی قدروں کی صرف گونج ہی سنائی نہ دے بلکہ حقیقی طور پر ان کا استعمال بھی ہو اور یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ میدان خالی رہنے سے سیکولر ازم کو موقع ملا رہے گا۔

3- ان قوتوں کا ایک مضبوط ہتھیار بنکاری بھی ہے عالمی طور پر تسلیم شدہ ہر کرنسی سود اور جبر کے نظام کا لازمی حصہ ہے۔ چونکہ عالمی تجارت کو اس بات سے مشروط کر دیا گیا ہے کہ دیگر تمام کرنسیاں اس تسلیم شدہ کرنسی سے تبدیل کی جائیں گی گویا اس طرح تجارت پر بھی سیکولرازم کا کنٹرول موجود ہے۔ مسلم دنیا کی تمام کرنسی اس کے تابع ہے۔ اس کا تعلق ڈالر' پاؤنڈ' مارک اورین سے ہے۔ دفاع' تعمیرات' صنعت و حرفت غرض تمام شعبوں پر یہ حاوی ہیں۔

4- تعلیم کے ذریعے کمال مہارت سے تمام تر سیکولر نظریات نئی نسل کو منتقل کئے جاتے ہیں۔ جب حکومت اپنے نوجوان دماغوں کو کسی دینی پس منظر کے بغیر اور تربیت سے تہی حالت میں اعلیٰ تعلیم کے لئے مغرب کے تعلیمی اداروں میں بھیجتی ہے۔ جو مجبوری بھی ہے تو دراصل وہ نوجوان نسل کو ذبح کر دیتی ہے ان حکومتوں کا تعلق تو آبادیاتی دور سے بھی ہے اور آج سے بھی ہے۔ اس سے مسلم معاشروں میں سیکولر ازم کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس کا متبادل بھی اتنا ہی غلامانہ ہے محض اربوں روپے کے اخراجات سے عمارتوں کی تعمیر سے مقاصد حاصل نہیں ہوں گے کیونکہ ان عمارتوں کے اندر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو یورپ سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں اپنے ناموں کی تختی پر سجائے رکھتے ہیں لیکن دینی علوم سے آگہی نہیں پاتے۔ ان کی تحقیق بھی نہیں ہوتی اگر ہو بھی تو مغرب کے افکار کی روشنی زیادہ پڑتی ہے۔ اس لئے بھی دینی اصولوں کی روشنی میں نئے راستوں کی تلاش مشکل بن جاتی ہے۔

5- ادویات کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ یہ موت کو آخری لمحوں میں بھی شکست دے دیتی ہیں۔ لیکن زندگی اور موت سے وابستہ اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے جو

دین یا مذہب منکشف کرتا ہے۔

6- سائنس جدید دنیا کی روشنی ہے اہل مذہب کی بے رخی نے سیکولرازم کو اس کا سرپرست بنا دیا ہے جس سے اس کی تباہی کے اثرات زیادہ بڑھے ہیں اور انسان مستقل ایٹمی اور کیمیائی جنگ کے خطرے سے دوچار ہے۔

7- فوج سیاسی عمل میں مذہب کے داخلے کے خلاف بھی کام کرتی ہے اور سرحدوں کے تحفظ کا بھی حالانکہ پہلا کام اس کا نہیں ہے۔

سیکولر حلقوں کے خطرات مسلم ممالک میں ہر شعبہ زندگی اور حکومت پر کنٹرول کے باوجود سیکولر حلقوں کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ عوام میں کسی بھی وقت اس سیاسی اور حکومتی اجارہ داری کے خلاف جدوجہد ہو سکتی ہے۔ اس لئے وہ اسلامی تحریکوں کے کردار کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے ان کی شکست اور ناکامیوں کا تذکرہ زیادہ کرتے ہیں تا کہ عوام ان سے مایوس رہے اور ان کی کسی کال پر لبیک نہ کہے۔ علاوہ ازیں عوام کو ایک متحد قوت بننے سے روکنا بھی ان کی ضرورت ہے تا کہ یہ متحد قوت کسی بھی وقت کسی متحد فکر کے حوالے سے سیکولرازم سے بغاوت نہ کر دے۔ اس لئے عوامی قوت کو منتشر رکھنا بھی ضروری ہے۔ مغرب اور امریکہ کی طرف سے بنیاد پرستی کے ہتھیار کا استعمال بھی ایسی ہی کوشش ہے جس سے یہ قوتیں اسلام کے فرقہ واریت کے تناظر میں بٹے ہوئے عوام کو مزید تقسیم کرنا چاہتی ہیں۔ اس اصطلاح کے بارے میں ایک نکتہ نظر یہ بھی ہے کہ ۔

"بنیاد پرستی کا ظہور متضاد نظریات اور ان کے دباؤ سے ہوتا ہے یہ محرکات اور دباؤ کے عناصر ہمارے معاشروں میں مختلف قسم کی تبدیلیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں بنیاد پرستی کی اصطلاح اگرچہ اس صدی کے بہت آغاز میں استعمال کی جانے لگی تھی لیکن اس وقت تک اس کا سیاق و سباق یہ نہیں تھا اس کو مغربی ذرائع ابلاغ نے اس وقت شدت کے ساتھ استعمال کیا جب شاہ ایران کے خلاف مزاحمتی گروپوں کی حیثیت سے اس کے خلاف ایسی تحریکیں اٹھی تھیں جنہیں مذہب کی پرجوش حمایت حاصل تھی تا ہم اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ایرانی تحریک بالاخر ایک بنیاد پرست تحریک میں تبدیل ہو گئی جو اب ایشیا کے دیگر معاشروں پر اثر ڈال رہی ہے۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح اگرچہ مبہم ہے تاہم اسے ان تمام تحریکوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے جن کا مطمع نظر احیائے اسلام ہے یا پھر وہ سیاست

میں اسلام یا مذہب کا عمل دخل چاہتی ہیں---- مذہبی بنیاد پرستی کا ادیان کے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جن کے خلاف اسے استعمال کیا جاتا ہے یہ مکمل طور پر انسان کے اخلاقی اور روحانی رویوں سے الگ تھلگ ہے اس کا انسان کے اخلاقی اور روحانی رویوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو مذہب میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔"[7]

ہم دیکھتے ہیں کہ اس اصطلاح کے بے محابا استعمال نے انتہا پسند رویوں کو جنم دیا ہے جو بہر حال ایک منفی رویہ ہے۔ کسی بھی جماعت' تحریک یا گروہ کو بنیاد پرست قرار دے کر اس کے سارے کاموں پر پانی پھیر دینا بھی درست نہیں ہے جیسا کہ ذیل میں دیئے گئے اقتباس سے ایک ایسے ہی انتہا پسند رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ جس کے مطابق

"وہ (جماعت اسلامی اور دیگر بنیاد پرست" جمہوری عمل میں کہیں پورے نہیں اترتے۔ وہ اصل حالت میں ایک ایسی پہچان رکھتے ہیں جس کے ساتھ جمہوری کلچر میں ان کا داخلہ ممکن نہیں ہے ایک جمہوری ماحول میں انسان کو تمام چیزوں کے حوالے سے دیکھنا پڑتا ہے انسان---- خاص طور پر کثرت رائے سے اور بعض اوقات مشترکہ رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ بنیاد پرست ووٹر سے کیئے گئے وعدے کو پورا نہیں کرتے بلکہ معاشرے کے قوانین پر عمل نہیں کرتے۔ جب کہ منتخب شدہ افراد اپنے حلقہ انتخاب کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ انسان سے ماورا قوت کی پابندیوں کا اطلاق کرتے ہیں اور خود کو اسی قوت کے سامنے جواب دہ تصور کرتے ہیں پھر جمہوریت کیونکر انہیں اپنے فریم میں داخل کر سکتی ہے یا پھر بنیاد پرست کس طرح جمہوری نظام میں شامل ہو سکتے ہیں' ان دونوں میں ملاپ ممکن نہیں ہے۔ بنیاد پرستوں کی طرف سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بہت سے معاشروں میں خود کو انتخابی عمل کے ذریعے عوام کے سامنے پیش کیا ہے مثال کے طور پر پاکستان میں یا ماضی قریب میں الجزائر میں---- ان دونوں صورتوں میں ہم نے جس چیز کا مشاہدہ کیا ہے وہ محض ایک دھوکہ یا دھوکہ نما چیز ہے۔ ہماری موجودہ زندگی میں یہ بنیاد پرست کوئی پہچان نہیں رکھتے اور محض اپنے پوشیدہ مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں ان کا آئینی عمل کے ذریعے منتخب ہونا محض ایک دھوکہ ہے۔"[8]

یہی صاحب مضمون آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"حال ہی میں الجزائر میں سیاسی تبدیلیوں کے بعد تنگ کرنے کی حد تک ایک عمل

سامنے آیا ہے بنیاد پرستوں نے جمہوری عمل اختیار کرتے ہوئے بیلٹ باکس کے ذریعے کامیابی حاصل کی اور یہ مطالبہ کر دیا کہ ایک جمہوری ریاست کا نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ برسر اقتدار آ کر ہر اس شخص کے حلق میں ان اصولوں کو اتار دیں جنہیں وہ عام حالت میں پسند نہیں کرتا۔ درحقیقت یہ بنیاد پرست اقتدار میں آ کر پہلا کام یہ کرتے کہ اختلاف رائے کا گلا گھونٹ دیتے۔ جو کہ جمہوری عمل کے منافی ہے آپ کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہو گا ایک جمہوری ریاست یا ایک بنیاد پرست ریاست۔"

معلوم نہیں جمہوریت کے کس اصول کے تحت اکثریت کی رائے کو قتل کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ الجزائر جمہوری پہلے بھی نہ تھا اور ان انتخابات کے بعد بھی نہ ہو سکا۔ علاوہ ازیں یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بنیاد پرستوں سے عوام خوفزدہ تھے حالانکہ اُن عوام نے تو انہیں زبردست اکثریت دی تھی۔ اگر کچھ لمحوں کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کو سیاسی کردار اور اقتدار دینے والے "بنیاد پرست" جمہوری عمل میں بھی پورے نہیں اترتے تو یہ بات کون سمجھائے گا کہ جو لوگ ترقی پسند اور بنیاد پرستی کے دشمن کہلاتے ہیں وہ عوام کی رائے کو کیا اہمیت دیتے ہیں اگر عوام کا حق یہ کہہ کے قوت کے ذریعے مسترد کر دیا جائے کہ انہوں نے ایک ایسی جماعت کو ووٹ دیئے ہیں جو اسلام کو بطور نظام نافذ کرنے کی خواہش کی وجہ سے جمہوری نہیں ہے اور ہر قانون بدل دے گی آخر وہ کون سا جمہوری حق ہے جو ارباب اختیار کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جو چاہتے ہیں کر گزریں ان کے عمل سے عوام کے جمہوری حقوق سلب نہیں ہوں گے۔ اس لئے تو یہ جو از ابھرتا ہے کہ الجزائر مغرب کی اسلام دشمنی کا شکار تھا جناب ہمایوں اختر نے مغرب کے اسلام کے بارے میں رویوں کا ایک جائزہ اس طرح لیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"1989 کے وسط میں ایک تحقیقی سروے کیا گیا جس میں فرانس کے شہریوں سے دریافت کیا گیا کہ دیئے گئے ممالک میں سے سب سے زیادہ خطرہ آپ کو کس ملک سے ہے؟ جواب میں کہا گیا کہ 25 فیصدی تعداد کو ایران سے' 21 فیصدی کو سوویت یونین سے اور 4 فیصدی کو خطرہ عربوں سے ہے---- لندن کے سنڈے ٹائمز نے مغرب اور سوویت یونین سے کہا ہے کہ وہ مراکش سے لے کر چین تک اسلامی بیداری کے سب سے بڑے خطرے کے مقابلے کی تیاری کریں جو بنیاد پرستی کے سایے میں چلا آ رہا ہے۔ ولیم لنڈ نے تجویز کیا

ہے کہ روس کو اسلامی احیاء کے شدید خطرے کے پیش نظر مغرب کے اہم حصہ کے طور پر خصوصی کردار ادا کرنا چاہئے۔ سوویت یونین مغرب کے دائیں جانب اہم مقام رکھتا ہے۔ جو بحیرہ اسود سے ولاڈی واسٹوک تک پھیلا ہوا ہے۔ والٹر میک ڈوگال مشہور مورخ ہیں ان کا کہنا ہے کہ روس عیسائیت کی سرحدوں کا محافظ ہے۔ اور ان کا دشمن مشترکہ ہے روس کو مذہبی بنیادوں پر ایک مکمل ایٹمی جرا ثیمی اور کیمیائی جنگ میں تباہی کا خطرہ موجود ہے۔ جو وسط ایشیا سے متوقع ہے۔ ایرانیوں اور عراقیوں نے پہلے ہی خود کو اس کا اہل ثابت کردیا ہے اب مایوس اور پریشان روسیوں کو بھی یہی صورت درپیش ہے اس سے زیادہ اسرائیل / فلسطین کے تجارتی قافلوں کے راستوں کو وسطی ایشیا میں ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے"۔

جناب ہمایوں اختر نے اس متشددانہ مغربی رویے کے تعارف کے بعد جس حقیقت کا اظہار کیا وہ آج مسلم دنیا کی سب سے تلخ حقیقت ہے وہ لکھتے ہیں۔

"اس مسئلے کا سب سے مرکزی نکتہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کی مسلسل یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے تعلق توڑنے پر مجبور کر دیا جائے تاکہ وہ قرآن سے دور ہی رہیں۔

"نام نہاد مسلمانوں کو قرآن سمجھنے کی اجازت نہ دو اور نہ ہی انہیں قرآن پر عمل کرنے کی اجازت دو انہیں جدیدیت کو اختیار کرنا ہے انہیں مغربی تہذیب کو تسلیم کرنا ہے اور انہیں مغربی معاشروں کے ساتھ جڑنا ہے"۔

اسلام کا المیہ یہ ہے کہ اسے مکمل طور پر سمجھا ہی نہیں گیا اور نہ ہی اس کی صحیح ترجمانی کی گئی ہے اس رویے کا سب سے زیادہ خود مسلمانوں نے ہی اظہار کیا ہے کیا ہم سچے مسلمان ہیں؟ ایک نام نہاد مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے سکول کے داخلہ فارم میں دین کے خانے میں لفظ "اسلام" لکھتے ہیں اور ایسا ہی ملازمت کی درخواست پر لکھتے ہیں"۔

9۔

اسلام کسی کا دشمن نہیں ہے۔ مغرب کے خدشات کا کوئی جواز نہیں ہے اسلام اس کے لئے مستقبل کا خطرہ نہیں ہے۔ مغرب کو اس بات پر غور کرنا ہو گا کہ اس کے معاشروں میں خاندان اور سماج کی شکست وریخت جاری رہی تو مغربی دنیا جلد یا بہ دیر ایک

ایسے نظام کی تلاش میں ضرور نکلے گی جو زندگی کو اخلاقی بے راہ روی کے عذاب سے بچا سکے جس نے اب ایڈز کی شکل اختیار کی ہے کل کوئی اور شکل اختیار کر سکتا ہے- سیاسی غلبے کے لئے معاشی اجارہ داری وہ نتائج نہیں لا سکی جس کا مغرب کو انتظار ہے- اخلاقی اور مذہبی قدروں کی پامالی اجارہ داریوں کو وسیع کر دے گی- مغرب کو اسلام کے بارے میں دشمنی پر مبنی طرز فکر اختیار کرنے کے بجائے ان عوامل پر غور کرنا ہو گا جو اس کی کمزوری کو نظام کی تباہی سے مربوط کر رہے ہیں- انسان کی بحیثیت انسان پہچان اس مسئلے کا اولین حل ہے- جو یقیناً ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں نہیں ہے- اس بنیادی آغاز سے ہی مغرب اپنے سماجی اور اخلاقی بحرانوں کو ختم کر سکتا ہے اسلام سے آگہی اہل مغرب کے لئے بھی ضروری ہے اور اہل اسلام کے لئے بھی--- کیونکہ دور حاضر کے پر فتن بحرانوں کا حل صرف اسی نظام زندگی میں ہے-

1- "ECHO OF ISLAM" - TEHRAN, JANUAVRY 1993

2- "How the Ottoman Empire was Mortgaged"
الطاف گوہر The Nation - 10 September, 1993

3- ایضاً

4- "Phantom of Fundamentalism"
ڈاکٹر افضل اقبال The Muslim - 15 March 1992

5- Time, June 21, 1993

6- Time, August 3, 1992

7- احمد علی کا مضمون The News - 3 April 1992

8- "Fundamentalims or Democracy"
اے بی ایس جعفری The Muslim - 21 January 1991

9- ہمایوں اختر "Revulsion of Muslims Against Themselves"

۸

اسلام اہل مغرب کی نظر میں

- اسلام اہل مغرب کی نظر میں
- احیائے اسلام کی تحریکیں
- مغرب کے خود ساختہ دلائل
- اسلامی ریاست کا خواب
- اسلام کے بارے میں متعصب مشاہدات
- تصادم سے تصادم تک

اسلام اہل مغرب کی نظر میں

اہل مغرب نے اسلام کا بطور دین مطالعہ کرتے ہوئے مختلف رجحانات کا اظہار کیا ہے۔ اولین دور میں قرآن حکیم کے لاطینی زبان میں تراجم کا ایک بڑا مقصد یہ ہوا کرتا تھا کہ اسلام کو عیسائیت کے مقابلے میں کم تر مذہب کے طور پر پیش کیا جائے اور مسیحی تعلیمات کو سند بنایا جائے۔ اس مقصد کے زیر اثر قرآن حکیم کے لاطینی زبان میں تراجم پادریوں نے کئے۔ 1649ء میں قرآن پاک کا ایک ایسا ترجمہ بھی انگریزی میں شائع ہوا جس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا کہ یہ ترجمہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو القرآن کے مطالعے کے نتیجے میں ہونے والے خطرات سے آگاہ کیا جا سکے۔ اہل مغرب نے اسلام، پیغمبر اسلام آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی مختلف انداز سے من مانی تصویر پیش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی ہو یا منٹگمری واٹ ہو قدیم مستشرق ہو یا جدید، کسی نے بھی اسلام کو اس نظر سے نہیں دیکھا کہ اس کے اصل پیغام کو سمجھا جائے بلکہ مختلف مذہبی تعصبات کے زیر اثر انہوں نے اس کا مطالعہ کیا جس کی وجہ سے وہ اصل پیغام بھی نہ پا سکے اور مغرب میں اسلام کی مسخ تصویر پیش کرنے کے ذمہ دار بھی ٹھہرے۔

بعد ازاں ایک اور رویہ مغربی اداروں میں یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ انہوں نے ادیان کے تقابلی مطالعہ کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو غلط انداز میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے قدیم ترین نظریات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو منطبق کرنے کی کوششیں کیں اور یوں اسلام کو ایک قدیم ترین مذہب قرار دے کر عصر حاضر سے بعید قرار دے دیا۔ اسلام کے تصور توحید کو مسخ کرنے کے لیے تثلیث کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا بھی اسی محرک کی وجہ سے تھا۔ ان رویوں کو علمی تحقیق کے نام سے سامنے لایا گیا حالانکہ یہ مغربی محققین کی ذاتی اور انفرادی کوشش تھی جسے سند بنا کر پورے مسیحی نظام کی نمائندہ تحقیق قرار دے دیا جاتا۔

اسلام اور اسلامی علوم سے ان مغربی محققین کی دلچسپی کے نتیجے میں بہت سی تاریخی باتیں بھی سامنے آتی رہیں اور ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن کا بظاہر مقصد قرآن کی تعلیم کو پھیلانا تھا تاہم ان میں عام طور پر دینی احساس کی کمی کا اظہار موجود رہتا تھا۔ یہ لوگ اسلام

کو مسیحی اصولوں کے مطابق دیکھتے تھے اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم' صحابہ کرامؓ اور تاریخی مسلم شخصیات کو خالصتاً" مغربی ثقافت کے جدید رویوں کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کرتے۔(اس کے بعد ایسے افراد بھی سامنے آئے جنہوں نے تحقیق کے اس انداز کو مسترد کردیا وہ دیگر ادیان کا مطالعہ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ ان کے درست یا غلط ہونے پر فیصلہ دیں بلکہ وہ انہیں سمجھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دینی شخصیات کو اسی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی جس نگاہ سے ان کے پیروکار دیکھتے تھے۔ لیکن ایک پہلو ان کے اندر پھر بھی ایسا رہا جو انہیں اسلام کی بالکل درست تفہیم سے دور رکھنے کا سبب بن گیا وہ اسلام اور اس کی شخصیات کے ہمدرد بن کے سامنے آتے تھے اور اپنے انداز سے ان شخصیات پر مغرب کے دانشوروں کے حملوں کا ہی جواب دیتے۔ان محققین نے زیادہ تر کام صوفیائے اسلام پر کیا اور اسلام میں تصوف کے تصور کو گہرا کرنے میں جو کردار ادا کیا اس سے بھی اسلامی تعلیمات کے براہ راست ابلاغ کی راہیں بند ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ مسیحی سکالرز کا مسئلہ یہ تھا کہ(وہ انجیل کو ایک انسان کی تخلیق کے طور پر لیتے ہیں اور اس میں بہتری کی کوشش کرتے رہتے ہیں انہوں نے قرآن پاک کو الہامی کتاب سمجھنے کے بجائے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دے لیا اور یوں اپنی توجیہات کے لیے راستہ کھول لیا۔ یہ رویہ اب تک برقرار ہے۔ اب بھی اسلام اور قرآن کو غلط رنگ میں پیش کرنے' اسے ایک مستقل خطرہ قرار دینے اور انسانی ترقی کے مخالف رویے کے طور پر پیش کرنے کا وطیرہ عام ہے۔)

احیائے اسلام کی تحریکیں اسلام کے احیاء کی تحریکوں نے عرب ممالک میں پچھلے بیس سے چالیس سالوں میں زیادہ اثرات مرتب کئے ہیں۔ عرب ممالک کی مخصوص جغرافیائی اہمیت اور تیل کی دولت کی وجہ سے اہل مغرب کو خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس خطہ سے احیائے اسلام کی تحریک اٹھی تو اسے روکنا ممکن نہیں رہے گا۔ عرب کو اسلام کے آغاز سے گہری وابستگی ہے اس لیے یہاں سے اسلامی احیاء کی تحریکوں کا ابھرنا قرین قیاس ہے۔ 1982-83 میں لبنان میں غیر ملکی مداخلت' امریکی اور اسرئیلی سازشوں کے جواب میں فدائیوں کے حملے بھی اہل مغرب کے لیے سخت پریشانی کا سبب رہے ہیں۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کرنے کی پاداش میں صدر سادات کا قتل بھی انہیں ایک علامت نظر آتا ہے۔ مراکش' الجزائر'

تیونس، مصر اور شام میں دین سے لوگوں کی وابستگی میں اضافہ بھی انہیں پریشان کرتا ہے۔ اخوان المسلمین کی طرف سے مصر کی پارلیمنٹ میں مختلف طریقوں سے داخل ہونے کی جدوجہد کو ایک جمہوری حق کے بجائے ایک بنیاد پرستانہ جدوجہد سے تعبیر کرنا بھی وہ امتیازی سلوک ہے جو مغرب نے روا رکھا ہے۔ اردن میں اخوان کی کامیابیاں مشرق وسطیٰ کے مستقبل کے نقشے میں رکاوٹ قرار دی جاتی ہیں۔ مغرب خوب سمجھتا ہے کہ عرب دنیا کے اقتصادی وسائل اور ان کی جغرافیائی پوزیشن سے اس کے مفادات وابستہ ہیں۔ اس لیے اسکے ادارے، دانشور، تنظیمیں اور حکومتیں اس خطے کو خصوصی توجہ کا مرکز بنائے رکھتی ہیں۔ عرب دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ لینے کے لیے سیمینارز منعقد کئے جاتے ہیں۔ تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں اور علمی اداروں میں وسائل کا ایک اہم حصہ تحقیق پر صرف کیا جاتا ہے۔ اس سارے منصوبے میں مسلمانوں کے نقطہ نظر سے منفی پہلو یہ ہے کہ ان تحقیقات اور منصوبوں کا مقصد مسلمانوں کے وسائل پر قبضہ کرنا، انہیں سیاسی اور سفارتی طور پر اپنا محتاج بنانا اور ان کے آزادانہ رول کو ختم کرنا ہے۔ دوسرا بڑا مقصد اسلامی تحریکوں کو دبانا، انہیں بدنام کرنا اور ان کے بارے میں غلط معلومات فراہم کر کے عام مسلمانوں کو ان سے دور رکھنا ہے۔ اسی لیے اسلامی بنیاد پرستی کے نعرے کو پوری شدت سے لگایا جاتا ہے۔ مینفرڈ ہیرن کا کہنا ہے کہ اسلامی تحریکیں دراصل فاشسٹ تحریکیں ہیں جن کا ماضی پسماندہ اور سماجی و نفسیاتی الجھنوں سے عبارت ہے۔ یہ تحریکیں جذبات میں اشتعال پیدا کرتی اور مسلمانوں کو ہنگامہ پرور بناتی ہیں۔ وہ مادی ترقی اس لیے کرنا چاہتی ہیں تاکہ اس کے ذریعے وہ سیاسی توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل کر سکیں۔ وہ ایک شاندار ماضی کی امین ہونے کی دعوے دار ہیں لیکن اپنے بارے میں صحت مندانہ تجزیوں کی نفی کرتی اور ان کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔"[1]

اس قسم کے مغربی دانشوروں کے خیال میں اسلامی تحریکیں ہر چیز پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔ نظام بدلنا چاہتی ہیں اور مغربی مفادات کے خلاف لوگوں کو سرگرم رکھتی ہیں۔ ان کے خیال میں ان تحریکوں نے کبھی بھی اپنے متعلقہ معاشروں میں موجود نظریاتی رجحانات کا بامقصد مطالعہ نہیں کیا اور محض اعتقادات کی بنیاد پر کام کرتی ہیں۔

ہم اس موقع پر اس بات کی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے کہ اخوان المسلمون کا اٹلی

کے فاشسٹوں سے کوئی بھی میل نہیں ہے اس لیے کہ ایک لغو الزام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اسلامی تحریکوں کے سربراہ کلیتی اختیارات کے حامل ہوتے ہیں۔ مغربی دانشوروں کو بخوبی علم ہے کہ یہ تحریکیں مشاورت کے اصول پر بہت سختی سے عمل کرتی ہیں۔ اس کی مثال پاکستان میں جماعت اسلامی کی دی جا سکتی ہے۔ جس نے 1993ء کے عام انتخابات میں شکست کھانے کے بعد اس امر پر بہت تفصیل سے غور کیا کہ مشاورت کے اصولوں کی کہاں خلاف ورزی ہوئی۔ اس کے امیر نے الزامات کا سامنا کیا اور امارت سے استعفیٰ دے کر اپنی جماعت کے ارکان کو موقع دیا کہ وہ نیا امیر چن لیں۔ جب حالات کی گرد بیٹھی تو پتہ چلا کہ مشاورت میں کہیں کوتاہی نہیں ہوئی اسی لیے ارکان نے اسی امیر کو دوبارہ امیر منتخب کیا۔

ان تحریکوں پر یہ الزام بھی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کی طرف لوگوں کو لے جانا چاہتی ہیں حالانکہ ان کا موقف ہے کہ اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں وہ ہر دور میں کام آتی ہیں اور راہنمائی کا مکمل حق ادا کرتی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان راہنما تعلیمات کو عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لیے سمجھا جائے اس طرح ان تحریکوں نے اسلام کے زندہ پہلوؤں کو، جو ہر دور میں زندہ اور جاوید رہے ہیں۔ دنیا کے سامنے لانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ وہ اسلام کو ایک زندہ نظریے کے طور پر پیش کرتے ہوئے اس بات کی نفی کرتی ہیں کہ نظریے کی موت واقع ہو چکی ہے جب تک خیر اور شر موجود ہیں نظریہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ مغربی فکر کے ردعمل کے طور پر اور اشتراکی نظریے سے متاثر مسلم مفکرین کی ایک ایسی جماعت بھی وجود میں آئی جس نے 1960 کے عشرے سے اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کیا اور کہا کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اسلامی سوشلزم بہتر متبادل بن سکتا ہے۔ لیکن تجربات سے یہی ثابت ہوا کہ اسلام میں کسی قسم کی آمیزش سے سارا نظریہ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ اسلام رہتا ہی نہیں جس طرح پھول کو کتاب میں بند کرنے سے نہ صرف وہ مرجھا جاتا ہے۔ بلکہ محض یاد ماضی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام ایک ایسا دین ہے جو آمیزش اور ملاوٹ سے اپنے اثرات مرتب نہیں کرتا۔ اہل مغرب اسلام کو کبھی نازی ازم سے تشبیہ دیتے ہیں تو کبھی فاشزم سے اس کا ناطہ جوڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام جدید دور کے مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا۔ دنیا

میں تکنیکی اور سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آزادی اور سلامتی کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ مخالف حکومتوں کے درمیان پر امن بقائے باہمی کی بنیاد پر معاملات کو نہیں چلا سکتا۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے دہشت گردی' جذبات کی برانگیختی اور انتہا پسندی کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ ریاستی مشینری کو صرف اور صرف رعایا کو قبولیت کی راہیں دکھانے اور حکم ماننے کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ اسلامی تحریکیں قوت کے حصول پر توجہ دیتی ہیں اور ساری صلاحیتوں کو اس کام کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس قدر منظم ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے ارکان کو تربیت دیتی ہیں اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کو کنٹرول کرتی ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار الزامات مغرب میں ہر اس دانشور کی نوک زبان پر اور مشرق میں ہر لکھنے والے کے نوک قلم پر ملتے ہیں جو اسلام کا صحیح مطالعہ اور ادراک نہیں رکھتا' جو اپنے نظریے' مذہب یا طریقہ زندگی کے کسی ایک پہلو' مجموعی کردار کو اسلام کے بھرپور کردار سے کمتر محسوس کرتے ہوئے احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔

مغرب کے خود ساختہ دلائل ان الزامات کو ثابت کرنے کے لیے مغرب کے پاس حوالے کے طور پر جو مثالیں ہیں ان سے اسلام بطور نظریہ' اسلام بطور سیاسی نظام یا اسلام بطور سماجی فلسفہ کسی بھی طرح سے اسلام کی نمائندگی نہیں ہوتی۔ ان تمام الزامات کے پس منظر میں تیل کی دولت گھومتی ہے وہ دولت جو عرب دنیا کی اصل قوت سمجھ لی گئی۔ حالانکہ یہ دولت عالم اسلام کی حالت کی بہتری کے لیے استعمال نہیں کی گئی۔ مغرب کو یہ اعتراض ہے کہ عربوں کی یہ دولت اسلامی تحریکوں کو مضبوط کرنے پر صرف ہوئی ہے۔ عربوں نے اسلامی تحریکوں کو مضبوط کرنے کے لیے یہ دولت درخت کے پتوں کی طرح تقسیم کی ہے۔ لیکن مغرب نے کبھی یہ تصور بھی نہیں کیا کہ عرب دنیا کے چند دردمند مخیر حضرات نے عالم اسلام میں اپنے دین کے ماننے والوں کو انتہائی نامساعد حالات میں سہارا دیا ہے تو یہ ان کا دینی فرض تھا لیکن اس مدد کی مقدار ہرگز ایسی نہیں ہے جسے مغرب نواز حکومتوں کو گرانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا بلکہ یہ مقصد کبھی بھی نہیں رہا۔ اہل مغرب نے خود کہا کہ اوپیک کے ممالک کی دولت کے خاتمے کے ساتھ اسلامی تحریکیں بھی زوال کا شکار ہو جائیں گی اسلامی بیداری کی لہر اسی وقت تک ہے جب تک تیل کی دولت سے اسلامی تحریکوں کو

سپورٹ ملتی رہے گی۔ مغرب کی طرف سے اس نظریے سے وابستگی کا اظہار 1980 کے عشرے تک شدت سے ہوتا رہا۔

1990 میں تیل کی پیداوار میں مزید اضافہ ہوا اور عربوں کو مزید دولت ملی لیکن عربوں کی دولت کے ساتھ ساتھ اسلامی تحریکوں کے عوامی اثرات میں اضافے کی جو شرط خود اہل مغرب نے عائد کر رکھی تھی اس کا کیا بنا؟ کیا اسلامی تحریکیں بھی اس تیزی سے مضبوط ہوئیں جس تیزی سے تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوا؟ خلیج کی جنگ نے ان تمام نظریات کو غلط ثابت کر دیا۔ جنگ سے قبل تیل کی قیمت فی بیرل چالیس ڈالر تک پہنچ گئی۔ مغرب کو علم بھی تھا تو اس نے اس حقیقت کو مخصوص مفادات کے لیے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ تیل کی دولت کبھی بھی اسلامی تحریکوں کے قائدین کی جیب میں نہیں گئی اور یہ کہ خلیج کی جنگ کے بعد تیل کی قیمت میں زبردست کمی نے ان تحریکوں کے زوال کی راہیں ہرگز ہموار نہیں کیں۔ بلکہ خلیجی جنگ کے بعد الجزائر میں ہونے والے عام انتخابات میں اسلامی سالویشن فرنٹ کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ بے سروسامانی کی حالت میں ان تحریکوں میں زیادہ قوت پیدا ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست کا خواب مغرب نے کبھی اس حوالے سے شاید غور کیا ہو کہ اسلامی ریاست کا قیام ہر مسلمان کا مقصد رہا ہے۔ اسلامی تحریکوں کو ہی اس کا مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے اسلام کے ایک بنیادی تقاضے کو ایک منظم انداز سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

"---- اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سربلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لیے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔ خود پاکستان کے قیام کی جدوجہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کی ایسی ریاست ہونی چاہیے جہاں وہ اپنے عقائد و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزار

سکیں۔"2

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے ذمے کیا مقاصد ہیں؟

(1) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(2) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح راہنمائی دی ہے۔

(3) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے۔

(4) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے خواہ خواہش نفس کی اندرونی دہشت کی بناء پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بنا پر ہو۔

(5) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور ان کے نتیجے میں "چنگیزیت" رونما ہوتی ہے اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصے پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے۔"3

اسلام کے بارے میں متعصب مشاہدات دراصل معاملہ یہ ہے کہ مغرب نے اسلام میں چند گروہوں کے متعدد رویوں کے حوالے سے اسلام کو دیکھا ہے اس نے اسلامی تحریکوں کو سمجھنے، مسلم مفکرین اور فلاسفہ کے خیالات سے مثبت طور پر استفادہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ عرب دنیا میں اسلامی بیداری کی وجہ یہ تھی کہ عرب حکمرانوں نے اپنی مسلم رعایا کی سیاسی سوچ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کئے رکھیں اور ان کے سیاسی

کردار کو تقریباً ختم کر کے رکھ دیا۔ عرب دنیا میں حکمرانوں کے خلاف ردعمل دراصل سیاسی کردار پر بے جا پابندیوں نے پیدا کیا تھا۔ عربوں میں قوم پرستی عروج پر تھی۔ جس نے سیاسی سوچ کو بھی قوم پرستی کے خول میں بند رکھنے کی غلطی کی۔ خلیجی جنگ نے قوم پرستی کے بت کو توڑ دیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت سے مثبت رویوں اور رجحانات کا بھی جنازہ نکال دیا۔ اگر سیاسی آزادیاں میسر رہتیں تو عرب کے حکمرانوں کو اپنے عوام کو تنگ دائروں میں محدود رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ عرب کے قوم پرست حکمرانوں نے مغرب کے آئین و قانون کو' اصول معاشرت اور طریقہ تجارت کو ہو بہو قبول کر لیا۔ اسلامی تحریکوں نے اس پر احتجاج کیا جسے مغرب نے دشمنی قرار دے کر اسلامی تحریکوں کی بیخ کنی میں ان قوم پرست حکمرانوں کا نہ صرف ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا بلکہ مسلم رعایا کو اسلامی تحریکوں سے بدظن اور برگشتہ کرنے کے لیے میڈیا کے جملہ ذرائع اس جنگ میں جھونک دیئے۔ اور اسلامی تحریکوں کو بنیاد پرستی کے طعنے دے کر دقیا نوسیت کے ایسے خول میں بند کرنا چاہا جو کمزور بھی تھا اور غیر مناسب بھی۔ نہ تو یہ اسلامی تحریکوں کی پہچان تھی اور نہ ہی ان کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب ہتھیار۔

مغرب کے اس رویے کو سمجھنے کے لئے اس کے ماضی کو سامنے رکھنا ہو گا۔ مغرب اس بات سے صریح انکار کرتا ہے کہ اس کی تہذیب کو علوم و فنون سے آشنا کرنے میں اسلام نے کوئی بھی کردار ادا کیا ہے۔ اس کے مفکرین کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب نے اسلام سے نہیں بلکہ بابل و نینوا' مصر' روم و یونان ایسی تہذیبوں سے کسب فیض کیا ہے۔ مسلم دانشوروں کا یہ اعتراض بہت بجا ہے کہ ان تہذیبوں کے درمیانی فاصلے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے دیر پا اثرات کا رہنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ کہ دنیا کی کسی بھی تہذیب میں اس قدر تسلسل نہیں ملتا جس سطح کا اور جس قدر گہرا تسلسل اسلامی تہذیب پیش کرتی ہے جس میں مسلسل ارتقاء اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی زبردست صلاحیت بھی ہے۔ اس لئے مغربی مفکرین کا یہ کہنا سفید جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں نے یورپ پر کوئی علمی اثرات مرتب نہیں کئے یا یہ کہ مسلمانوں کے کام میں کوئی اصلی یا جوہری خوبی نہیں تھی۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے علم ریاضیات کو جدید شکل دی اور تجزیاتی جیومیٹری کی بنیاد رکھی۔ میکانیات کی دریافت اور ان کو ترقی دینے کا کام بھی مسلمانوں

کے ہاتھوں ہی پایہء تکمیل پہنچا جس کے بعد ہی یورپ نے مزید ترقی کی راہیں کھولیں تھیں۔ بعض اہم یورپی سائنس دانوں کی دریافتیں بھی دراصل مسلمانوں کی دریافت شدہ تھیں۔ جنہیں ان سائنس دانوں نے محض اخذ کیا اور اپنے ٹریڈ مارک کے ذریعے انہیں محفوظ کر لیا۔

تصادم سے تصادم تک دراصل ہونا تو یہ چاہئے کہ مغربی تہذیب اپنے اندر موجود تضادات کو خود محسوس کرے اس کے دانشوروں کو اس بات کی تحقیق کرنا ہو گی کہ کیا دوسری تہذیبوں کو بالعموم اور اسلام کو بالخصوص نشانہ بنا کہ مغربی تہذیب کی کوئی خدمت کی جا سکتی ہے۔ یورپ کی ترقی اور مغربی تہذیب کے حوالے سے روشن خیالی کی مثالیں پیش کرنے والوں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ موجودہ ترقی مغربی تہذیب ؟ ک رہون منت نہیں ہے بلکہ یہ وہ مادی ترقی ہے جس کا آغاز کرتے ہوئے یورپ و امریکہ نے مغربی تہذیب کو نہیں دیکھا تھا بلکہ ایک ایسے ساج کا تصور کیا تھا جو خوشحال ہو جس کے باشندوں کو تمام سہولیات زندگی میسر ہوں۔ مغرب نے وہ منزل حاصل کر لی لیکن وہی مغرب یہ بات بھی کہتا ہے کہ زندگی کی اس مادی تعبیر نے اس ۔ ہذیب کا چہرہ داغ دار کر کے رکھ دیا ہے۔ انسان کو اس کے ساج سے الگ کر کے' اس کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتے ہوئے اس کی روحانی ضروریات کا قتل کیا گیا ہے اور یہ کوئی اچھی خدمت نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مخالف تہذیبوں کو بنظر حقارت دیکھنے اور دھتکارنے کے بجائے ان میں باہمی رابطے پیدا کئے جائیں۔ مفاہمت کی بنیادیں تلاش کی جائیں۔ مذاہب کے احترام کی روایت کو اختیار کر کے محض اس لئے ایک دوسرے کو نیچا دکھانا مناسب نہیں ہے کہ اس طرح کوئی تہذیب یا نظام اپنی خامیوں کی پردہ پوشی کر سکتی ہے۔ خود کو علم و فن کی بلندیوں پر فائز دیکھنے کا خواہش مند مغرب یہ کیونکر سوچتا ہے کہ اہل مغرب کو اسلام کی خود ساختہ خامیوں، مسلمانوں کی کمزوریوں اور ان کے ساتھ حالات کی ستم ظریفی کو بڑھاچڑھا کو پیش کرنے سے خود مغرب کی کمزوریوں کو پوشیدہ رکھا جا سکتا ہے۔ (مسلمانوں نے خود کو برتر سمجھ کر اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا احتساب نہیں کیا اور اسلامی تہذیب کے نااہل علمبردار بن بیٹھے اگر مغرب بھی اس روش پر عمل کرے گا تو مستقبل کسی اور تہذیب کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور اہل مغرب بھی مسلمانوں کی طرح بے مائیگی کا اور تنہائی کا شکار ہوتے چلے

جائیں گے۔ ابھی تک تو اقتصادی غلبے اور سائنس و ٹیکنالوجی میں برتری نے ان کے معاشروں کے بہت سے پہلوؤں کو چھپا رکھا ہے جب سرمایہ دارانہ مسابقت اور مارکیٹ اکانومی کے بے رحم فیصلوں کا ان پر اثر پڑے گا تو انہیں اپنے سماج' خاندان' حتیٰ کہ فرد کو بھی بکھرنے سے بچانا شاید ممکن نہ رہے۔ (

1- مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے

"The Politics of Social Change in

Middle East and North Africa"

Manfred Halpern - Pages 135,6

Princeton University Press, 1963

2- "اسلامی نظریہ حیات" پروفیسر خورشید احمد صفحہ 472

3- ایضاً صفحہ 474

۹

مغربی تہذیب کے مادی رویے

انسان نے سائنس کی ترقی کے مراحل کو خالق کائنات کی وحدانیت سے متصادم ٹھہرا کر جس بنیادی غلطی کا ارتکاب کیا تھا وہ مغرب اور اس کی تہذیب کی بنیاد بنتی چلی گئی۔ سائنس کی ترقی انسان کا کارنامہ ضرور تھا لیکن اسے مقام انسانیت کے ادراک سے محروم کرنے کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے تھا۔ کائنات میں موجود حقائق کی تلاش اور چھان بین ایک ایسا مشن تھا اور ہے جسے انسان قیامت تک سرانجام دیتا رہے گا۔ اس مشن کے دوران میں حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پر خالق کائنات کی وحدانیت کو ہی سوالیہ نشان ٹھہرانے کی بنیادی غلطی سے سب سے بڑا نقصان تو یہی ہوا کہ جس نے کائناٹ کو اس کے ہمہ وصف ہونے کے ساتھ انسان کے سامنے مسخر ہونے پر آمادہ رکھا انسان نے اسی برتر قوت کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اسلام نے قرآن کے ذریعے انسان کو حکم دیا کہ

فا نتشروا فی الا رض-----

دوسری طرف مغربی تہذیب کا حکم متضاد تھا اس نے رب کائنات کو چرچ کی تنگ دیواروں کے پیچھے قید کرنے کا حکم سنا دیا۔ اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان یہ بنیادی اختلاف سوچ اور فکر کا اختلاف تھا۔ مغرب اور اس کی تہذیب طبیعیات سے ماوراء حقائق کو پانے کے لیے تیار نہ تھی وہ ٹھوس اور مجرد حقائق کی قائل تھی جبکہ اسلام کا دامن وسیع تھا اور وہ چاہتا ہے کہ ٹھوس حقائق' مجرد دنیا اور نظر آنے والے مظاہر کے اندر پوشیدہ اصل قوتوں کے سرچشمے کو بھی محسوس کیا جائے۔ انسان جیسے خود کو ایک حقیقت قرار دیتا ہے۔ وہ رب اور الٰہ کی حقیقت کا بھی ادراک کرے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے

کہ اسلام کا انسان سے مطالبہ ہمہ جہتی تھا وہ ان دیکھے الہ کی اطاعت اور بندگی سے پہلے اس کے تصور کی قوت سے دور وجود کو تسلیم کرانا چاہتا ہے تاکہ ماننے والے کو یہ ان دیکھا وجود خلوت کی راہداریوں میں بھی محسوس ہو سکے اور وہ اس کے احکام کو وہاں بھی بجا لائے جبکہ جلوت میں بھی اس کو ہر دم سامنے رکھے اور اجتماعیت کی تشکیل کرتے ہوئے بھی اس کی سنت معلوم کرتا رہے اور اس پر عمل بھی کرے۔ مغربی تہذیب نے تین میں ایک اور ایک میں تین کے تصور تثلیث کو تسلیم کرنے کے بعد' جو بجائے خود ایک سوال تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ اس بات کا عملی اظہار کر دیا کہ وہ اسے زندگی کی ہر دوڑ سے خارج کر کے بہت تیز بھاگنا چاہتی ہے۔ مغربی تہذیب کے افلاطون اور ارسطوؤں کو خالق ایک غیر واضح شبیہ کے طور پر نظر آتا تھا جو وقار اور یکجہتی سے محروم خداوند تھا جسے دنیائے انسانی پر حاوی ہوئے عرصہ ہی تو بیت گیا تھا۔ مغرب نے سماجی' سیاسی اور صنعتی رویوں سے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ اب اس روش کو بدل دے گا اور وقار اور یکجہتی سے محروم خدا کا عملی طور پر انکار کر دے گا۔ لیکن زبانی طور پر اسے زندہ رکھے گا تاکہ گرجا گھر جانے کا جواز موجود رہے اور ضرورت پڑنے پر متنازعہ فیہ مسائل کا شکار' لسانی' نسلی' علاقائی تعصبات کے زیر اثر اقوام کو ایک مرشد کے قریب لانے کے لیے مذہبی عصبیت کو برقرار رکھ سکے جو انہیں متحد کر سکتی ہے۔

مغربی تہذیب کی نمایاں صفات میں قوم پرستی' سیکولرازم' مجرد سچائی' جمہوری عملی اور میکانکی کارکردگی کو گہرا عمل دخل حاصل ہے۔ مغرب نے ان امور کو' جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے' طبیعی مظاہر کے حوالے سے حاصل کیا ہے اس نے ایک نظر آنے والی دنیا کو نظر آنے والے حقائق کے حوالے سے اور نظر میں رہنے والے مستقبل کے لیے تراشا ہے اس لیے اس کی ساری جدوجہد میں مادیت کا عنصر نہ صرف یہ کہ غالب ہے بلکہ مفید کن حیثیت رکھتا ہے۔ رومن ایمپائر کا مقابلہ کرنے کے لیے مغرب نے قوم پرستی کا سہارا لیا اس لیے انسانوں کے گروہوں نے ہمیشہ اس بات کی جدوجہد کی ہے کہ وہ زبان' نسل' علاقے' سماجی رویوں اور ثقافتی مظاہر کے حوالے سے اپنی الگ شناخت قائم کر سکیں۔ مغرب کے اندر اس رجحان نے بڑی بڑی سلطنتوں کا تار و پود بکھیرنے میں اہم کردار سرانجام دیا تھا۔ سلطنت عثمانیہ بھی سلطنت روما کی طرح قوم پرستی کے ہاتھوں شیرازوں میں

بکھر گئی تھی۔ پروفیسر خورشید احمد نے انسان کے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ایک سیاسی مورخ کے مطابق انسان کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے کہ وہ کن امور پر متفق ہیں بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ کون سے حوادث ہیں جن کی بنیاد پر انسان ایک دوسرے سے اختلاف کرتا ہے۔ انسانی تاریخ دراصل ایک ایسی تاریخ ہے جس میں انسان امید و بیم کے مابین اپنی شناخت تلاش کرنا چاہتا ہے یا خاص طور پر ایک ایسی تاریخ ہے جو اسے بتاتی ہے کہ وہ کن مقامات پر یکجا اور کن مقامات پر تقسیم ہو کے رہ جاتا ہے۔ قوم پرستی' جو اس بات کی علامت بنتی ہے کہ ایک ایسے گروہ میں شامل ہونے کا احساس جو دوسرے گروہ انسانی سے اپنے مشترک نسلی' لسانی اور تاریخی رشتوں کے اعتبار سے مختلف ہے ممتاز ہے۔ جس کا عام طور پر کسی خاص جغرافیائی وحدت سے تعلق بنتا ہے' ایک مضبوط قوت ہے جو اسے متحد بھی کرتی رہی ہے اور پچھلی دو صدیوں میں اسی قوت نے اسے یعنی انسان کو منتشر بھی کیا ہے۔ انیسویں صدی میں Hubsburg اور عثمانی سلطنتوں کا ٹوٹنا' بیسویں صدی میں برطانوی' فرانسیسی اور اطالوی و ہسپانوی سلطنتوں کے نو آبادیاتی کردار کا تحلیل ہونا بھی دراصل قوم پرستی کے اصول شکست و ریخت اور تعمیر کا ہی مرہون منت ہے۔"1

ان سلطنتوں میں تمام گروہوں اور قوموں کے امتیازات گم ہو چکے تھے سماجی اور تہذیبی حوالے مدغم ہوتے جا رہے تھے مغرب نے اس دوران میں انتہائی سختی سے مذہب کی حدود کو دنیا کے معاملات سے کہیں پہلے طے کر دیا تھا۔ مذہب کو ان حدود سے نکلنے کی آزادی تو کیا بالکل اجازت ہی نہ تھی۔ اس کے ہاں مذہب کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ زندگی کے عمومی معاملات میں ایک مذہبی حکم کے طور پر کوئی کردار ادا کر سکے۔ مغرب کے انسان نے خود کو طبیعات کے ماہرین کی دنیا کے حوالے کر کے مذہب سے جان چھڑا لی تھی اور اسے پادری کے حوالے کر دیا تھا۔ اہل مغرب یہ سب کچھ کرتے ہوئے اس تلخ حقیقت کو فراموش کر رہے تھے کہ کچھ بھی ہو جائے مذہب کے بے دخل کرنے کا عمل ان کے لیے آسانیاں نہیں' الجھنیں ہی پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ انسان مغرب کے اس رویے کے زیر اثر فطرت اور قدرت کی ساری قوتوں کو مسخر کر کے اپنے احکامات کے تابع کرنے کے جس سفر پر نکلا تھا۔ اب تک وہاں سے واپس نہیں آسکا۔ فطرت کی تسخیر تو اس نے ضرور کی

لیکن وہ حسن لطیف کو مسخر نہ کر سکا جو زندگی کی جملہ رعنائیاں لے کر انسانی زندگی میں داخل ہوتی ہے اور جذبوں' خواہشوں اور احساسات کی دنیا بسا جاتی ہے۔ مادیت کے زیر اثر مغربی تہذیب اس حسن لطیف سے محروم مجرو تہذیب ہی کہی جائے گی۔ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ مسخر کرنے کی اس شدید خواہش نے مغربی دنیا کو جو کارہائے نمایاں سرانجام دینے کا راستہ دکھایا اس کی بدولت وہ آج اپنی تکنیکی برتری کو منوا رہی ہے لیکن جو خامی رہ گئی وہ بھی کامیابی کی مانند بڑی اور خوفناک تھی جس نے مغربی انسان کی سماجی' خانگی اور روحانی زندگی کو بے کل ہی نہیں کر دیا بلکہ برباد کر کے چھوڑا۔ مغرب کی تجارتی اور صنعتی سوچ اس کی ذمہ دار تھی اور اب بھی ہے۔ مغرب نے اس سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا کہ وہ مجرو سچائیوں کا عادی ہوتا چلا گیا۔ ایسی سچائیاں جن کو آنکھ دیکھ سکے اور ہاتھوں سے محسوس کی جا سکیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ مغرب کی تاریک تاریخ کا ایک شدید ردعمل تھا۔ مغربی تاریخ اس سے قبل خیالی' تصوراتی اور ابہام کی تاریخ تھی۔ مذہب کی غیرواضح طور پر دیکھی جانے والی تصویر بھی اس کا سبب بنی تھی۔ جو چیز حساب کتاب اور ناپ تول کی حدود میں تھی وہ حال تھا۔ انہیں حالات کے پیش نظر مغربی تہذیب کے نزدیک پیغمبری ایک کرشمہ کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی ایک ایسا کرشمہ جس کا ظہور کسی اور سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مغرب کی غلطی تھی سنگین ترین غلطی کہ اس نے پیغمبری کو ایک کرشمہ سمجھ کے زندگی پر اسے منطبق کرنے کی شعوری کوشش تو دور کی بات' اسے شعور میں جگہ ہی نہ دی۔ جس سے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ کرشموں تک مذہب کو محدود کرنے کا مطلب تو یہ تھا کہ مذہب تبدیلی اور تعمیر کا ساتھ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک اسے مافوق الفطرت وجود کی اشیرباد حاصل نہ ہو اور یہ کہ وہ وجود واقعی موجود ہو ماضی کا حصہ نہ بن گیا ہو۔ مذہب کو سمجھنے میں مغرب کی یہ غلطی اجتہادی غلطی ثابت ہوتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود مغرب رجوع کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کے لیے مقداروی طبیعیات کو مذہب یا حسن لطیف سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

میکانکی کارکردگی کی صفت کے حوالے سے مغرب اور اس کی تہذیب کا مطالعہ مزید دلچسپ صورت حال سامنے لاتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب علوم کی حدیں اس نوعیت کی تھیں جنہیں انسان کمال کی حد تک عبور کر لیتا تھا لیکن آج علوم میں بے پناہ شاخیں

سامنے آ رہی ہیں۔ آج کا دور سپیشلائزیشن کا دور ہے انسان کا کمال کسی ایک شعبہ کی ایک برانچ کے مختصر سے حصے تک محدود ہو گیا ہے انسان نے طبیعیات' کیمیا' ریاضیات اور دیگر طبعی علوم میں جو بے پناہ کمال حاصل کیا ہے۔ وہ اس کے میکانکی عروج کی داستان خود بیان کرتا ہے۔ اس میکانکی کمال کا دوسرا پہلو یا اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انسان کی کائنات محدود ہو گئی ہے۔ وہ مظاہر کائنات پر غور کرنے کے لیے وقت ہی نہیں نکال پاتا وہ جس شاخ علم سے وابستہ ہے اس کی بو قلمونی اسے توجہ کہیں اور کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس صورت حال نے اس کی نظر کو محدود اور اس کے علم کو قید کر دیا ہے۔ جب اسے راہنمائی اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنی مخصوص علمی حد کے باہر وہ خود کو ان پڑھ تصور کرتا ہے۔ حالانکہ اس کے ریکارڈ میں ڈگریوں کی لمبی قطار ہوتی ہے اس کے علم و فضل کی دنیا معترف ہوتی ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو محسوس کرے کہ جس ہستی نے علوم کی یہ دنیا اسے عطا کی ہے وہ ان علوم کی نوک پلک تک مسلسل سنوار رہی ہے تو اسے بہت جلد احساس ہو جائے گا کہ مجرد سچائیوں کو بیدار کرنے والی قوت طبیعی نہیں مابعد الطبیعی ہے جو ماورا ضرور ہے لیکن انسان سے دور ہرگز نہیں۔ اس اصلی سچائی کو اسلام نے انسان کے لیے تلاش کیا ہے۔ اور مغربی تہذیب ابھی تک سرگرداں ہے۔

مغرب نے اپنی قدروں سے ایک بات اور حاصل کی تھی اس نے کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں کا بھی سامنا کیا تھا۔ سلطنتوں کے ٹوٹنے سے اقوام کی صفوں میں ممالک کا اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھے نسلی اور علاقائی' گروہی اور لسانی فسادات نے بھی رنگ دکھایا۔ مغرب نے اس سے ایک اور غلط نتیجہ اخذ کیا کہ ہر خیر کے لیے شر بھی ضروری ہے۔ نیکی کو برائی کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دراصل ایک گہرا احساس محرومی تھا جو مغرب کو حس لطیف اور مذہب سے دوری نے عطا کیا تھا۔ خیر اور شر' نیکی اور بدی' کامیابی اور ناکامی' یہ ایسی چیزیں ضرور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کام خیر ہے تو اس کا متضاد شر ہو گا ایک کام نیکی ہے تو اس کے مقابلے میں برائی ہو گی۔ ایک طرف کامیابی ہے تو دوسری طرف ناکامی ہو گی لیکن اس سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ایک نیکی کو حاصل کرنے کے لیے برائی کا ارتکاب ضروری ہے۔ خیر تک پہنچنے کے لیے شر کا کیا جانا لازمی ہے تاکہ خیر اور شر کے اصل فرق کو محسوس کیا جائے۔ زندگی میں تو باشعور مظاہر

ایسے ہیں جن سے نیکی' خیر اور کامیابی کو پہلی نظر ہی پہچان لیتی ہے۔ یہ سائنس کا تجربہ نہیں کہ جس کی کامیابی ایجاد یا دریافت بنتی ہے اور ناکامی یا دماغی بنتی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ خیر کی شر سے الگ شناخت ہے نیکی اور برائی کی الگ الگ شناخت ہے لیکن کسی ایک کو بھی حاصل کرنے کے لیے دوسرے کا ارتکاب کرنا لازمی نہیں ہے۔

قومی ریاست نے اپنے شہریوں کو قربت کا احساس دیا تھا جہاں وہ شادی اور غمی کی تقریبات میں یکجا ہوتے اور مذہبی جذبات کے زیر اثر کام کرتے تھے۔ احساس شراکت کے لیے جمہوری رویوں کی تعمیر بھی ضروری تھی۔ انسان شراکت چاہتا تھا۔ اس کے ماضی کے تجربات سے اسے علم ہوا کہ سلطنتوں کے زمانے میں اقتدار اور اختیار' خواہ وہ مسیحی ہو یا مسلمان' ایک گروہ یا ایک خاندان میں مرتکز رہتا تھا۔ باقی تمام رعایا دوسرے درجے کی شہری بن کے رہتی تھی۔ عالم اسلام سے خلافت کے نظام کے خاتمے' ملوکیت آجانے سے بھی انہی رجحانات کو فروغ ملا تھا۔ لیکن مذہب کی قوت موجود تھی جس نے اسے شدت سے اظہار کرنے نہیں دیا جبکہ مغرب کے انسان کا تجربہ زیادہ تلخ تھا۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو خلافت کے امور میں شرکت اور مشاورت کا احساس نہ رہا تھا۔ مسلمانوں کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ حکومتی معاملات میں رائے دے سکتے۔ اس رویے نے دوری اور لاتعلقی کو جنم دیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اصلاح کے بجائے خلافت ہی ختم کر دی جائے۔ مسلمان یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس دوران میں قومی ریاست کے تصور نے جگہ پائی تو مغرب نے محسوس کیا کہ قومی ریاست میں پہچان کا مسئلہ بھی حل ہوا چاہتا ہے۔ لسانی اور نسلی وحدت بھی قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن اہل مغرب یہ نہ دیکھ سکے کہ کسی نظریے کی غیر موجودگی میں جسے وہ ماضی کی ایک تلخ یاد' ایک تصور محال' خیالی رویہ کہتے تھے' لسانی اور نسلی' علاقائی اور گروہی مفادات یکجا کر کے بھی افراد کو ایک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان میں قوت محرکہ اعلیٰ و ارفع نہ ہو۔ امت مسلمہ کا تصور اس قوت محرکہ کا تصور ہے جو انسان کو اس کی ذات' نسل' رنگ' علاقے' زبان اور حیثیت سے ماوراء کئے بغیر ان کی پہچان کرتے ہوئے' ان کو بے دخل کئے بغیر اس بات کی طرف راغب کرتی ہے کہ یہ پہچانیں اس کے لیے عصبیت کا سبب نہیں بن سکتیں۔ اس کے لیے تعصب پیدا نہیں کر سکتیں۔ کسی کی نسل یا کسی کی

زبان اصل امتیاز نہیں ہے بلکہ اصل امتیاز تو یہ ہے کہ ماننے والا کون ہے اور انکار کرنے والا کون ہے۔ ماننے والوں کو مومن کہہ کے' مسلم بنا کر ساری دنیا میں یہ قوت ایک کر دیتی ہے۔ ہسپانوی بولنے والا' جرمنی بولنے والے سے یوں شیروشکر ہو جاتا ہے گویا کہ دونوں ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیے تھے۔ یورپ کی حدود سے نکل کر اور ایشیا کے جغرافیے سے اٹھ کر یہ عقیدہ انہیں ایک کر دیتا ہے۔ مغرب کی قومی ریاست میں اس نظریے کی کمی تھی جس نے وقتی مفادات کے جلو میں آج کے مغرب کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے اسے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ عالم اسلام میں ایمان کی مشترکہ صفت ایسی ہے جو امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کا کام جاری رکھے ہوئے ہے اور کوئی لمحہ آتا ہے کہ یہ شیرازہ بندی مکمل ہونے کو ہے وہ لمحہ قومی ریاستوں میں منقسم مغرب کو خطرہ محسوس ہو رہا ہے گویا مغرب نے جس خطرے کو پال رکھا ہے وہ اسلام کے تصور امت سے عبارت ہے۔ اور جو خود مغرب کے منفی رویوں سے خطرہ بنتا ہے وگرنہ جو اسلام اپنے پیروؤں کو یکجا کرنے کی قوت کو بروئے کار لا رہا ہے وہی اسلام انہیں یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ نوع انسانی کا احترام کرنا لازم ہے۔ خطرہ بننا شرط نہیں ہے محبت بننا طریقہ ہے۔ مغرب محسوس کرتا ہے کہ اسلام کی یہ صفت دلوں کو جوڑے گی تو سرمایہ داری اور منڈی کی معیشت کے تار پور بکھر جائیں گے۔ جب دولت مسئلہ نہ رہے گی تو رشتوں کی از سر نو تعمیر ہو گی یہی مرحلہ مغربی تہذیب کے کھوکھلے وجود کو ہلا دینے کا سبب بن جائے گا۔

اس صورت حال کے ردعمل نے مغرب کو سیکولرازم کی طرف تیزی سے دھکیلا ہے۔ مغربی تہذیب کا سیکولرازم اپنے اندر ظاہری فوائد رکھتا ہے۔ مغرب کے اندر اب بھی چرچ موجود ہیں جو منظم انداز سے اپنا کام اپنے اسی دائرے میں کر رہے ہیں جو سیکولر ضرورتوں نے متعین کیا ہے۔ لیکن اس کے تعلیمی اداروں اور تحقیقی مراکز میں اس کا اثرورسوخ بڑھ رہا ہے۔ مذہب کے اثرات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے جب مذہبی معاملات میں مغرب کی رائے کا اظہار ہوتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ سیاسی فیصلوں میں' بالخصوص جب اسلام سے معاملہ کرنا ہو' مذہب پس پردہ رہ کر بھی بنیادی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ جنہیں پہلے ریاستی معاملات میں اہم کردار حاصل تھا۔ وہ قومی ریاست میں بے دست و پا رہے ہیں اور فیصلے کے تمام مراکز پر سیکولر عناصر غالب ہیں۔ اس کی وجہ یہ

ہے کہ علماء کرام نے خود کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رکھا۔ اس کے علاوہ ان سے ایک غلطی یہ ہوئی کہ وہ عوام الناس کا راستہ علوم اسلامی کے حصول کے لیے روکتے رہے۔ اپنی اتھارٹی برقرار رکھنے کی لاشعوری اور شعوری' ہر دو قسم کی خواہش کے زیر اثر انہوں نے عوام الناس کو اسلام کے ماخذوں سے دور رکھا اور انہیں اس بات پر قائل کئے رکھا کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہی دین کی منشاء ہے اس کا نقصان یہ ہوا کہ علماء کرام تحقیق و مطالعے سے دور ہوتے گئے اور عوام دین کی بنیادی باتوں کے لیے بھی ان کے محتاج ہو گئے جو دین سیکھنے اور سکھانے آیا تھا وہ پروہتوں اور پجاریوں کے ہاتھوں محدود کر دیا گیا۔ عصر حاضر نے دین کو محدود رکھنے والوں کو عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب علماء کرام بات کرتے ہیں تو عصر حاضر کے پیدا کردہ مسائل کا حل پیش نہیں کرتے اس لیے کہ انہوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا۔ اس ناکامی کا جب عوام کو علم ہوتا ہے تو وہ علماء کرام سے دور ہو جاتے ہیں۔ گویا پہلے عوام کو دور کیا جاتا تھا اب عوام علماء کرام کو دور کر رہے ہیں۔ یہ ایک سنگین صورت حال ہے جس کا تدارک بہرحال ضروری ہے۔ سید قطب شہید' حسن البناء اور سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ان فاصلوں کو ختم کرنے' عوام کو دین کے قریب لانے اور دین کو اس عہد نو کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی جس تحریک کی بنیاد رکھی ہے اسے مضبوط کرنے کی ضرورت ہے نئے علوم کی بازیافت لازمی ہے جو ان قابل قدر ہستیوں کے کام کو آگے بڑھانے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مغرب نے مذہب کو نجی معاملہ قرار دے کر اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی تھی اور اب بھی کرتا ہے۔ لیکن وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ مذہب نجی معاملہ قرار دینے سے یہ بات بھی لازم آجاتی ہے کہ اخلاقیات کے معیارات اپنی عالمی حیثیت کھو دیتے ہیں اور انفرادیت کا روپ دھار کر سماج کو انارکی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ انسان سماجی اور معاشی پابندیوں سے آزاد ہو کر استحصال اور تباہی کا ہتھیار بن جاتا ہے۔ انفرادی اخلاقیات سے سماجی قدروں کا جنازہ نکالتا پھرتا ہے اور ہمہ وقتی بے چینی کا سبب بنتا ہے۔ انسان کو ہر قسم کی انفرادی پابندیوں سے آزاد کر کے جس لبرل ازم کی خواہش کی جاتی ہے اس کے مضمرات سے مغرب خود بھی آگاہ ہے اور اس کے لیے سیاسی حوالے پیش کرنے والے بھی

باخبر ہیں۔

مغربی تہذیب کے عالم اسلام پر اثرات کے بارے میں مستشرقین کا یہ دعویٰ ہے کہ مذہب' سیاست اور تعلیم کے شعبہ ہائے زندگی میں مغربی تہذیب نے جو کام کیا ہے اس کے نتیجے میں اسلامی فکر میں اسلام کی عائد کردہ پابندیوں کے بارے میں غیر معمولی لچک' دینی فرائض کی بجا آوری میں کمی اور مختلف نکتہ ہائے نظر پیدا ہوئے ہیں۔ اس تنزل میں مغرب کے لبرل رویوں نے زیادہ موثر کردار ادا کیا ہے۔ اس کردار کا موقع خود اہل اسلام کی کمزوریوں سے سامنے آتا رہا ہے وگرنہ اسلامی تعلیمات اور فکر میں جس لچک اور کجی کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس کی حیثیت یہ ہے کہ اسلامی فکر میں انفرادی رویوں کو اہمیت دینے والوں نے ہی اس کی اجتماعی روح کو متاثر کیا ہے۔ مغرب کے لبرل رویوں سے مسیحیت زیادہ شدت سے متاثر ہوئی ہے اور سائنس کی ترقی نے مسیحیت کو ایک روائتی اعتقاد سے بھی کم تر جگہ دی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ جب سائنسی علوم کی غلط تعبیر کی جائے گی اور اس کائنات کے خالق کے حوالے سے شبہات پیدا کئے جائیں گے مذہب کی گرفت کمزور ہو گی اور لوگ نظر آنے والی چیزوں کے عادی بن کے رہ جائیں گے اور وہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیں گے کہ عقل بھی ایک غیر مرئی چیز ہے جس کی مدد سے وہ غیر مرئی چیزوں کے وجود اور ان کی حقیقت سے انکار کر رہے ہیں۔ مغرب نے لبرل ازم پر جس زیادہ شدت سے انحصار کیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے اکثر گرجا گھر اب سماجی رسوم اور تاریخی اوہام کے منائے جانے تک محدود ہو گئے ہیں عام دنوں میں وہ خالی ہی نظر آئیں گے۔ مسیحی تعلیمات میں ایک عنصر انفرادی فکر کے در آنے کا تھا۔ قدیم فلاسفہ کے خیالات کو عیسائیت کا حصہ بنانے سے مزید بگاڑ پیدا ہوا تھا۔ ہر چیز کو سائنس اور منطق کے حوالے سے مذہب کی سند عطا کرنے کا رجحان بھی تیز ہوا جس نے پھر مذہب کی ہر بات کے لیے سائنس اور منطق سے سند لینے پر اصرار شروع کر دیا۔ منطقیوں کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنی بات کو زیادہ جدید اور معروف مضمون میں ماڈرن قرار دے کر عام افراد میں اثر و نفوذ پیدا کرتے ہیں اور مذہبی تعلیمات کی من مانی تشریح اپنا حق تصور کرتے ہوئے ایسے اقدامات کرتے چلے جاتے ہیں جن سے ایک طرف مذہب کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور دوسری طرف عام آدمی ردعمل کے طور پر مذہب کو غیر نمائندہ قرار دے کر ماڈرن اور لبرل

رویوں کے حوالے ہو جاتا ہے۔ مسیحیت میں یہ سب رویے پروان چڑھے اور بالآخر یہاں تک آئے کہ ان میں سے بہت سی باتیں ایسی بھی کہی جانے لگی جو اوہام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ مستقبل کی زندگی کیسی ہوگی؟ عصری آرٹ اس پر طبع آزمائی کرتا اور مذہب کی تعلیمات کو نشانہ بناتا ہے۔

مغرب کے مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تحریروں میں جس انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سے بھی صاف عیاں ہوتا ہے کہ انہیں اسلام کا کماحقہ ادراک نہیں تھا یا وہ جان بوجھ کر غلط مبحث کر رہے تھے۔ قابل احترام خاتون مریم جمیلہ نے منٹگمری واٹ کی کتاب Islam And the Integration of Society پر سیر حاصل تنقید کرتے ہوئے بہت اہم نکات اٹھائے ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

> "(اس کتاب کے) ابتدائی ابواب طوالت لئے ہوئے ہیں اور ان میں بنیادی طور پر جس سنگین غلطی کا ارتکاب کیا گیا ہے اس میں اسلام کے تاریخی عروج اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قوت حاصل کرنے اور مدینہ میں عروج پانے کو اقتصادی محرکات کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ معاملات کو سمجھنے کا یہ طریقہ آغاز سے اختتام تک مادہ پرستانہ ہے اور خطرناک حد تک مارکس ازم کے قریب جا پہنچتا ہے۔ جس سے عام قاری کو بھی اور ایک مسلمان قاری کو بھی شدید صدمہ ہوتا ہے"ـ 2

Forward to -1

Ethno-national Movements of

Pakistan - Dr. Tahir Amin

صفحہ xiii

"Islam and Orientalism" -2

Maryam Jamilah, Feb. 1981

صفحہ 98

۱۰

مغرب اور قوم پرستی

- قوم پرستی کی نسلی بنیادیں
- سیاست پر اثرات
- سلامتی کا مسئلہ
- نسلی صفائی کی مہم

مغرب اور قوم پرستی

قوم پرستی کی نسلی بنیادیں "نظریے کی موت" کا اعلان کرنے کے بعد مغرب نے جداگانہ تشخص کو نسلی بنیادوں پر استوار کرنے کا "کارنامہ" سرانجام دیا ہے۔ "نظریہ" نئی تہذیب کے لئے ایک اجنبی ہے۔ اس لئے مغرب کے لئے اس کی موت کوئی سانحہ نہ بن سکی تاہم مسلم معاشروں میں اس اعلان پر شدید مزاحمت کی توقع کی گئی جو بوجوہ اپنی کارکردگی کے ذریعے اس اعلان کی عملی مزاحمت سے کم رہی۔ جب نسل محترم ٹھہری اور نظریہ مجرم بنا تو قوم کی پہچان کے زاویے بھی بدلنا ناگزیر تھے۔ یورپ میں اور دنیا کے دیگر حصوں میں نسلی قومیت کی بنیاد پر بدامنی' بے چینی اور انارکی کے مظاہرے اس تبدیلی کی وجہ سے ہی دیکھنے میں آئے۔ ایک ملک کے اندر مخصوص آبائی پہچان رکھنے والوں' مشترکہ ماضی اور تہذیبی اقدار کے حامل لوگوں نے خود کو اس ملک کی اجتماعی پہچان سے الگ کر کے دیکھنا چاہا۔ سرد جنگ کے خاتمے تک اس کی قوت کم رہی اسی لئے دنیا کے نقشے پر بہت زیادہ ممالک نمودار نہ ہو سکے۔ زیادہ تر ممالک نو آبادیاتی دور کے نقش اول کے مٹنے سے ابھرے اور آزاد ممالک کہلائے۔ اسرائیل نے نسلی بنیادوں پر آزادی حاصل کی اور بنگلہ دیش کو انہی بنیادوں پر آزاد کرایا گیا۔ کسی بھی ملک کی وحدت کو نسل کے رجحانات نے متعین کرنا شروع کیا تو اس میں تیزی سرد جنگ کے بعد ہی آئی۔ سرد جنگ کے زمانے میں ممالک نے بزور ایسی جدوجہد کو روکا۔ کہیں نظریہ کمزور ہوا تو نسل نے قوت حاصل کی کہیں ریاستی جبر میں تبدیلی آئی تو نسل نے ملک حاصل کر لیا۔ لیکن سرد جنگ کے خاتمے نے جب "نظریے کی موت" اور "قوت کی حکمرانی" کے اعلان کئے تو یک دم ممالک بنتے چلے گئے۔ انفرادی تشخص نے اجتماعی روپ دھارا اور مقاصد کا تعین مخصوص آبائی تاریخ اور مشترکہ ثقافتی ورثے کی بنیاد پر کیا جانے لگا۔ اس نسلی پہچان نے قوم کی نسلی تعبیر بھی دی اور قوم کو اپنی وحدت سے محروم بھی کیا اگرچہ بذات خود "قوم" کا لفظ کم خطرناک نہیں ہے۔ ایک ملک کے باشندے یا رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے تمام شہری مل کر اس ملک کی شناخت بناتے ہیں ان کی الگ سے' انفرادی سطح پر شناخت ثانوی رہ جاتی ہے اور ملک کی اجتماعی شناخت ہی ان کی شناخت ٹھہرتی ہے نسلی گروہوں نے اس ثانوی حیثیت کو اولین مقام تک لے جانے کے لئے تعصب کی راہیں اختیار کیں کیونکہ نسل کے مفادات کو

حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایسا کرنا ضروری سمجھا یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ اس کے مضمرات کیا ہوں گے۔ عالمی دباؤ نے بھی ایسے کام کروائے اور قومیت جو بجائے خود دور حاضر کا ایک عظیم فتنہ ہے نسلی قومیت کے قالب میں ڈھل کے مزید خطرناک ہو گئی۔ کسی قوم کی پہچان' اس کی ثقافتی و تہذیبی بقا سے انکار نہیں کیا جا سکتا تا ہم جب وہ اپنے مخصوص محور کے گرد گھومتی ہے اور دیگر سماجی اکائیوں کو فراموش یا مسترد کر دیتی ہے ان کے حقوق بھی سلب کرتی اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرتی ہے تو یہ پرستش بتاں بن کے خطرناک ہو جاتی ہے نسلی بنیادوں پر تفریق سے اس بت کی سختی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

شخصیت کے اظہار کے لئے اس کا نام واقعی ایک پہچان بنتا ہے اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے لیکن اجتماعی پہچان کے تقاضے اس سے بھی برتر ہوتے ہیں۔ ایک اجتماعی تہذیب ہی اجتماعیت کی پہچان بنتی ہے۔ یورپ کے قلب میں بوسنیا کے باشندے اسلامی تہذیب سے تعلق اسی لئے جوڑتے ہیں کیونکہ اسی طرح وہ اپنی اصل شناخت کو پا سکتے ہیں۔ وہ محض بوسنیائی بن کے بھی زندہ نہیں رہ سکتے وہ بیسویں صدی کے چھٹے عشرے سے خود کو مسلمان کہتے اور خود کو دوسروں سے الگ کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے بوسنیائی نسل پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ اس نسل کو اسلامی تہذیب کے ساتھ منسلک کر کے دنیا کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ سربوں اور کروٹوں سے مختلف تہذیب اور شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں اب جبکہ وہ اس خواہش کو عمل دینا چاہتے تھے تو آرتھوڈوکس مسیحیت کے زیر اثر سربوں نے اور کیتھولک مسیحیت کے زیر اثر کروٹوں نے ان کا راستہ روکنا چاہا۔

نسل پرستی وراثت کو ہی بنیاد نہیں بناتی۔ محض آبائی شناخت ہی نسل کو قائم نہیں کرتی بلکہ اس میں اعتقادات اور تاریخی حوالے بھی اسے قائم کرتے ہیں۔ اس طرح نسل پرستی کا مظاہرہ کرنے والا گروہ کسی بھی تہذیب میں سے اپنی تہذیبی شناخت کو سامنے اور برتر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان اور روایات کی ہم آہنگی تلاش کی جاتی ہے خاندان میں استعارے تلاش کئے جاتے ہیں مشترکہ کرنسی کی خواہش جنم لیتی ہے۔ اور وہ استعارے نسل کو ایک بہت بڑا خاندان قرار دیتے ہیں اس خاندان سے باہر کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ "خاندانی معاملات" میں مداخلت برداشت نہیں ہوتی۔ بلکہ تہذیبی ورثے کو نسل در نسل منتقل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طرح نسل ایک خول میں

بند افراد کی شناخت تو بن جاتی ہے لیکن انہیں اجتماعی دھارے سے الگ کر دیتی ہے اور ان کی سرگرمیاں محدود ہو جاتی ہیں ان کی سوچ کے دائرے سکڑتے ہیں ان کی خود اختیار کردہ تنگی ان کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے جس کے تدارک کے لئے نسلی گروہ دوسرے گروہوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ رقابت پیدا ہوتی ہے تو چنگاریاں شعلہ بنتی ہیں مفادات ٹکراتے ہیں تو آگ لگ جاتی ہے اور نتیجہ کے طور پر ملک تباہ ہو جاتے ہیں۔ سنہالی بد تامل ہندوؤں سے ٹکراتے ہیں اور انسانوں کی لاشیں گرتی ہیں۔ لسانی جھگڑے سر اٹھاتے ہیں تو بنگلہ دیش وجود میں آتے ہیں دنیا کی سب سے "برتر نسل ہونے" کا زعم اسرائیل کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے۔

نسل پرستی کے اس رجحان کو صرف مذہب کی قوت کنٹرول کر سکتی ہے جو نظریے کو مرنے نہیں دیتی لیکن مذہب پر عمل کرنے والوں پر بھی بہت کچھ منحصر ہے۔ آرتھوڈوکس عیسائی ہوں یا صیہونی نسل کے لوگ ہوں ان کے لئے یہودیت اور نصرانیت کو ترک کرنا ممکن نہیں ہے۔ مذہب نسلی منافرت کو کم کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے ایسا کرنے دیا جائے۔ اسلام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو نسلی برتری کے غرور سے نجات عطا کرتا ہے انہیں مواخات کا راستہ دکھاتا ہے انہیں باہم شیر و شکر کرتا ہے وہ اپنے پیروکاروں سے صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ تمہیں قبائل اور گروہوں میں صرف اس لئے تقسیم کیا گیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو تم میں برتر تو وہی ہے جس کا تقویٰ زیادہ ہے گویا یہاں پہچان ایک ثانوی درجہ ہے جب کہ تقویٰ کا حاصل کرنا شرط اول ہے تب ہی برتری مل سکتی ہے لیکن یہ بات بھی ایک مسلمان کی زندگی کا لازمی حصہ ہے کہ وہ نہ تو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا تقویٰ برتر ہے یا زیادہ ہے اور نہ ہی اپنے تقویٰ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ وہ تقویٰ کے اس مقام پر فائز ہے جہاں دوسرے اس سے کم مقام پر کھڑے ہیں اس کا فیصلہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی نے کرنا ہے۔ اس طرح اس دنیا میں قبیلہ' نسل' زبان' جغرافیائی محل وقوع یا کوئی تہذیبی ورثہ اس کی برتری کا ثبوت نہیں بنتا۔ اس کیفیت کے حامل تمام انسانوں پر مشتمل قوم نہیں بنتی بلکہ امت بنتی ہے۔ امت مسلمہ--- اسلامی تہذیب کی حامل امت مسلمہ--- یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے مسلمانوں کی نظروں سے گرانے کے لئے نئی تہذیب کے حملے جاری ہیں۔

نسلی پہچان کے حوالے سے پہلا تصور تو یہ تھا کہ ایک مخصوص سرزمین پر' نسلی اعتبار سے متضاد قوم سے ٹکراؤ' نظریاتی تفریق اور الگ نظر آنے کی صفات سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔ عام زندگی میں تہذیب کے اثرات' تجارتی و کاروباری رجحانات اور ثقافتی سرگرمیوں کی ہم آہنگی کا اظہار ایک سرزمین پر ہوتا تھا۔ ہر نسل خود کو دوسری نسل سے متصادم رکھتی تھی تاکہ اپنے ارکان کو ہر دم متحرک رکھ سکے ان میں نسلی عصبیت کو بیدار رکھ سکے اب اس میں دور جدید کی سہولتوں نے بھی اپنا حصہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ بھارت میں سیکولرازم کی عملی ناکامی نے ایک مذہب ہونے کے باوجود ہندوؤں میں مختلف گروہوں کو اب تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ جن میں سہولتوں' عام زندگی سے فائدہ اٹھانے کے مواقع میسر آنے اور وسائل حیات جمع کرنے تک میں وسیع تفاوت ہے۔ ان تمام گروہوں کو ہندو ازم کے حوالے سے مقام دیا جاتا ہے۔ بے حیثیت شودر اور طاقتور برہمن اس ہندو سماج کے دو انتہائی رویے ہیں۔ انسان ہونے کے باوجود ان میں مساوات اور عدل و معاشیات کے بہت بڑے خلا موجود ہیں۔

جدید ریاست کی سرگرمیوں میں اضافے' اداروں کے قیام اور شہری یکجہتی کے لئے جدوجہد کے ذریعے نسلی منافرت کو کم کرنے کے لئے کوشش کی جاتی ہے۔ اس کوشش کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختلف نسلوں کے درمیان فاصلوں کو کم کیا جائے ان کے باہم اتصال اور تعامل میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے انہیں ملکی ترقی کے کاموں میں برابر کا حصہ دار بنایا جائے اور مساویانہ سہولتوں اور کاروبار حکومت میں شرکت کے ذریعے احساس محرومی کا شکار ہونے سے بچایا جائے تاکہ وہ انتہا پسند رویوں کی طرف نہ چل پڑیں اور ملکی وحدت کو نقصان نہ پہنچنے پائے۔ اس باہم اتصال سے ان میں تہذیبی شناخت میں ہم آہنگی لانے کے لئے کام بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جن اہل حکومت نے سندھ میں اردو بولنے والوں کو سندھی علاقوں میں آباد کرنے کے بجائے الگ شہروں میں آباد کرنے پر زور دیا انہوں نے سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان ثقافتی تعامل کو ختم کر کے مشترکہ ثقافت کو پروان چڑھنے سے روکا جس کے نقصانات آج ظاہر ہیں۔ تامل ہندوؤں کو احساس محرومی کا شکار کرنے والوں نے سری لنکا کے لئے مستقل مسئلہ کھڑا کر دیا' مسائل پیدا کئے' پہلے سے موجود نسلوں کی بنیاد پر قوموں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور نسلی قومیت کی

بنیاد پر ممالک وجود میں آئے۔ مغرب میں نسل پرستی کا رجحان جدید ترقی کے جلو میں پروان چڑھا جب کہ مشرق میں اس رجحان میں قوم پرستی کے عامل نے اضافہ کیا۔ سابق سوویت یونین کے ٹوٹنے سے جو ممالک وجود میں آئے انہوں نے بھی نسلی قومیت کو تحفظ کا ذریعہ قرار دیا۔ یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے سے سربیا' بوسنیا' کروشیا سمیت دیگر ریاستوں کا وجود میں آنا بھی نسلی قومیت کے زیر اثر ہی تھا لیکن اس خطے میں ایک عامل اور بھی شامل تھا جسے مغرب نے دور کرنے کے لئے سربیا کی مدد کی وہ بوسنیا میں اسلام کا عامل تھا۔ نسلی بنیادوں پر استوار قوم پرستی کی عمارت نظریے کی قوت کے بغیر ہمیشہ کمزور رہی۔ نظریے کو بے دخل کرنے والوں نے نسلی قومیت کو آزادی کی راہ قرار دیا تھا۔ اب اس راہ پر چل کے دنیا کی بیشتر اقوام آزادی چاہتی ہیں بہت سے ممالک کی سلامتی کو خطرات لاحق ہیں۔

عالم اسلام میں نسلی جذبات کو ابھارنے کا مقصد مرکزیت کا خاتمہ تھا۔ کردوں کو ترکی' ایران' شام او عراق کے خلاف برسرپیکار کرنے والوں نے اس خطے میں مستقل طور پر اپنی مداخلت کا جواز پیدا کر رکھا ہے۔ آذر بائیجان کے خلاف جارحیت بھی خطے میں مسلمانوں کو مضبوط ہونے سے روکنے کی ہی کوشش ہے۔ بلقان میں مسلمانوں کا ناطقہ بند کرنے کا مقصد بھی واضح ہے۔ لیکن دنیا بھر میں کوئی مثال ایسی نہیں دی جا سکتی جہاں اسلام نے نسلی بنیادوں پر قوم بنانے کے عمل کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ کسی ملک میں نسلی قومیت کو فروغ دیا ہو یا اسلام کی وجہ سے کسی ملک کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوئے ہوں۔ اس کے برعکس مسلمان ممالک کو نسلی بنیادوں پر عدم استحکام کا شکار بنانے کی شعوری کوشش ضرور نظر آتی ہے۔ الجزائر میں عوام کو بربر اور عرب نسل میں تقسیم کرنے کے لئے کام ہو رہا ہے۔ عراق کو شیعہ اور کرد آبادی میں تقسیم کرنے' افغانستان میں قبائلی تعصب کو فروغ دینے اور پختون غیر پختون کا مسئلہ کھڑا کرنے پر کام کیا جاتا ہے۔

نسل پرستی اور نسلی قومیت کی وجہ سے برپا ہونے والی جنگوں میں انسانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ زبان' تہذیب' رواج' قدر اور عام زندگی کے جملہ مظاہر میں تعصبات کا فروغ کسی بھی "نئی تہذیب" کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ امت مسلمہ کو "نظریے کی موت" کے اعلان کے خلاف جدوجہد کرنا ہو گی تاکہ وہ وحدت کے واحد ذریعہ اسلام کو نسلی قومیت کے مقتل میں قربان ہونے سے بچائے جو غیر مسلم اقوام

نے اہل اسلام کو پھانس کر سر مقتل صلیب کرنے کے لئے تیار کیا ہے بوسنیا کے تجربے نے اقوام عالم کو حوصلہ دیا ہے کہ نسلی قومیت پر مصلوب کئے گئے مسلمان آسانی سے شکار کئے جا سکتے ہیں۔

عالم اسلام کے اداروں کو بھی مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا فعال اور مؤثر کردار ماضی کی نسبت مستقبل میں زیادہ اہمیت اختیار کرے گا۔ لیکن ماضی کے ناکام رویوں کو تبدیل کیا جانا ضروری ہے۔ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت ان کے اسلام سے غیر متزلزل وابستہ ہونے سے ہی مشروط ہے۔ اس شناخت کو محفوظ رکھنا اور فروغ دینا نہ تو قدامت پسندی ہے اور نہ ہی بنیاد پرستی۔ جو دین انسانیت کو نسلی قومیت کے خون آلود ہاتھوں سے نجات دے کر امن و آشتی کے ماحول میں لا سکتا ہے وہ ظالم' دہشت گرد اور جاہل نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب کو دنیا میں متعارف کرانے کے لئے مسلمانوں کو اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ نئی تہذیب کے ان خطرات کو بے معنی قرار دیا جا سکے جو لاعلمی کی وجہ سے اسلامی تہذیب سے اسے "متوقع" ہیں۔

سیاست پر اثرات یورپی پارلیمنٹ کے رکن مائیکل ہنڈلے نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ وہ نسل پرستی کے خلاف اجلاس میں شریک تھے۔ ایک پبلک لائبریری کے ہال میں ہونے والے اس اجلاس میں ان کی تقریر کے دوران برٹش نیشنل پارٹی کے چند دہشت گرد دندناتے ہوئے داخل ہوئے اور انہوں نے کتابوں کو اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیا' چند ایک ایسے تھے جنہوں نے فرنیچر بھی توڑا اور اپنے دو سرغنوں کی ہدایت پر یہ ساری کارروائی کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ مائیکل کا کہنا ہے کہ لمحے بھر کو مجھے وہ ایشیائی رہاشندے یاد آئے جن کے ساتھ برطانیہ میں امتیازی سلوک کی خبریں میں پڑھتا تھا میں اس حادثے سے اس لئے بھی زیادہ افسردہ ہوا کہ اس حادثے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ میں نے عہد کر لیا کہ میں نسل پرستی کے خلاف زیادہ قوت سے لڑوں گا۔ مائیکل کا کہنا ہے کہ اس نے جو نتیجہ اخذ کیاوہ یہ تھا کہ اس گروہ نے لائبریری میں جو کچھ کیا ہے وہ برطانیہ کے طول و عرض میں ایشیائی باشندوں اور سیاہ فام آبادی کے ساتھ کیا نہیں کرتے ہوں گے اس کا تصور ہی میرے لئے ہولناک تھا۔ اس رکن پارلیمنٹ کا موقف یہ ہے کہ برطانیہ میں لوگوں کو برطانوی ہی رہنے دیا جائے اور برطانوی سماج میں نسل پرستی کو لعنت قرا دیا جائے۔

برطانیہ کو اپنی ان روایات کو دوبارہ زندہ کرنا ہو گا جو رواداری' جلا وطنوں کی مہمان نوازی اور غیر ملکیوں سے اچھے سلوک کی امین تھیں۔

(دی مسلم۔ 31 دسمبر 1993ء)

مائیکل ہنڈلے کا تجربہ یقیناً ان کے لئے حیران کن ہو گا لیکن نسل پرستی نے ملکی سیاست میں جو اثرات مرتب کئے ہیں ان کی منفی حیثیت سے دنیا کا ہر معاشرہ پریشان ہے۔ نسل پرستی کے رجحان نے قوم پرستی کے ساتھ مل کر سیاسی اداروں کی تباہی اور سیاسی عمل میں عدم استحکام کے راستوں کو کھولا ہے۔ آیئے ایک نظر دنیا پر اس حوالے سے ڈالیں اور دیکھیں کہ اکثر ممالک میں نسلی تفاوت کے ابھرنے سے جو بے چینی ابھری ہے اس کی شدت کی کیا کیفیت ہے اور پڑوسی ممالک پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔

افغانستان 15,592000' 50% پشتون' 25% تاجک' 9% ازبک' 9% ہزارہ

البانیہ 3,268,000' البانوی 98%' یونانی 1.8%

الجزائر 25,714,000' عرب 75%' بربر 25%

اینڈورا 51,000' کٹلدن 61%' ہسپانوی 30%' اینڈوران 6%' فرانسیسی 3%

انگولا 8,802,000' اویم بندو 38%' کمبندو 25%' بکانگو 13%

ارجنٹائن 32,291,000' یورپی 85%' اطالوی ہسپانوی عرب وغیرہ 15%

آسٹریلیا 16,646,000' یورپی 95%' ایشیائی 4% قدیم آسٹریلوی 1.5%

آسٹریا 7,595,000' جرمن 98%' سلووینی' کروشیائی 2%

بہاماس 251,000' سیاہ فام 85%' برطانوی امریکی کینیڈی 15%

بحرین 512,000' بحرینی 63%' ایشیائی 13%' ایرانی 6% دیگر عرب 10%

بنگلہ دیش 117,976,000' بنگالی 98%' بہاری' قبائلی 2%

باربیڈوس 260,000' افریقی 80%' قفقازی 4% دیگر 16%

بیلجیم 9,895,000' فلمینگ 55% والن 33%

بھوٹان 1,566,000 نیپالی 25%' بھوٹانی 75%

بولیویا 6,730,000' کوشوا 30%' آیمارا 25% یورپی 14% دیگر 30%

برازیل 153,771,000' پرتگالی افریقی اکثریت میں ہیں۔ دیگر قوموں میں جرمن جاپانی' عرب

وغیرہ

برونائی 372,000 ملائی 65%' چینی 20%

بلغاریہ 8,978,000' بلغاروی 85%' ترک 8.5%

بورکینا فاسو 8,941,000' والٹائک (موسی اور بوبو) اور ماندی

برونڈی 5,647,000' ہوتو 85%' توتسی 14%' توا 1%

کمبوڈیا 6,592,000' کمبوڈین 90%' ویتنامی 4%' چینی 5%

کیمرون 11,900,000' فولانی 7%' دیگر دو سو قبائل جن میں یا ملیک 30%

کینیڈا 26,620,500' برطانوی 25% فرانسیسی 24% یورپی 16% دیگر 28%

چاڈ 5,064,000' دو سو قبائل

چلی 13,000,000' میسٹزو 66% ہسپانوی 25% ریڈ انڈین 5%

چین 1,130,065,000' ہان چینی 94%' دیگر 6%

کولمبیا 32,598,000' میسٹزو 58% قفقازی 20%' مولیٹو 14%

کموروز 459,000' عرب افریقی

کانگو 2,305,000' بکانگو 45% میکی 20% دیگر 35%

کیوبا 10,582,000' ہسپانوی اور افریقی اقوام پر مشتمل ہے۔

قبرص 708,000' یونانی 78% ترک 18.7%

جمہوریہ چیک 10,400,000 چیک 98% سلواک 4% سلواکیہ 5,300,000سلواک 87%

ہنگروی 10% 52 ہزار پولش 73 ہزاریوکرائنی روسی 56 ہزار

ڈنمارک 5,134,000' سکینڈے نیوین نسل

ایکواڈور 10,506,000' انڈین 25%' میسٹزو 55%' چینی 10%' افریقی 10%

مصر 54,139,000' قدیم مصری 90%' بدوی 10%

ایل سلواڈور 5,221,000' میسٹزو 89%' ریڈ انڈین 10%

اسٹونیا 1,600,000' اسٹونین 65%' روسی 27%

ایتھوپیا 51,070,000 اور ومو 40% امہارا 25% ٹگرے 12% سیداما 9%

اری ٹیریا 3,200,000 نو مختلف نسلی گروپ

فن لینڈ 4,977,000 فن 94% سویڈش 6%

فرانس 56,184,000 مختلف یورپی نسلیں

بوسنیا ہرزی گووینا 44,00,000، مسلم بوسنیائی 44% سرب 31.0% کروٹ 17% دیگر 8%

مقدونیہ 20,00,000، مسلم 67% البانوی 19.8% ترک 4.5% سرب 2.3%

کوسوو 20,00,000، البانوی 90% سرب 6% مونٹی نیگرین 1.5% دیگر 4%

زائرے 35,330,000 بنٹو قبائل 80%

زیمبیا 8,119,000 بنٹو قبائل

زمبابوے 10,205,000، شونا 80% دیگر 19%

آذربائیجان 70,00,000، آذربائیجانی 78% روسی 8% آرمینیائی 8% دیگر 6%

قازقستان 17,101,000 قازق 40% روسی 37% جرمن 6% یوکرائن 5%

تاجکستان 5,680,000 تاجک 62% ازبک 23% روسی 8%

ازبکستان 21,626,000 ازبک 70% روسی 11%

کرغیزستان 4,567,000 کرغیز 52% روسی 22% ازبک 13%

ترکمانستان 3,838,000 ترکمان 72% روسی 9% ازبک 9%

دور جدید کا منظر نامہ یہ ہے کہ یورپ میں نسلی تضادات عروج پر ہیں نسلی قومیت نے خانہ جنگی سے بڑھ کر جنگ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جرمنی میں گنجے سروالوں نے جرمنوں اور غیر ملکیوں کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ برطانیہ میں انگریزوں کے ہاتھوں مہاجرین اور سیاہ فاموں کے ساتھ غیر انسانی سلوک جاری ہے۔ آئرلینڈ کا مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔ قوم پرستی نے سابق یوگوسلاویہ کے آزاد ممالک کو مسلسل برسرپیکار رکھا ہوا ہے اور نسلی صفائی کی مہم جاری ہے۔ ایشیائی ممالک میں بھی یہ رجحانات تیزی سے ابھر رہے ہیں اور ان کے مظاہرے جاری ہیں۔ نسلی کشیدگی کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم سے اب تک تقریباً 2 کروڑ انسان لقمہ اجل بنے ہیں جب کہ نسلی کشیدگی نے سو سے زیادہ جگہوں پر اس مدت میں جنگ کی صورت اختیار کی ہے۔

انیسویں صدی میں قوم پرستی کے رجحانات کو جو عروج ملا تھا اس کے نتیجے میں نو آبادیاتی دور کے خاتمے کا آغاز ہوا۔ اور نو آبادیاتی قوتوں نے بظاہر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر

اپنے زیر تسلط ممالک کو آزاد کیا۔ لیکن ہر جگہ قبائلی، نسلی اور لسانی وحدتوں کو چھوٹے گروپوں میں تقسیم کر کے، انہیں مختلف ممالک میں ضم کر کے اور ان کی سیاسی وحدت کو ختم کر کے دنیا میں مستقل خانہ جنگی کی بنیادیں فراہم کی گئیں۔ 1950 کے بعد سے نسلی قومیت کو فروغ دینے والوں نے نئے بننے والے ممالک کی سیاست پر موثر کنٹرول برقرار رکھنے کے بھی انتظامات کئے۔ یہ سوال بھی ابھرا کہ کسی ملک میں کون کون شہری ہیں اور کون کون شہری نہیں ہیں۔ اس ملک کے عوام کا درجہ کسے حاصل ہے اور کسے نہیں ہے۔ کیا سوویت روس میں لٹویا، ایسٹونیا، لتھوانیا کے اصل باشندوں کو وہی شہری سہولتیں یا درجہ حاصل رہا جو روسی شہریوں کو حاصل تھا یا برما میں روہنگیا کو اول درجے کا شہری قرار دیا گیا؟ ان سب سوالوں کا جواب یہ ہے کہ دنیا کے اکثر حصوں میں شہری حقوق کی بات کرنے والوں نے ہی شہری حقوق کے حق داروں کو نسلی بنیادوں پر اور پھر ان کی مذہبی وابستگیوں کی وجہ سے محروم رکھا۔ فجی میں وہاں کے آبائی لوگوں کو پارلیمنٹ کا رکن بننے کا حق نہیں تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاقت اور اختیار کی حامل نسل نے کمزور نسل کو دبا کر رکھا۔ اس سیاسی غلامی کی وجہ مذہب ہرگز نہیں تھا۔ نسل پرستی نے یہ کام کیا اور انسان کو ہم اور تم میں تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزارا۔ سیاستدانوں نے بھی نسلی گروہوں کے مفادات کے لئے زیادہ کام کیا اور ایک ملک میں مجموعی ماحول کے پیدا کرنے کے لئے اس قدر محنت شاقہ نہ کی اس لئے کہ اپنی نسل کے لوگوں کی بات کر کے اور دوسری نسل کی مخالفت کر کے ووٹ حاصل ہوتے تھے جو پارلیمان اور حکومت تک لے جاتے تھے اور آج بھی ایسی ہی کیفیت ہے۔ جمہوری نظام میں اس سلسلہ کو مزید تقویت ملی اور اس کا حلقہ اثر پھیلا۔ جو گروہ پہلے بھی غالب تھے جمہوریت نے ان کو دوبارہ غالب ہی رکھا اس لئے کہ وہ بڑی نسلوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ووٹ کے ذریعے عوامی اختیار کا حصول ممکن بنتا تھا نسلی سیاست عوام کو متحرک کرتی ہے اور آج بھی سیاستدان اسی کو اہمیت دیتے ہیں۔ جمہوری طرز پر انتخابات سے سیاستدانوں کو یہ اختیار ملتا ہے کہ وہ حکمرانی کریں کثیر الجماعتی نظاموں میں مقابلہ بھی ہوتا ہے اور اہم جماعتیں اپنی نسلی اکثریت یا اقلیت کے بل پر مخلوط حکومتوں کی بنیادیں رکھتی ہیں۔

کمزور نسلی گروہ حکومت سازی کے اس عمل سے بحیثیت گروہ باہر رہ جاتے ہیں مثال

کے طور پر بھارت میں سکھوں کی تعداد دو فیصد ہے وہ کسی مخلوط حکومت میں شامل ہونے کے لئے اتنی عددی اکثریت نہیں لا سکتے جو وزن رکھتی ہو اسی طرح سری لنکا کے تاملوں کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے جن کی مزید علاقائی تقسیم انہیں حکومت کے ایوانوں سے دور کرتی ہے۔ ان خطوں کے سیاستدان ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ اکثریت کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جو سیاسی جماعتیں چھوٹے یا اقلیتی نسلی گروہوں سے تعلق رکھتی ہیں وہ کوشش کرتی ہیں کہ وہ مختلف جماعتوں سے مل جائیں اور اپنی شناخت بھی برقرار رکھیں تاکہ ان کے نمائندے بھی پارلیمان یا حکومتی انتظام میں حصہ دار بن سکیں اور ان کی خاطر کام کر سکیں۔ نسلی بنیاد پر قائم بعض ممالک کی مثال منفرد بھی ہے۔ اسرائیل کا وجود صیہونی النسل یہودیوں کے کاز کے لئے عمل میں لایا گیا۔ عربوں کو ان کی آبائی زمینوں سے بے دخل کر کے صیہونیت کی خاطر اس ریاست کا قیام خالص نسلی معاشرے کی ایک واحد مثال ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو دوسرے درجے کے شہری بلکہ تیسرے درجے کے شہری ہونے کی وجہ سے کبھی بھی حکومت یا پارلیمان میں کسی قسم کے کردار کے ملنے کی توقع نہیں ہے اس طرح اسرائیل ایک مخصوص نسل کی اجارہ داری کی مثال بن کے سامنے آتا ہے کہ یہاں غیر یہودیوں اور عربوں کے ساتھ ہونے والا سلوک کسی بھی طرح شہری اور انسانی حقوق کے کسی ادنیٰ معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ اس مثال کے علاوہ دنیا میں کوئی اور مثال ایسی نہیں رہی جہاں مذہب بھی انسانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کا سبب بن رہا ہو۔

کینیڈا میں انگریزی بولنے والوں اور فرانسیسی بولنے کے والوں درمیان تفاوت ملکی سیاست پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ فرانسیسی اور انگریزی ثقافت کے اتصال سے یہاں اس کے اثرات کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاہم اب بھی کینیڈا میں کوبک (Quebec) آبادی کی طرف سے علیحدگی کی تحریک موجود ہے۔ خود مختاری کے مسئلہ پر 1980 کے بعد سے زیادہ جذباتی ہیجان دیکھنے میں آیا ہے لیکن 1980 کے ریفرنڈم میں علیحدگی پسندوں کو شکست ہوئی تھی۔ کینیڈا کے مسئلہ کی بازگشت دیگر ممالک میں بھی سنائی دیتی ہے بھارت کو اس کی متعدد ریاستوں کی طرف سے علیحدگی اور خود مختاری کے سوال کا سامنا ہے بھارت نے مقبوضہ کشمیر پر تقسیم ہند کے اصول کو فراموش کر کے سنگین غلطی کی تھی اسے چاہئے تھا کہ وہ اپنی وسیع نسلی، لسانی، علاقائی تفاوتوں کے پیش نظر ایک اور تضاد کو جگہ نہ دیتا اور استصواب کے

ذریعہ مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے دیتا تاکہ ان کی سیاسی محرومیوں کا ازالہ ہو سکتا۔ اب مقبوضہ کشمیر کے علاوہ بھی کئی ایک ریاستیں الگ ہونا چاہتی ہیں لیکن ان کی حیثیت نسلی' لسانی یا دیگر سیاسی علیحدگی کی تو ہے ان کا مقدمہ ویسا ہرگز نہیں ہے جو مقبوضہ کشمیر کے مقدمے کا منفرد پہلو ہے۔ اسی طرح سری لنکا میں تاملوں کے احساس محرومی کا خاتمہ کر کے انہیں قومی دھارے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

ملائیشیا میں سیاست کا توازن بھی نسلی گروہوں کے ہاتھوں میں ہے۔ 53 فیصد ملائی آبادی کو 33 فیصدی اقتصادی طور پر مضبوط چینی آبادی کے چیلنج کا سامنا ہے۔ یہاں یہ صورت ہے کہ ملائی آبادی کو آئین میں برتری حاصل ہے دیگر نسلی وحدتوں کی پہچان اور شرکت ملائی آبادی کی سیاسی برتری سے مشروط ہے۔ اور وہاں کے قانون کے مطابق اس اصول کے ذریعے دیگر وحدتوں کو لسانی' ثقافتی اور مذہبی حقوق ملتے ہیں۔ 1957 میں آزادی حاصل کرنے کے بعد سے اب تک کی حکومتیں ان تمام وحدتوں کی مخلوط حکومتیں ہی رہی ہیں۔

نسلی بنیادوں پر تقسیم معاشروں میں جمہوری اداروں کو قائم رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ جمہوری استحکام کے لئے جو وقت درکار ہے وہ نسلی تصادموں اور ٹکراؤ کی وجہ سے نہیں مل پاتا۔ اداروں کو استحکام کا موقع نہیں ملتا کہ وہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بھارت میں سکھوں کی خالصتان کے لئے تحریک اور میزورام اور ناگالینڈ کے مسائل کو دبانے کے لئے جو کوشش ہوتی رہی ہے اس میں ہندو ازم کو بنیادی محرک کا درجہ حاصل رہا ہے۔ بھارت کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو روکنے کے لئے ہندوؤں میں جذبات کو اشتعال دلانا عام روایت ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی موجودگی میں بھارت ایک ہندو سٹیٹ میں تبدیل ہوتا رہتا ہے یہ پارٹی ہندو انتہا پسندی کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رہتی ہے۔ پاکستان میں بھی سیاسی اداروں کے استحکام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ قوم پرستی کی لہر ہے جس نے ملک بھر میں ایسی پاکٹ بنا لی ہیں جن کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے راستے بھی دھندلائے رہتے ہیں۔ قومیتوں کے نعرے اور ان کی بنیاد پر قومی اسمبلی اور سینیٹ میں رکنیت حاصل کرنے کا رجحان جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بعد تیز ہوا ہے۔ الیکشن سے پہلے علم ہوتا ہے کہ سارے سیاسی عناصر کے الیکشن میں حصہ لینے کے عمل کے بعد نتیجہ کیا سامنے آئے گا۔

قومی سیاسی جماعتوں کی ہار یا جیت کے تناسب کے بارے میں کوئی بات اتنی وثوق سے نہیں کی جا سکتی جتنی نسلی اور لسانی گروہوں کے بارے میں کی جاتی ہے۔ ایسی اسمبلی اپنی آئینی مدت پوری کئے بغیر ٹوٹ جاتی ہے حکومت پریشر گروپوں کے زیر اثر قومی پالیسیوں کے بنانے میں اور ان کے بھرپور نفاذ میں ناکام رہتی ہے۔ عوامی رائے کو فیصلے کی صورت ملنے کا موقع ہی نہیں آتا اور سیاسی نظام بحرانوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ دو دو اور تین پانچ ارکان کی حمایت کے لئے سرگرداں حکومتوں سے اداروں کے استحکام کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی حالانکہ پاکستان سے باہر ایسے ممالک ہیں جہاں ایک ووٹ کی بنیاد پر بھی حکومتیں اپنی آئینی مدت پوری کرتی ہیں۔ پاکستان میں سیاست کا توازن سیاستدانوں کے ہاتھ میں ہی نہیں رہتا بلکہ اس کو پیدا کرنے اور بگاڑنے میں داخلی اور خارجی عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ عوامل نسلی اور لسانی گروہوں کو باسانی حکومتوں کو گرانے اور بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔

ان حالات میں سوال ابھرتا ہے کہ ایک وسیع البنیاد حکومت ایسے معاشروں کو سیاسی استحکام دے سکتی ہے جہاں نسلی کشیدگی بھی موجود ہو اور اداروں کی توڑ پھوڑ نہ رکتی ہو۔ وسیع البنیاد حکومت میں متضاد سیاسی نظریات کے حامل نمائندوں کا جمع ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ ملکی مفادات کے تحفظ اور ملکی ترقی کے لئے ایسی حکومتوں کا بننا ممکن ہے۔ ماریشس کی حکومت نے اپنے ہاں کی متضاد نسلی وحدتوں کو مخلوط نظام میں ڈھال کر گذشتہ بیس سال سے کامیاب سیاسی جمہوری نظام برقرار رکھا ہوا ہے لیکن وہاں نسلی وحدتیں صرف دو ہیں۔ جہاں نسلی وحدتیں زیادہ ہوں گی مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔ بڑی اکثریت والے چھوٹی اکثریت والوں کو آگے نہیں آنے دیں گے۔ سیکولر حلقے اس کا ایک حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ جیتنے والوں کو ہارنے والوں سے سب کچھ نہیں چھین لینا چاہئے بلکہ انہیں بھی شرکت اقتدار کا احساس دلانا ضروری ہے۔ عملی طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے انتہائی حساس سیاسی صلاحیت درکار ہے۔

جمہوری نظام میں رواداری اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے سوا کوئی راستہ ایسا نہیں ہے جو استحکام کی طرف لے جا سکے۔ تحمل اور زبردست قوت برداشت سے ہی معاملات سلجھ سکتے ہیں۔ ہر ملک کا مسئلہ دوسرے ملک سے مختلف ہے اس لئے کوئی عمومی اصول یا قانون وضع کرنا بہت مشکل ہے۔ انفرادی سیاسی رویوں، اجتماعی پہچان اور مخصوص

اقتصادی اور سیاسی حالات کی وجہ سے ہر ملک کی نسلی تقسیم نے عدم استحکام سے دو چار کیا ہے۔ اصلی غلطی یہی ہے کہ نسلی وحدت کی پہچان بری چیز نہیں ہے بلکہ اس پہچان کی بنیاد پر دوسروں سے تعصب مسائل کی بنیاد ہے۔

سلامتی کا مسئلہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں سلامتی کے مسئلہ نے سب سے اہم مسئلے کی حیثیت اختیار کر لی۔ سلامتی کو خطرات مذہب' مذہبی جنون یا مذہبی سرگرمیوں سے نہیں رہے بلکہ ان خطرات کی نوعیت قوم پرستی کے نسلی مظاہر سے برآمد ہوئی۔ سابقہ سوویت یونین سے لے کر مشرقی یورپ اور بلقان میں سلامتی کا مسئلہ جنگ کا منظر نامہ بن گیا۔ نسلی منافرت کے ذریعے مذہبی انتقام کی روایت کا آغاز جدید دور میں بلقان سے ہوا جب سربوں نے بوسنیا والوں پر عرصہ حیات محض اس لئے تنگ کر دیا کہ انہیں یورپ کے وسط میں ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست تسلیم نہ تھی۔ نسل پرستی کو ہوا دے کر بوسنیا کے خاتمے کی تحریک چتنک نے شروع کی اور مہذب دنیا نے سوائے ہاؤ ہو کے عملی اقدامات نہ کر کے اس تحریک بربریت کی حوصلہ افزائی کی جسے ایک صاحب قلم نے جدید دور میں بربریت کے ہم وزن سربریت قرار دیا۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جو ریاست نمودار ہو رہی تھی نسل پرستی کے ذریعے اس کے خدوخال اور جملہ جزئیات طے کرنے کی شعوری اور لاشعوری کوششوں نے آتش و آہن کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا۔ ریاست کی حاکمیت' اس کے تصور حاکمیت اعلیٰ اور حکومت و عوام کے باہمی تعلقات کو زک پہنچانے والوں نے نسلی صفائی کی مہمات چلائیں اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے مذہب کو نشانہ بنایا۔ اس کام میں اصل جذبہء محرکہ یہی تھا کہ "نئی تہذیب" کو جو مغربی تہذیب کی کوکھ سے جنم لے رہی ہے اسے مستقبل میں اسلامی تہذیب کے ان تقابلی مظاہر اور عوامل سے محفوظ کیا جائے جن کی موجودگی میں نئی تہذیب کے لئے برگ و بار لانا ممکن نہیں ہو سکتا۔ سابق سوویت یونین کے خاتمے کے بعد وجود میں آنے والی نئی ریاستوں کا اصل مسئلہ سلامتی کا مسئلہ ہی تھا۔ انہیں اپنے دفاع کے لئے جدوجہد بھی کرنا تھی اور اقتصادی سلامتی کی راہیں بھی متعین کرنا تھیں۔ ان ریاستوں میں روسی آبادی کے گہرے ارتکاز کی وجہ سے نسلی بارود بھی موجود تھا جو انہیں "قومی" مصالح کے ہم آہنگ پالیسی بنانے سے روکتا تھا جارج بش نے کویت پر عراقی قبضے کو "ختم کرانے"

کے لئے اجتماعی سلامتی کا نظریہ پیش کیا تھا تمیں سے زیادہ اقوام کی اجتماعی لشکر کشی کر کے آزادی' جمہوریت اور عالمی قانون کی پاسداری ہو سکی یا اس سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو مطلوبہ نتائج حاصل ہوئے یہ ایک الگ بحث ہے تا ہم اس اجتماعی سلامتی نے نسلی روپ دھارا اور دولت مشترکہ کے بڑے ملک کے طور پر روس نے اپنی سابقہ ریاستوں کی دفاعی اور اقتصادی سلامتی کی کلید اپنے پاس محفوظ کر لی۔ اب نتیجہ سامنے تھا--- بے چینی اور انار کی کا راج تھا کوئی بھی ریاست پرامن اور محفوظ نہ تھی اور ان انتظامات کے ساتھ مستقبل میں بھی محفوظ نہ کہلا سکے گی۔ اس صورت حال کو "جارحیت" اور "دفاع" کی جدید تعبیرات نے مزید الجھا دیا ہے' اب ہر وہ اقدام "جارحیت تصور کیا جا سکتا ہے جو کسی بھی ہمسائے ملک' نسلی اکائی یا علاقائی عامل کی طرف سے کیا جائے اور وہ عالمی بساط بچھانے والی قوتوں کے مفادات سے متصادم ہو اس قسم کی جارحیت کرنے والے کو اجتماعی سلامتی کے نظام کے تحت فوجی اقتصادی اور سماجی مقابلے کا سامنا کرنا ہو گا۔ جارحیت کی اس تعبیر میں یہ بات بھی شامل ہو رہی ہے کہ اس کا تعین کرنے کا حق جارحیت کا شکار ہونے والا نہیں کرے گا۔ بلکہ نئے عالمی انتظامات کی ضروریات کریں گی کہ واقعی جارحیت ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ "خطرہ" کیا ہے کس کی طرف سے ہے اور کہاں ہے۔ اس نوعیت کے معاملات سے شروع ہونے والا سلسلہ خطرے کو عدم سے وجود میں لانے کی تحریک بنتا ہے۔ اگر کوئی یہ نعرہ لگائے کہ "اسلام ایک خطرہ ہے جس سے عالمی امن پریشان ہے" تو "نئی تہذیب" اس کی تشریح یوں کرے گی کہ اسلام رواداری کے خلاف برسرپیکار ہے اس کے پیروکار اجڈ اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے تہذیبی نشوونما میں اپنا کردار ادا نہیں کرتے بلکہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے قوت استعمال کرتے ہیں۔ کوئی بھی یہ زحمت گوارا نہیں کرے گا کہ وہ اس ضمن میں اسلام کے اصل ماخذ اور اصل نمائندوں سے رجوع کرے اور اس "خطرے" کی اصل اثانوی معلوم کرے۔ تا ہم یہ ضرور ہو گا کہ اس خطرے کے مقابلے کے لئے اجتماعی سلامتی کے اصول کو بروئے کار لایا جائے۔

جارحیت کی تعریف سادہ ترین مفہوم میں تو یوں کی جاتی ہے کہ یہ بلا اشتعال حملہ ہے جو ایک ملک دوسرے ملک پر کرتا ہے مفادات کے تحفظ کے لئے کیا جانے والا اقدام بھی تب جارحیت بن جاتا ہے جب مخالف کے مفادات کو نقصان پہنچا کر اپنے مفادات کا حصول

مطلوب ہو۔ اسلام کہتا ہے کہ زبان سے کسی کو تکلیف دینا یا ہاتھ سے ضرر پہنچانا' دونوں جارحیت کے ضمن میں آتے ہیں۔ جسے وہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے ہی نہیں دیکھتا بلکہ قرار دیتا ہے کہ وہ شخص مسلمان ہی نہیں رہتا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرا مسلمان محفوظ نہ رہے۔ لیکن "نئی تہذیب" میں جارحیت سے مراد کچھ اور ہے۔ اس کا فیصلہ اصولوں کی نظریاتی حیثیت پر نہیں ہو سکتا بلکہ فوجی ٹیکنالوجی اور فوجی تنظیم سے اس کا فیصلہ مشروط ہے۔ سربوں کے پاس فوجی ٹیکنالوجی اور فوجی تنظیم بوسنیا والوں سے بہتر ہے اس لئے ان کی جارحیت کو آزاد دنیا یک زبان ہو کے جارحیت قرار دینے پر تیار نہیں ہے۔ آرمینیا اور آذربائیجان کے معاملہ میں بھی اس تعبیر کو بروئے کار دیکھا جا سکتا ہے۔ اہل مغرب کا کہنا ہے کہ اس قسم کی تعبیر کے تحت "دفاع" یا "دفاعی ریاست" وہ ہے جس میں جارحیت' حملہ یا جنگ مسلط کرنے کی اہلیت نہ ہو۔ جس کی فوجی تنظیم لڑاکا طیاروں' جدید ترین جنگی ٹیکنالوجی اور کمپیوٹرائزڈ نظام حرب سے لیس نہ ہو اس ضمن میں فن لینڈ' سویڈن اور سوئٹزر لینڈ کی مثال دی جاتی ہے۔ جن کی فوجی تنظیم حملہ کے لئے موزوں نہیں ہے بلکہ دفاع کے لئے موزوں ہے۔ اسی طرح جارحیت کی ایک اور تعریف یہ بھی ہے کہ جارح کی طرف سے مخالف کو تبدیل کرنے' اس کو نظام زندگی بدلنے یا بالکل اپنے مقاصد کے تحت زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے۔ اہل مغرب کا کہنا ہے کہ ایک فرانسیسی ایک جرمن کو فرانسیسی نہیں بنانا چاہتا۔ اسی طرح ایک امریکی ایک کینیڈین کو امریکی نہیں بنانا چاہتا اس لئے وہ جارحیت کے مرتکب بھی نہیں ہوتے اس کے برعکس ایک مسلمان ایک فرانسیسی کو مسلمان بنانا چاہتا ہے وہ ایک امریکی کو بھی پہلے مسلمان پھر امریکی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے مسلمان اپنے اس عمل کی وجہ سے جارح ہے اور دیگر اقوام دفاع پر مجبور ہیں۔ لیکن یہ نہیں بیان کیا جاتا کہ ایک فرانسیسی' امریکی یا جرمن عیسائی کے مقاصد کیا ہیں۔ مذہب کی نسلی تعبیر کر کے مغرب نے تصادم کے راستوں کو کھولا ہے جب کہ اسلام ایسے ہر قسم کے تصادم کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ سربوں کو بوسنیا والوں پر یہی اعتراض ہے کہ وہ بوسنیا کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں اہل مغرب نے بھی اسی لئے بوسنیا کا ناطقہ بند کئے رکھا تاکہ وہ سربوں کو یہ اختیار دے سکیں کہ بوسنیا کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے اور اس کی پارہ پارہ ہو جانے والی وحدت میں اسلامی پہچان باقی نہ رہ سکے۔ اس مقصد کے حصول

کے لئے انہوں نے طاقت اور قوت کو استعمال کر کے سلامتی کا مسئلہ کھڑا کیا ہے۔
سلامتی کے اس مسئلے میں ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ جغرافیائی محل وقوع کی اہمیت بھی سامنے آتی ہے۔ ٹیکنالوجی تو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جا سکتی ہے لیکن جغرافیائی وحدت کو دوسری جگہ نہ لے جانے کی کمی یوں دور کی جا سکتی ہے کہ اس کی وحدانی حیثیت کا خاتمہ کر دیا جائے تا کہ وہاں "نسلی ہم آہنگی" پیدا کی جا سکے۔ جغرافیائی محل وقوع کے بارے میں ایک اور پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ ایک مخصوص خطے میں مخالف ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیاروں کی موجودگی میں جغرافیائی وحدت کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے لیکن نسلی بارود ایسی وحدت کو بھی ختم کر سکتا ہے۔ جغرافیے کی سیاسی تعبیر سے حملہ کرنے والی قوتوں کو دفاع کرنے والی قوتوں پر برتری حاصل ہوئی ہے۔ نئے عالمی نظام میں جغرافیے کی یہی تعبیر اپنے مقاصد کے تعین میں فیصلہ کن عامل کے طور پر سامنے آ رہی ہے۔ ان مقاصد کا تعین اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل امریکہ کی زیر نگرانی کرتی ہے اور فوج کشی کے ذریعے مقاصد کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم دنیا کو ایک بہت بڑے سمندر سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جس میں انسانوں کے ایک جزیرے کو دوسرے انسانوں کے جزیرے سے خطرات کا سامنا ہے۔ جہاں جہاں یہ جزیرے نہیں ہیں یادور واقع ہیں وہاں ٹیکنالوجی کی حدود و قیود نے معاملہ آسان کر دیا ہے۔ اگر ایک جزیرہ دوسرے کی مدد کرنا چاہتا ہے تو ایسا باآسانی کیا جا سکتا ہے برطانیہ اور ارجنٹائن کی جنگ میں امریکہ برطانیہ کی ٹیکنالوجیکل مدد کرتا ہے اور ارجنٹائن زیادہ بہتر سپرٹ کے باوجود شکست سے دو چار ہو جاتا ہے علاوہ ازیں نسلی گروہوں کو امداد دے کر بھی دور ہونے کے باوجود جارحیت بھی کی جا سکتی ہے اور وحدت کو ختم بھی کرنا ممکن ہے۔ اگر ایک نسل کے لوگ مخالف ملک میں کثیر تعداد میں موجود ہیں تو انہیں اس ملک کے خلاف نسلی بنیادوں پر متحرک کر کے افراتفری پھیلائی جا سکتی ہے۔ تباہی لائی جا سکتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال آزاد ملکوں کی دولت مشترکہ ہے جہاں روسیوں کا وسط ایشیا کی ریاستوں میں ارتکاز ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا۔ قازقستان میں یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ جہاں قازق لوگ آزاد فیصلوں میں خود مختار نہیں ہیں بلکہ انہیں روسی النسل شہریوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا خطرہ موجود ہے اسی طرح سلامتی کے اس مسئلہ کی ایک صورت تب بھی سامنے آتی ہے جب اپنے ملک میں موجود مخالف کے افراد کو یرغمال

بنا لیا جائے یا ان کی کڑی نگرانی کی جائے جس طرح بھارت نے پاکستان کے شہری احتجاب احمد ضیاء کے ساتھ کیا۔ اس کو تمام قانونی تقاضوں کے پورا کرنے کے باوجود گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بالآخر شہید کر دیا گیا۔ اس کی نعش بھی واپس کرنے سے انکار کر کے نعش کو یرغمال بنا لیا گیا۔

سابق یوگوسلاویہ میں جاری جنگ میں سربوں کی جارحیت کے مقابلہ میں بوسنیا کی جنگی کارکردگی دیکھ کر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انکی طرف سے جواب دراصل اپنے اوپر مسلط کردہ جنگ کو روکنے کے لئے ہے تاکہ سرب علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے وہ جنگ کر رہے ہیں۔ سربوں کو حکمت عملی کے علاوہ اسلحہ اور افرادی قوت میں بھی برتری حاصل ہے۔ بوسنیا کے باشندوں کو ان کے گھربار چھوڑنے' جائیداد سربوں کے نام کرنے کی دستاویز تحریر کرنے اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنے کی شرائط پر ہجرت کی اجازت دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرب دراصل جغرافیائی مفادات بھی چاہتے ہیں۔ آرمینیا کا آذربائیجان کی سر زمین پر قبضہ اور مقبوضات سے آذری باشندوں کا انخلاء بھی اسی قسم کی حکمت عملی کا مظہر ہے۔ سربوں نے توباقاعدہ طورپر "نسلی صفائی کی مہم" چلا کر بوسنیائی باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا ہے اور دنیا نے اس مہم پر زبانی احتجاج کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ اہل مغرب اور امریکہ نے اقوام متحدہ کی زیر نگرانی "امن بحال کرنے" کے نام پر مذاکرات کا آغاز اس جنگ کو شدت دینے کے لئے ہی کیا تھا ورنہ کویت کی طرح بوسنیا سے سرب فوجوں کا انخلاء کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ جو مفادات کویت کو آزاد کرا کے حاصل ہوئے تھے ان کی بوسنیا کو آزاد کرانے کے عمل سے توقع نہیں تھی جس سے سلامتی کے مسئلہ کو پیچیدہ کرنے میں اس روش نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔

نسلی تصادم سے ملکی اور علاقائی سلامتی کو خطرات لاحق ہوتے ہیں ایک نسلی گروہ کو مسلح کر کے اور حکمت عملی دے کر دوسرے نسلی گروہ کے خلاف تیار کرنا اور پھر جارحیت کا تعین نہ کرنا ایسے تصادم کو انجام تک لے جانے میں مدد دیتا ہے۔ ان اقدامات کا نتیجہ سیاسی اور سفارتی سطح پر متضاد مفادات کے حصول کی صورت میں نکلتا ہے۔ کسی سماج میں نسلی بنیادوں پر متضاد گروہوں کی موجودگی اسے ان حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے اور مفادات کا کھیل آسانی سے کھیلا جاتا ہے۔ نظریے کی قوت ان نسلی گروہوں کی پشت پر

موجود نہ ہو تو ان کو ایک بڑی جنگ کے لئے باآسانی تیار کر دیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کی نسلی تصادم روکنے میں ناکامی بھی جارحیت اور بدامنی کو فروغ دیتی ہے۔ یہ ادارہ اقوام عالم میں امن کے قیام کے مقاصد حاصل نہیں کر سکا بلکہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دفاعی اعتبار سے کمزور اقوام کو شدید عدم تحفظ کے احساس سے دو چار کر رہا ہے۔ سلامتی کی ضمانت دینے کے لئے اس ادارے کو کسی بھی علاقے میں مداخلت کا اختیار حاصل ہے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ سہولت بجائے خود زحمت بن جاتی ہے جب امریکہ صومالیہ میں یہ کہہ کے داخل ہوتا ہے کہ وہ ایسا محض انسانی بنیادوں پر کر رہا ہے اس مداخلت کو Humanitarian Intervention کا نام دے کر اصل مقصد کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اب آ کر اس معاملے کو سنبھالے جو ہاتھوں سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ ان تمام مثالوں میں ایک بات قابل غور ہے کہ نقصان میں رہنے والا فریق عالم اسلام ہے۔ جنگ بندی اصولوں کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ جارحیت کرنے والے کے مقاصد کے تحت ہوتی ہے۔ جن سے حالات میں بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بوسنیا میں درجنوں بار جنگ بندی ہوئی لیکن ہر بار ختم ہو گئی اس لئے کہ سربوں کو حکمت عملی کے مختلف مواقع پر اس کی ضرورت تھی اور انہوں نے اس ضرورت کو اقوام متحدہ اور یورپی برادری کی چھتری تلے حاصل اور پورا کیا۔

سلامتی کے مسئلے کو نسل پرستی کے ہاتھوں ہونے والا نقصان ناقابل تصور ہے۔ اس کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ متصادم اور متحارب فریقین کو مثبت راہوں کی طرف گامزن کیا جائے۔ ان مثبت راہوں کا تعین بھی جوئے شیر لانے سے کم ہرگز نہیں ہے۔ ایک نسلی گروہ ایک راستے کو مثبت تو دوسرا اسی کو منفی قرار دیتا ہے۔ مثبت قرار دینے والا جنگی کامیابیوں کو نسلی برتری قرار دیتا ہے جب کہ منفی کہنے والا جنگی ناکامیوں کے زخم دیکھتا رہ جاتا ہے بقائے باہمی کا اصول ہی اس مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ دنیائے عالم کے امن کو قوم پرستی اور نسل پرستی کے ذریعے خراب کرنے کا آغاز کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ یہ ان کے بھی مفادات کے خلاف ہے۔

سلامتی کے مسئلے پر اس مختصر سی بحث میں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جارحیت کرنے والا فریق نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف جارحیت کی گئی ہے عالم اسلام کے مختلف مراکز میں

جاری غیروں کی جارحیت میں آرتھوڈوکس عیسائیت صیہونیت' ہندو ازم اور روسی سامراج کو بنیادی حیثیت کا حامل قرار دیا جا سکتا ہے۔ سلامتی کا مسئلہ دین اسلام کے سوا کوئی اور نظام حل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ پیغمبر اسلام آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجتہ الوداع ہی وہ اصل چارٹر ہے جو نسلی' لسانی اور علاقائی اور قومی عصبیتوں کو ختم کر کے انسان کو ایک کر سکتا ہے۔ اس بنیاد پر سلامتی کے جدید مسائل کا حل تلاش کرنے والوں کو بنیاد پرست کہہ کے مسترد کرنا سیاسی مصالح کے تحت کسی کی ضرورت تو ہو سکتی ہے تاہم عقل و دانش اور دلائل کے ضرورت مندوں کو اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو گا۔

نسلی صفائی کی مہم سابق سوویت یونین میں نسلی گروہوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جبری منتقل کرنے کے عمل کو ETHNICHESKOYE کہا جاتا ہے جب کہ جرمن نازیوں نے اس مقصد کے لئے ENDLOSUNG کی اصطلاح استعمال کی۔ یہ اصطلاحات انگریزی زبان کے الفاظ ETHNIC CLEANSING کے مفہوم کو کافی حد تک ادا کرتی ہیں۔ جرمنی نازیوں کی ENDLOSUNG سے مراد آخری یا حتمی حل مراد لیا جاتا تھا۔ دور جدید میں نسلی صفائی Ethnic Cleansing کی مہم بڑے زور و شور سے بوسنیا ہرزی گووینا کے خلاف دیکھنے میں آئی یوگوسلاویہ کے خاتمے کے بعد بوسنیا ہرزی گووینا نے الگ ملک کی حیثیت سے شناخت قائم کی تو اس کے خلاف سربیا اور کروشیا نے یہ مہم شروع کی جس کا مقصد بوسنیا سے بوسنیائی نسل کا خاتمہ' یورپ کے وسط میں اسلامی ملک کو روکنا اور اس کی مسلم آبادی کو نسلی بنیادوں پر ختم یا منتقل کرنا شامل تھا۔ انسانی آبادیوں کا قتل عام' شہریوں کا جبری انخلا' جائیدادوں پر قبضے اور انتقام کے خوفناک طریقوں پر مشتمل نسلی صفائی کی یہ ہولناک مہم مہذب دنیا کی بے حسی اور نسلی تنازعات میں اس کی ترجیحات کی منہ بولتی تصویر بن گئی۔ خود مغربی ذرائع ابلاغ نے لکھا کہ یہ تاریخ کے ہولناک ترین واقعات ہیں جو سربوں اور کروٹوں نے مسلمانوں کے خلاف نسلی منافرت کے تحت کئے۔ ایک رپورٹ میں لکھا گیا کہ

"پچھلے موسم بہار میں شدید مظالم ڈھائے گئے جب سربیائی فوجوں نے نئی آزاد مملکت بوسنیا ہرزی گووینا کے خلاف نسلی صفائی کی مہم کا باقاعدہ آغاز کیا۔ سربوں نے دس لاکھ سے زیادہ مسلمانوں اور کروٹوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا۔ ان میں سے کچھ تعداد

اذیتیں دے کر ہلاک کر دی گئی جب کہ بقیہ کو شدید دہشت زدہ کر دیا گیا"۔1

نسلی صفائی کی اس مہم کے بارے میں مغرب نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ رسل واٹسن نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ

"مغرب نے بلقان کو اس کی قسمت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر کے ترک کر دیا ہے۔ نیٹو نے منصوبہ بنایا تھا کہ پچاس ہزار فوجیوں کو سابق یوگوسلاویہ میں امن قائم کرنے کے لئے بھیجا جائے لیکن نیٹو کے سیکرٹری جنرل مینفریڈ وارنر نے کہا کہ امریکی شمولیت کے بغیر فوجوں کو ایسی مہم پر انہیں بھیجا جا سکتا۔ کلنٹن صومالیہ میں امریکی مہم کی ناکامی کی وجہ سے فوجی حل کے ذریعے امن قائم کرنے کی غرض سے امریکیوں کو بھیجنے پر تیار نہیں ہیں"۔2

سربوں نے نسلی صفائی کی جو مہم شروع کی تھی اس نے بوسنیا ہرزی گووینا میں ہر طرف آگ و خون اور موت کی حکمرانی قائم کر دی تھی۔ انتہائی منظم طریقے سے انسانوں کا قتل عام کیا گیا۔ دنیا محض زبانی جمع خرچ ہی کر سکی اور یہی کہتی رہی کہ اس قسم کے واقعات دوبارہ نہیں ہونا چاہئیں۔ لیکن دنیا نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ دوبارہ سے پہلے کے مرحلے---- یعنی بوسنیا میں جاری قتل عام کو--- کسی طرح رکوایا جائے۔ عالمی ضمیر اس مرحلے میں ناکام رہا۔ صدائے بازگشت کے سوا کوئی صدا بھی تو بلند نہ ہو سکی اور نسل پرستوں کے گروہ انسانیت کے سر، بازو اور دھڑ گاجر مولی کی طرح کاٹ کے پھینکتے رہے۔

تاریخ کے اس المیے کا ہر پہلو بہت خوفناک اور انسانی زندگی پر ایک بہت بڑا داغ ہے۔ مغرب میں اس المیے کے بارے میں احساسات کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ سربوں کے ہاتھوں بے گھر ہونے والے، اپنے عزیزوں اور پیاروں سے بچھڑنے والے، سربوں کی گولیوں او بے رحم خنجروں کے نشانہ بننے والے قدرتی مصائب کا بھی شکار ٹھہرے۔

"ایندھن اور پانی زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں جنگل اور پارک درختوں اور جھاڑیوں سے محروم ہوتے گئے (سردی کی شدت سے بچنے کے لئے بوسنیا کے لوگوں نے درختوں اور جھاڑیوں سے حرارت حاصل کرنے کی جدوجہد کی۔ پانی کے ذخیرے ختم ہوئے تو

گندے پانی کے جوہڑوں کو خالی کیا جاتا رہا۔ خالی جگہوں کے گرد مٹی کے بند باندھ کر بارش کے پانی کو ذخیرہ کیا جاتا' مرد پہرہ دیتے اور عورتیں اپنے برتن اس پانی سے بھرتیں"۔ 3

انسانی خوف و دہشت اور فطری آفات کے شکار یہ لوگ پناہ کے لئے جگہ تلاش کرتے لیکن انہیں جائے امان بھی نہ ملتی۔ مغربی ممالک نے سرحدیں بند کر دیں کڑے پہرے بٹھا دیئے۔ بوسنیائی مہاجرین کو قبول کرنے سے مہذب یورپ نے انکار کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ سارا یورپ بوسنیائی نسل کے مکمل خاتمے پر متفق ہو چکا ہے۔ اسی دور کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ

"یورپی یونین کی ایک انتہائی اعلیٰ اختیاراتی خفیہ کمیٹی ایک ایکشن پلان تیار کر رہی ہے۔ جس کے ذریعے سردی کے موسم میں بوسنیا اور دیگر ریاستوں سے لاکھوں مہاجرین کے داخلے کو نا ممکن بنایا جائے گا۔ یورپی یونین کے ایک افسر نے کہا کہ اس وقت بوسنیا میں چالیس لاکھ مہاجرین موجود ہیں جو سردی کے شدید موسم کی وجہ سے یورپی ممالک میں داخل ہونا چاہتے ہیں' یونین کی سرحدوں کو مزید سخت کرنے کے لئے اس K-4 کمیٹی کے سامنے چھ راستوں میں سے یہ ایک راستہ ہے یہ کمیٹی یونین کے بارہ ممالک کے داخلہ اور انصاف کی وزارتوں کے ایسے افسروں پر مشتمل ہے جن کے نام خفیہ رکھے جا رہے ہیں۔ اس کمیٹی کو ماسٹرخ معاہدے کے تیسرے ستون کے اصول کے تحت بنایا گیا ہے یہ کمیٹی صحافیوں اور انسانی حقوق کے لئے کام کرنے والے کارکنوں کی دسترس سے باہر ہے حتیٰ کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کو بھی اس کی سرگرمیوں کا علم نہیں ہے۔ برطانیہ اور فرانس نے عہد کیا ہے کہ اس کمیٹی کے کام کو خفیہ رکھا جائے گا"۔

بوسنیا کے ایک گاؤں سٹپنی ڈو (Stupni Do) پر جو بیتی وہ بھی تاریخ انسانی کے الم ناک ابواب میں سے ایک ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اس سانحہ کی خبر دیتے ہوئے لکھا کہ اس گاؤں کے افراد کے لئے یہاں کی واحد کروٹ رہائشی اینا لیچے کی گمشدگی خطرے کا الارم تھی جو ایک مسلمان کی بیوی تھی۔ وہ اپنے بچوں سمیت اچانک غائب ہو گئی تھی۔ اس گاؤں میں یہ خبر بہت تیزی سے پھیلی تھی یہاں کے لوگوں کے نام کا پہلا لفظ مشترکہ تھا۔ ان کی کل تعداد دو سو پچاس تھی۔ جب ان کے گاؤں پر پہلا مارٹر آ کے گرا تو 36 افراد نے محفوظ بنکروں میں مورچے سنبھال لئے وہ اپنی چھوٹی رائفلوں سے مسلح تھے چند ایک کے پاس

اے کے 47- رائفلیں تھیں۔ کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ اس بار توپ خانے سے زبردست گولہ باری ہو گی۔ شدید گولہ باری نے اس گاؤں کے محافظوں کو دو گھر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ چھ سو کروٹوں کو گاؤں میں داخل ہونے سے روکنا چاہتے تھے انہوں نے گاؤں کی سو کے قریب عورتوں اور بچوں کو دو گھروں کے تہہ خانوں میں چھپا دیا۔ اسی دوران میں بیس سے چالیس تک کرٹوں کی ایک پلٹن گاؤں کی سب سے بڑی گلی میں داخل ہوئی انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے ان کے چہروں پر گریس ملی ہوئی تھی جس کا مقصد اپنی شناخت کو پوشیدہ رکھنا تھا۔ لیکن بہت سے لوگوں نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا وہ قریبی گاؤں واریز کا ایک سپاہی تھا ان میں گاؤں کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے والے بعض افراد بھی تھے۔ وہ سب پکار رہے تھے۔ "آؤ مسلمانوں کو قتل کریں--- ہم تمام خوبصورت لڑکیوں کی عصمت دری کریں گے کہاں ہیں وہ لڑکیاں انہیں باہر لاؤ"۔ پھر یکدم قتل عام شروع ہو گیا۔ اپنے گھر میں بیوی کے ساتھ چھپا ہوا ابراہیم زندہ جل رہا تھا اور اس کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اس کی بیوی کو بھی زندہ جلا دیا گیا یہ بات ز-نیتا ٹیکچ نے بتائی جو اپنے دو بچوں کے ہمراہ اس دوزخ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ قریبی گاؤں دیراون پہنچی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ والے گھر میں دو کروٹ فوجی ایک عورت کی آبرو سے کھیل رہے تھے ایک اور ہمسائی کو بھی یہ دھمکی دے کر بے آبرو کر دیا گیا کہ وہ اس کے خاندان کے افراد کو مار ڈالیں گے۔ لوگ زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے وہ التجا کر رہے تھے برائے مہربانی ہمیں مت مارو ہم معصوم ہیں اور زینیتا درختوں کے جھنڈ میں کھڑی ان کی آخری التجائیں سن رہی تھی۔

کروٹوں کی اس پلٹن نے بچوں کی کھوپڑیاں دیواروں سے ٹکرا کر توڑ دیں عورتوں کو ذبح کر دیا اور خاندانوں کے خاندان قطار میں کھڑے کر کے مشین گن کے ذریعے بھون ڈالے۔ اگلی صبح مزید کروٹ کمک آئی اور اس نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ اس نے گاؤں کے باون گھروں کو آگ لگا دی اور مسجد کو ڈائنا مائیٹ سے اڑا دیا۔ صرف 48 گھنٹوں میں سٹینی ڈو گاؤں صفحہ ہستی سے اپنے باسیوں سمیت مٹ گیا تھا۔

"فرانس کے برنارڈ کا چنر نے کہا کہ بوسنیا کو اس افسوس ناک موڑ پر لانے میں یورپ کی سیاسی جرات مکمل نہ ہونے نے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ برنارڈ فرانس کا صحت اور

انسانی معاملات کا سابق وزیر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم نے یورپ کے قلب میں بوسنیا کے مسلمانوں کو مرنے دیا ہے۔ ہمیں آخر کار اس بارے میں جواب دینا ہو گا۔

اگر بوسنیا کو بچانا ممکن نہیں ہے تو ہمیں اس بات کی کوشش ضرور کرنا ہو گی کہ ہم اس تاریخی غلطی' غلط اندازوں اور رویوں کے بارے میں سوچیں تاکہ یہ آئندہ نہ ہو سکیں جن کی وجہ سے بوسنیا کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر اور مورخ البرٹ ہول سٹیڑ نے کہا کہ بوسنیا والوں کو کمزور جمہوریتوں کی وجہ سے یہ آزمائش برداشت کرنا پڑی ہے۔ اس کی ذمہ داری یورپ کی ناکام سفارت کاری اور بھیانک غلطی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یورپ کا ہر اقدام غلط سمت میں تھا جس نے آہستہ آہستہ معاملے کو خراب سے خراب کر دیا۔ یورپ جارحیت کی حمایت کرتا رہا اور اس کا شکار ہونے والوں کو سزا دیتا رہا۔"۔ 5

نسلی صفائی کی اس مہم میں وہ لوگ بھی برابر کے ذمہ دار ہیں جو جبروتشدد کو جاری بھی دیکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ دوبارہ ایسا سانحہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے نزدیک پہلا سانحہ جائز ہے اس کو روکنا درست نہیں ہے۔ انسان زندگی کے ساتھ اس قسم کے مذاق کی گنجائش صرف نسلی بنیادوں پر لوگوں کو ہلاک کرنے والوں کو ہی مناسب لگتی ہے ورنہ مہذب دنیا میں مظلوم کی بروقت مدد پہلی کڑی ہے جہاں سے مدد اور تعاون کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ یورپ کی وابستگیاں تو جارحیت کا ارتکاب کرنے والوں کے ساتھ ہیں جیساکہ اس رپورٹ سے ظاہر ہے جس میں صاف کہا گیا ہے کہ "اہل یورپ کے پاس اس المیے کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی ترجیحات طے کر رکھی ہیں۔ جرمنوں نے اپنی پسند کے مطابق کروٹوں کے ساتھ تعلق قائم کر رکھا ہے۔ فرانسیسی اور روسی سربوں کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بات برطانیہ کے وزارت خارجہ کے ایک افسر نے کہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سربوں نے سب سے زیادہ جارحیت کا ارتکاب کیا ہے لیکن کسی کے بھی ہاتھ خالی نہیں ہیں۔"۔ 6

یورپ کے پاس یقیناً اس المیے کا کوئی بھی جواب نہیں ہو گا۔ لیکن وہ اس المیے کو جاری رکھنے کا مجرم ضرور ہے۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کے واقعات کو بھی قابل اعتنا نہ سمجھا تو اس کی کوئی وجہ تو ہو گی ایک نسل کو تبدیل

کرنے کے لیے دوسری نسل کی طرف سے اس کی عورتوں کی بے حرمتی کی اتنے وسیع پیمانے پر مثالیں تاریخ میں نہیں ملتیں۔ دنیا میں نسلی تنازعات کو سیاسی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر عمل پیرا ہونے کی یہ روش بہت ہی خطرناک نتائج سے سامنے لائے گی جن کا ابھی یورپ کو بھی درست اندازہ نہیں ہے کہ مردوں کو قتل کر کے عورتوں کو محض ہوس کا نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ ان کی عصمت دری کر کے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ مقررہ مدت تک حمل کو گرنے یا ضائع ہونے سے بچائیں تاکہ وہ سرب اور کروٹ بچوں کو جنم دے سکیں۔ اگلی نسل کو جبری طور پر تبدیل کرنے کا یہ عمل بھی مہذب یورپ میں ہوا۔ ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ

"سربوں کی طرف سے نسلی صفائی کے دوران بہت بڑے پیمانے پر اذیتیں دے کر بوسنیائی لوگوں کو قتل کیا گیا۔ اس کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ سربوں نے تیس سے پچاس ہزار کے لگ بھگ عورتوں کو بے آبرو کر دیا ان کے ساتھ اجتماعی زیادتی کا ارتکاب کیا گیا۔ ان میں سے ایک بڑی اکثریت مسلم عورتوں کی تھی۔" ے 7

اس رپورٹ میں یہ سوال کیا گیا کہ کیا سربوں نے عصمت دری کی پالیسی باقاعدہ منصوبہ کے تحت اختیار کی۔ کیا انہوں نے واقعی عصمت دری کو بوسنیا کے لوگوں کی نسل تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جیسا کہ بوسنیا کے وزیر خارجہ (بعد میں وزیراعظم) حارث سلاجک نے کہا امریکی حکومت کے ماہرین کے حوالے سے اس کا جواب دیا گیا کہ انہوں نے ابھی تک سربیا یا بوسنیائی سربوں کی قیادت کی طرف سے فوجیوں کے نام کوئی ایسا حکم نہیں سنا یا پڑھا ہے لیکن یہ ضرور دیکھنے میں آیا ہے کہ جنگ میں مصروف سرب کمانڈروں نے اس حکمت عملی کو وسیع پیمانے پر ضرور اختیار کیا۔ بعض جگہوں پر احکامات بھی جاری ہوئے۔ اور سربوں نے بوسنیائی خواتین کو بے آبرو کیا۔ جن عورتوں کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی اور پکڑے جانے والے سربوں نے جس انداز سے ان جرائم کا اقرار کیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ محض اتفاقی یا حادثاتی نہیں تھا۔ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک محقق کا کہنا ہے کہ یہ بات تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ سرب فوجی کسی سات سالہ لڑکی کو دیکھتے اور اسے پکڑ کر بے آبرو کر دیتے۔ دراصل عصمت دری نسلی صفائی کا ایک مربوط حصہ تھا۔ جس کا مقصد یہ ہی تھا کہ انتہائی سفاک طریقے سے مسلمانوں کو ان کی

مکمل آبادی سمیت نیست و نابود کر دیا جائے اس قسم کی رپورٹیں جن دیہی آبادیوں سے بہت کثرت سے ملتی رہیں ان میں برچکو' بیلینا' گلچ' سانسکی موست' پلیدور' واروز' زوارنک شامل ہیں۔

نسلی صفائی کرنے کے ان مظاہروں کو دوبارہ نہ دھرائے جانے کا دنیا کا عزم بظاہر ایک اچھی بات ہے لیکن جب نسلی تنازعات کی مذہبی تعبیر کر کے کہیں سے کسی ایک فریق کو ختم کرنا مقصد ٹھہرتا ہے تو اس سے زیادہ خطرناک صورت حال کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ آیئے اس بات کا جائزہ لیں کہ ایسے معاملات میں "بیرونی مداخلت" کے کیا اثرات پڑ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ امکان ذہن میں رکھنا چاہئے کہ مغرب اور امریکہ چاہتے تو بوسنیا میں نسلی صفائی کی اس مہم کو بہت پہلے روکا اور ختم کیا جا سکتا تھا۔

بیرونی مداخلت کے امکانات بوسنیا میں نسلی صفائی کی مہم کو روکنے کے لیے امریکہ کے ساتھ ساتھ یورپ کی رضامندی کو بھی اہم قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں اس میں ایک اور اہم عنصر روس کا بھی تھا جو سربوں کی حمایت کرتا تھا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا میں نسلی تنازعات کا حل یوں آسان تھا کہ ایک سپر طاقت ہونے کی حیثیت سے امریکہ دنیا کی قیادت کرنا چاہتا ہے اور روس کو ایک ساجھے دار کے طور پر ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے جس کی حیثیت برابری کی نہیں بلکہ ایک چھوٹے اور نسبتاً کم حیثیت کے حامل اتحادی کی ہے۔ روس کو بوسنیا میں کھلی چھٹی دی گئی۔ اس کی وجوہات کیا تھیں انہیں روس کے بارے میں امریکی پالیسی کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

دنیا میں یہ بات اب عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اشتراکی خطرے کے خاتمے کے بعد اور جمہوریت کی خواہش کے بے لگام ہونے سے نسلی تنازعات نے تیزی سے سر اٹھایا تھا۔ نسلی مسئلے کو پہلے آمریت کی حامل حکومتیں آسانی سے دبا دیتی تھیں۔ جب یہ آمریت نہ رہی تو دبانے کی روش کمزور پڑ گئی۔ اس میں ایک اور عامل نے بھی اثرات چھوڑے ہیں۔ سرد جنگ کے بعد دنیا نے انسانی حقوق کی بات کرنے کے بجائے ان حقوق کو بزور اور سیاسی و سفارتی دباؤ کے ذریعے منوانا شروع کیا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے بغاوت کے بیج بوئے گئے اور نسلی وحدتوں کو بغیر کسی منصوبہ بندی اور پروگرام کے محض نسلی حقوق حاصل کرنے پر اکسایا گیا۔

سری لنکا میں تامل آبادی کو نسلی حوالوں سے زیادہ متحرک کرنے میں سنہالی حکومت کی زیادتیوں کے ساتھ ساتھ بیرونی عناصر کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ سری لنکا کا نسلی مسئلہ ان غیر ملکی عوامل کی دلچسپی کی وجہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ جنہوں نے وہاں اپنے مخصوص مفادات کا تحفظ چاہا تھا۔ 1980 کے عشرے میں شدید نسلی تناؤ کے بعد حالات بالکل خراب ہوتے چلے گئے۔ 1960 میں سری لنکا میں دو زبانوں کو ترک کر کے صرف سنہالی زبان کو سرکاری قرار دیا گیا۔ تب بھی تاملوں میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ تاملوں کے خلاف امتیازی سلوک نے نسلی بنیادوں پر انہیں منظم ہونے کا راستہ دکھایا۔ بھارت نے تاملوں کی بڑھتی ہوئی متنازعہ حیثیت کو آگ دکھائی۔ اس نے اپنے صوبہ تامل ناڈو کو نسلی اعتبار سے سری لنکا کے تاملوں کے زیادہ قریب محسوس کیا۔ سری لنکا میں گڑبڑ کی وجہ سے ہزاروں تاملوں نے تامل ناڈو کا رخ کیا۔ صرف 1983 میں ایک لاکھ کے قریب تامل مہاجر بن کے بھارت کے صوبے میں آگئے تھے۔ بھارت نے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کے اقدامات سے سری لنکا میں سیاسی عدم استحکام میں اضافہ ہو گا۔ اس نے خود کو خطے کی ایک بڑی قوت قرار دے کر اس مسئلے کو خود حل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یہ ایک غلط فیصلہ تھا جو اپنے بارے میں اندازوں پر مبنی تھا۔ سری لنکا کی حکومت نے دباؤ میں آکر اس وقت بھارت کو فوجی مداخلت کی دعوت دے دی جب 1987 میں تاملوں نے جافنا میں سول انتظامیہ کا کنٹرول سنبھالنے کا اعلان کیا۔ سری لنکا کی فوج نے اس علاقے کا مکمل محاصرہ کر لیا۔ جو پانچ ماہ تک جاری رہا۔ بھارت نے تاملوں کی مدد کے لیے فضائی سروس کی اور جہازوں کے ذریعے خوراک اور دیگر اشیاء وہاں گرائیں اس وقت تک اس کا سری لنکا کی حکومت سے کوئی معاہدہ بھی نہیں ہوا تھا۔ سری لنکا نے جب یہ محسوس کیا کہ بھارت اس کی خودمختاری کو فراموش کر کے مداخلت کر رہا ہے تو اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ وہ بھارت کی شرائط پر معاہدہ کر لے۔ بھارت نے پہلے سات ہزار فوجی علاقے میں بھیجے جن کی تعداد بعد میں بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ بھارت کی طرف سے کہا گیا کہ وہ تاملوں کو غیر مسلح کرنے کا کام کرے گا لیکن عملی طور پر بھارت نے تاملوں کو گوریلا تربیت بھی دی اور انہیں دوسرے تاملوں کے خلاف برسرپیکار کر دیا۔ بھارتی فوج کے اقدامات سے تین ہزار شہری مارے گئے۔ بھارت نے جن تامل گروپوں کو غیر مسلح کیا بھی تھا انہوں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے دوبارہ اسلحہ حاصل

کر لیا۔ تاملوں نے محسوس کیا کہ بھارت کی امن فوج دراصل ایک تامل گروپ ELAM PEOPLE'S REVOLUTIONARY LIBERTATION FRONT (EPRLF) کے ساتھ ہمدردیاں ہی نہیں رکھتی بلکہ اسے مکمل سپورٹ کرتی اور اسلحہ دیتی ہے۔ سری لنکا میں بھارتی فوج کے خلاف ہر گروہ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہوا۔ تامل ٹائیگرز ایلام نے بھارتی فوج کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ بالآخر 1989 میں سری لنکا نے بھارت سے اپنی افواج نکالنے کا مطالبہ کر دیا۔ بھارت کی فوج سری لنکا کے تمام نسلی گروہوں کی مشترکہ دشمن ٹھہری۔ بھارتی افواج سری لنکا سے واپسی پر (EPRLF) کے اتحادیوں کو ساتھ لے گئی اور میدان تامل ٹائیگرز ایلام (LTTE) کے لئے کھلا چھوڑ دیا۔

اس تجربے نے ثابت کیا کہ بھارتی عزائم سری لنکا میں کشیدگی کے خاتمے کے نہیں تھے اس لیے کہ اس کے پاس اس کشیدگی کو ختم کرنے کا کوئی ٹھوس پروگرام نہیں تھا۔ بھارتی فوج خطے میں پہلے کارروائیاں کرتی رہی "را" کی سرگرمیاں بھی جاری رہیں اور بعد میں وہ باضابطہ داخل ہو گئی۔ یہ ایک مکمل ناکام پروگرام تھا۔ سری لنکا کے شمالی صوبہ جات میں امن قائم نہ ہو سکا اور نسلی تنازعہ مزید الجھ گیا۔ وہاں تامل مزید مضبوط ہو گئے اور مستقبل میں سری لنکا کی حکومت کے لیے انہیں روکنا یا ختم کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس قسم کی بیرونی مداخلت سے نسلی تنازعات کے حل میں کیا مدد مل سکتی تھی۔ چنانچہ سری لنکا میں بھی نسلی صفائی کی مہم آج بھی جاری ہے۔ سرکاری افواج تاملوں پر حملے کرتی ہیں سرکاری ذرائع سے ان پر حملوں کا جواز پیش کیا جاتا ہے جبکہ وہ سنہالی اور مسلمان آبادیوں کو جوابی طور پر نشانہ بناتے ہیں۔ کیا بوسنیا میں اس قسم کی مداخلت سے سربوں کو نسلی صفائی سے روکا جا سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے تاہم یہ بات مدنظر رہنا ضروری ہے کہ بوسنیا اور سری لنکا کے مسائل میں ذرہ برابر مماثلت موجود نہیں ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا اس کا ہم مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔

اقوام متحدہ نے خطے میں امن کے لیے چودہ ہزار فوجی پہلے کروشیا بھیجے۔ ان میں پولیس اور مبصرین شامل تھے۔ مارچ 1992 میں انہیں اس مقصد کے لیے تعینات کیا گیا کہ وہ سربوں اور کروٹوں کے درمیان 1991 کی جنگ کے بعد ہونے والی جنگ بندی کی نگرانی کریں۔ امن فوج نے چار محفوظ علاقے قائم کر کے خود کو ان علاقوں میں تقسیم کر لیا جو

کہیں کہیں سے سرب سرحدوں سے ملتے تھے۔ اس فوج کا مقصد محض یہ تھا کہ مذاکرات کے لیے ماحول کو سازگار رکھا جائے۔ امن فوج ان محفوظ علاقوں میں بھی اپنا حکم منوانے میں ناکام رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود اقوام متحدہ میں سربوں کے حامی موجود تھے جن کی وجہ سے سربوں کی نسلی صفائی کی مہم جاری رہی حتیٰ کہ نومبر1992 میں اقوام متحدہ نے اس بات پر غور شروع کر دیا تھا کہ وہ امن فوج کو نکال لے۔ اسی دوران اس فوج کو بوسنیا ہرزی گووینا میں بھی ذمہ داری دے دی گئی۔ اس ذمہ داری میں صرف یہ بات شامل تھی کہ یہ امن فوج بوسنیائی محصورین کو انسانی بنیادوں پر امداد پہنچانے کا کام کرے گی۔ گویا نسلی صفائی روکنے کی ذمہ دار نہ تھی۔

اقوام متحدہ کا کام محض یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ لوگوں کو غذا فراہم کرتی رہے اور انہیں مرنے کے لیے تیار کرتی رہے بلکہ سلامتی کونسل کو جارحیت کا یقین کر کے جارح کے خلاف باقاعدہ ویسا ہی ایکشن لینا چاہیے تھا جیسا کہ کویت پر عراقی حملے کے خلاف لیا گیا۔ لیکن ایسا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ سلامتی کونسل کے ارکان ایسا نہیں چاہتے تھے وہ بیرونی مداخلت کے ذریعے مسئلہ کا حل نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کا مطمع نظر صرف "انسانی بنیادوں " پر غذائی امداد کی فراہمی تھا سلامتی کونسل تو یہ بھی نہ کر سکی کہ کم از کم بوسنیا کے لوگوں کو حفاظت خود اختیاری کے حق کے تحت اسلحہ حاصل کرنے کی اجازت ہی دے دیتی۔ اس سارے المیے نے ثابت کیا کہ جہاں تک سربوں کا اسلحہ چل سکتا تھا اور جب تک اہل بوسنیا قتل کیے اور بے گھر کئے جا سکتے ہیں اس جنگ کو جاری رہنا تھا۔ جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات تھی' جسے نسلی صفائی کی مذہبی تعبیر دے کر مزید سخت کر دیا گیا۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ نسلی تنازعات ایک بار شدت اختیار کر جائیں اور نوبت جنگ و جدل تک آجائے تو ان میں صلح کرانے' بیرونی مداخلت سے انہیں حل کرنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ ایسے معاملات سیاسی جبر سے پیدا ہوتے ہیں اور سفارتی جبر کی وجہ سے جنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جب بھی دنیا میں نسلی بنیادوں پر انسانیت کو لڑایا جائے گا تو باہم متصادم گروہوں کو کسی نہ کسی طاقت ور بلاک یا ملک کی حمایت مل جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں سفارت کاری کا عمل مہذب سفارت کاری نہیں رہا ہے۔ الفاظ کی یہ جادوگری انسانی بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں بچتا۔

یورپ کو مکمل طور پر عیسائی تہذیب کا مرکز بنانا اہل یورپ کی ضرورت ہو سکتی ہے لیکن جن نسلی وحدتوں کو وہ برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ ان کو صفحہ ہستی سے مٹانے' ان کی مذہبی تعبیر کر کے دیگر وحدتوں کو اس کے خلاف برسرپیکار کرنے سے معاملات حل نہیں ہو سکتے۔ یورپی یونین میں یہ رکاوٹ ہمیشہ برقرار رہے گی اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ یورپ نے سرمایہ داری کو مستقبل قرار دے کر ساری دنیا میں جو پالیسی اختیار کی ہے اس سے وہ کرنسی کے اتحاد کی منزل پانا چاہتا ہے اقتصادی غلبہ اور کساد بازاری کے متضاد نعروں سے اس کی مستقل کی اقتصادیات کیونکر نجات پا سکتی ہیں۔ لوگوں کو محض معاشی بنیادوں پر متحرک کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے عظیم تر یورپ یا دوسرے لفظوں میں کرسچن ڈیموکریٹس کے عظیم تر عیسائی مرکز کی خواہش کو پورا کرنے کے تقاضے اور ہیں۔ لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ سرمایہ داری کا گزارہ جدید عیسائیت کے ساتھ ہو سکتا ہے جس کو سامنے لانے کے لیے عالم اسلام کے خلاف جنگ و جدل جاری ہے نسلی صفائی کی بوسنیا میں مہم اس کا ایک ٹریلر ہے اس کی فلم دنیا کے ایسے خطوں میں چلنے کا خطرہ ہے جہاں مسلمانوں کو دبانا مقصود ہے یوں لگتا ہے کہ بنیاد پرستی کے نعرے سے عالم اسلام کو تقسیم کر کے مستقبل کے ایسے ہی ہولناک مناظر کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے تاکہ اسلام پر عمل کرنے کو دقیانوسی رویہ سمجھنے والے مسلمان راسخ العقیدہ مسلمانوں کی طرف سے جوابی مزاحمت کو کم یا ختم کر سکیں یہ نوشتہ دیوار ہے جسے ابھی سے پڑھ لینا بہتر ہو گا۔

1- نیوز ویک — 17 اگست 1992ء

2- نیوز ویک — یکم نومبر 1993ء

3- ٹائم — 26 جولائی 1993ء

4- The News — 26 نومبر 1993ء

5- ٹائم — 26 جولائی 1993

6- نیوز ویک — 12 اگست 1992ء

7- نیوز ویک — 11 جنوری 1993ء

۱۱

انسانی حقوق کا مسئلہ

- اخلاقیات سے تعلق
- نظریہ ارتقاء اور انسان
- مذہبی تعبیر
- فطری حقوق سے انسانی حقوق تک
- انسانی حقوق کی تعبیر
- اقوام متحدہ کا چارٹر
- انسان۔ اسلام کی نظر میں
- اقوام متحدہ کا کردار
- چین اور امریکہ میں کشمکش
- سوڈان کے خلاف مہم
- مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی صورت حال
- خلاصہ کلام

انسانی حقوق کا مسئلہ

بین الاقوامی سیاسیات میں انسانی حقوق کا مسئلہ بھی ایک اہم اور سیاسی معاملہ بن گیا ہے۔ اقوام عالم کے درمیان انسانی حقوق کے موضوع پر بحث بھی جاری ہے اور وہ اس کی نوعیت و اہمیت، طریقہ کار، حدود اور دائرہ کار پر بحث کر رہی ہیں۔ امت مسلمہ میں بھی یہ مسئلہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی طرح اسلامی ممالک بھی یورپی اور امریکی دباؤ کا شکار ہیں اور انسانی حقوق کے نام پر ان کے ساتھ امتیازی سلوک کی پالیسی اختیار کی جا رہی ہے۔ کنڈا ڈکشٹ نے اپنی ایک رپورٹ میں اقوام عالم میں اس مسئلہ پر اختلاف رائے کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مغرب کی طرف سے انسانی حقوق کے مسئلہ پر اخلاقیات متعارف کرانے سے ایشیائی اقوام میں جو رد عمل ابھرا ہے اس کی وجہ سے ایشیا کی ترقی کرنے والی اقوام کا موقف ہے کہ موجودہ تعریف دراصل مغربی تعریف ہے انسانی حقوق ان کی تہذیب اور ثقافت میں بھی اہم مقام رکھتے ہیں اس لیے وہ مغربی تعبیر کے بجائے انسانی حقوق کی وہی تعبیر کرنا چاہیں گی جو ان کے ہاں رائج ہے۔ اس مسئلہ پر سنگا پور، انڈونیشیا، ملائیشیا اور کسی حد تک چین اب صنعتی ممالک کے سامنے کھڑے ہیں اور مغرب کے اس موقف کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس کا انسانی حقوق کا تصور عالمی یا کائناتی ہے۔

اس نقطہ نظر میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے نزدیک انسانی حقوق سے مراد انفرادی آزادیاں اور شہری آزادیاں ہیں جب کہ مشرقی ثقافت میں اجتماعی حقوق، اجتماعی نظم و ضبط اور بڑوں کے احترام کو اولیت اور ترجیح حاصل ہے۔ اگر چہ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر انسانی حقوق کی بھرپور وضاحت نہیں کرتے تا ہم ان کی وجہ سے اس اہم مسئلہ پر بحث کا دروازہ ضرور کھل گیا ہے ------ جکارتہ میں غیر وابستہ ممالک کی کانفرنس نومبر 1992 کے شروع میں ہوئی تھی اس کے مشترکہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ مغربی اقوام انسانی حقوق کی اپنی تعبیر کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کریں اور نہ ہی مغربی جمہوریت کے تصور کو ہی مسلط کرنے کے لیے مجبور کریں۔

انسانی حقوق کے وکلاء کا کہنا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی حقوق میں امتیاز کرنا بہت مشکل

ہے جب مشرقی تیمور (انڈونیشیا) اور تیانامن سکوائر (چین) میں ہونے والے واقعات سے متعلق حکومتوں سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ووٹ کے حق سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اجتماعی طور پر کمیونٹی یا سماج کو خوراک' علاج اور رہائش کے حقوق مل سکیں۔

جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے حکام کا موقف ہے کہ انسانی حقوق اور جمہوریت کے بارے میں ان نظریات کا اطلاق نہ کیا جائے جو یورپ میں مروج ہیں۔"۔ 1

انسانی حقوق کی تعریف پر یہ اختلاف رائے نیا نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تعبیر کے حوالے سے پایا جانے والا اختلاف کوئی نئی بات ہے تاہم موجودہ دور کی غالب اقوام کی طرف سے اپنی روایات اصول و ضوابط اور قوانین کو دیگر اقوام میں نافذ کرانے کا عمل سنگینی لئے ہوئے ہیں۔ ایس ایم ظفر انسانی حقوق کے بارے میں لکھتے ہیں

"انسانوں پر ہونے والی زیادتیوں کو نظر انداز کرنے کا مطلب ہے کہ ہم انسانیت کی تذلیل برداشت کر رہے ہیں اس نقطہ نظر کی ایک خوبصورت لیکن مثبت مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔

اس لیے انسانی حقوق کو "انسانیت کے حقوق" سے موسوم کرنا چاہتا ہوں -------- یہ ایک المیہ ہے کہ انسانی حقوق کے بارے میں شعور میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی مشکلات اور مصائب میں نہ تو کمی ہو رہی ہے اور نہ ہی یہ ختم ہو سکی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تیسری دنیا میں اس رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے"۔ 2

اخلاقیات سے تعلق انسان حقوق کے اس معاملے کا گہرا تعلق اخلاقیات سے بھی ہے۔۔ اخلاقیات میں افراد ایک دوسرے سے اور اقوام ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کرتے اور سیکھتے ہیں لیکن وہ مرحلہ بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے جب اخلاقیات کو سیاست کے تابع کر کے اقوام کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ فلاں اور فلاں کام کریں اور فلاں اور فلاں کام نہ کریں۔ ایک طرف اخلاقیات کا مظاہرہ یوں کیا جائے کہ سماجی' تعلیمی اور طبی شعبوں میں بے شمار فلاحی ادارے قائم کر کے ان کو رفاہ عام کے لیے بھاری بھاری فنڈز فراہم کئے جاتے ہیں لیکن تیسری دنیا اور امت مسلمہ کے اس قسم کے اداروں کو دہشت گردی کی حمایت کرنے والے بے چینی کی حوصلہ

افزائی کرنے والے اور سماجی زندگی کو تہہ و بالا کرنے والے ادارے قرار دے کر بدنام کیا جائے۔ پاکستان میں بھی یہ رویہ موجود ہے کہ یورپ کے ہر رویے کو بنظر تحسین دیکھا جائے اور اسلامی رویے کو وجود میں آنے سے قبل ہی قابل مذمت ٹھہرایا جائے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر رضی اللہ عزمی کی یہ تحریر اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مغرب میں لوگ اپنی رقم اور وقت کے ذریعے بے شمار خیراتی اور رفاہی تنظیموں کی امداد کرتے ہیں جو غریبوں کی امداد اور تحفظ کے لیے کام کرتی ہیں مسیحی مشنریاں ہسپتال اور خیراتی ادارے چلاتی ہیں اور وہ ہر کام دیگر ممالک میں بھی کرتی ہیں"۔

"جسے بھی مغرب میں رہنے کا موقع ملا ہے وہ اس بات کی ضرور گواہی دے گا کہ وہاں لوگوں میں انفرادی سطح پر شائستگی کے مظاہرے عام ملتے ہیں "ا یکسیوزمی" "پلیز" "سوری" "تھینک یو" کے الفاظ ان کی روز مرہ لغت کا حصہ ہیں۔ قطار بنانا ان کی روایت ہے لوگ وعدوں کی پابندی کرتے ہیں......"

ان رویوں کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب نے پاکستانی رویوں کی یہ تصویر پیش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ہم کتنی آسانی سے جھوٹ بولتے ہیں! مجھے آپ کا پیغام نہیں ملا! میں گھر پر نہیں تھا! میں ایک جنازے پر گیا تھا۔ قابل اعتماد عذر ہیں جو پیش کئے جاتے ہیں جھوٹے طبی سرٹیفکیٹ جاری کئے جاتے ہیں حتی کہ مکمل طور پر صحت مند افراد کو ہسپتال کے کسی بھی شعبہ میں طویل عرصہ داخل رہنے کا سرٹیفکیٹ بھی مل جاتا ہے۔

"اب ایک آخری شعبہ رہ جاتا ہے جس میں ہم فخر کر سکتے ہیں کہ ہم مغرب سے بہتر ہیں اور وہ ہے جنسی اخلاقیات۔ یہاں بھی آپ کو ایک خوفناک خلا ملے گا جو اعتقاد اور حقیقت کے درمیان موجود ہے.............. اغواء' مجرمانہ حملے' عصمت دری' اجتماعی آبروریزی اور بے سہارا خواتین پر تشدد عام ہیں۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں طوائفوں کے اڈے موجود ہیں......"۔ 3

اس موضوع پر بحث کرنا اس وقت مقصود نہیں ہے کہ مشرق میں اخلاقی قدروں کی کیا صورت حال ہے اور مغرب میں کیا ہے تاہم یہ بات ان حضرات کے علم میں ضرور ہو گی کہ مغرب کی تعلیم یافتہ' معاشرتی طور پر خوش حال اور سیاسی استحکام کی حامل زندگی' مشرق

کی ان پڑھ، معاشرتی بد حالی کی شکار اور سیاسی عدم استحکام کی ڈسی ہوئی زندگی اس قسم کے تقابلی جائزے کا جواز ہی غلط ثابت کرتی ہے۔ اہل مغرب کی مسلم معاشروں کے بارے میں کیا سوچ ہے اسے بھی ذہن میں رکھا جائے تو مناسب ہو گا۔ جینن کاربر سندھ گورنمنٹ لا کالج کراچی میں سکالر شپ کر رہی تھیں انہوں لکھا کہ

"ہم خوب ہیں سمجھتے ہیں کہ مسلمان عورت ظلم و ستم کا شکار ہے۔ خوبصورتی کی طرح خوف بھی کسی کنواری لڑکی کی آنکھوں سے جھلکتا ہوا ملتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس سے زیادہ خوفناک نہیں ہو سکتی کہ عریانی اور جنس کو ------- میڈونا طرز پر ------- تجارتی بنیادوں پر استعمال کیا جائے اور یہ ہماری سماجی زندگی (مغرب میں) سماجی آزادی کہلاتی ہے۔

پاکستانی خواتین کے بارے میں سچ تو یہ ہے کہ پاکستانی خاتون کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ امریکہ میں ہم ابھی تک اس بات میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ ہم خواتین کے لیے Equal Rights Amendment کر سکیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں عورتوں کو حصہ لینے کا بھرپور موقع مل رہا ہے اور انہیں محض خاتون ہونے کی وجہ سے کسی قسم کے امتیازی سلوک کا سامنا نہیں ہے۔ قدیم یہودیت، ہندومت اور عیسائیت کے برعکس اسلام اور اس کے شرعی قوانین خواتین کے لیے تعلیم، روزگار کے ساتھ ساتھ جائیداد کی خرید و فروخت اور ملکیت کے حقوق تسلیم کرتے ہیں وہ شوہر سے علیحدگی پر بھی جائیداد سے حصہ وصول کرتی ہے۔" 4

میڈونا کلچر نے امریکی خاتون کو کہاں پہنچا دیا ہے۔ انسانی حقوق کے وکلا کو اس کا ضرور اندازہ ہو گا لیکن شخصی آزادیوں، انفرادی حق پسند و ناپسند اور میڈونا طرز پر لبرل رویوں نے امریکی خاتون کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ڈارماؤتھ میں بدھ کی شام غیر شادی شدہ خواتین کا ایک گروپ جمع ہوتا ہے اور وہ ایک دوسری کو خبردار کرتی ہیں کہ ملاقات پر جاتے ہوئے اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ مرد ان کی عصمت دری بھی کر سکتا ہے۔ نیوز ویک نے ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ ڈارماؤتھ میں ایسے روز نے اس کے رپورٹر کو بتایا کہ اس نے اپنی ساتھی خواتین کو کہہ رکھا ہے وہ پارٹیوں میں تنہا مت جایا کریں۔ جانے سے پہلے ایک دوسرے کا لباس چیک کر لیں کوئی خاتون یا لڑکی چھوٹی سکرٹ پہن کے نہ جائے اور آپ کو کوشش کرنا چاہئے کہ جس قدر لباس پہن سکتی ہوں پہن لیں۔ تجزیہ نگار نے

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"ملاقات کے لیے جانے والی خواتین کی آبروریزی اس لیے ہوتی ہے چونکہ ان کا ذہن پہلے سے اس کے لیے تیار ہوتا ہے۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ حقوق نسواں کے لیے کام کرنے والی خواتین غلط اعداد و شمار پیش کرتی ہیں اور وہ ڈیٹ ریپ (Date rape) کی تعریف میں مزید اضافہ کرنے کا موجب بن رہی ہیں۔ عورتیں تو بے جان پیکر ہیں جن پر پیش آنے والے واقعات کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔" 5

نظریہ ارتقاء اور انسان مغرب میں انسانی زندگی کا یہ معاملہ دراصل اس بنیادی نظریے سے منسلک ہے جس نے انسان کے کے ارتقاء کو ڈارون کی نظر سے دیکھا اور اس نظریہ ارتقاء کے خلاف ہر آواز کو جاہل' غیر سائنسی اور حقائق سے فرار آواز قرار دے دیا۔ انسانی حقوق کے معاملے میں انسان کے بارے میں مغرب کے خیالات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے مستشرقین کی اس سوچ کے حوالے سے جو باتیں لکھی ہیں وہ مغربی ذہن کو سمجھنے میں کلیدی کردار کی حامل ہیں وہ لکھتی ہیں۔

"ان تمام مستشرقین کا فلسفہ جن کا میں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے درج ذیل مفروضوں کے گرد گھومتا ہے:

۱۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو کسی قسم کی تنقید سے ماوراء قرار دے کر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ انسانی زندگی کا آغاز ایک بہت ہی نچلے درجے کے جانور سے ہوا' وہ یہ کہ زندگی نے اس کرہ ارض پر نہایت سادہ اور بالکل نچلے درجے سے ارتقاء شروع کیا اور کتنے ہی ادوار گزرنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ مخلوقات میں بدلتی گئی جس کی انتہا پر اب انسان کھڑا ہے۔

۲۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو جب انسانی سماج پر لاگو کیا جاتا ہے تو یہ دریافت بالکل کار آمد ثابت ہوتی ہے جو کہ بہت ہی قدیم حوالے سے ظاہر ہوتی ہے اس کی مثالیں آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے وہ لوگ ہیں جو جھاڑیوں میں رہتے تھے انہوں نے پیچیدہ تر اور نہایت ترقی یافتہ کلچر کو فروغ دیا۔ ان کے مجموعی کلچر کی معراج مغربی تہذیب کی صورت میں سامنے ہے۔

۳۔ اب اس اصول کے تحت جو کوئی بھی مغربی تہذیب کو جھٹلائے گا وہ دراصل

نظریہ ارتقاء کو جھوٹا قرار دیتا ہے' ترقی کے خلاف بغاوت کرتا ہے نچلے درجے سے اور قدیم کلچر سے اعلیٰ ترین تہذیب نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ ناقابل تردید ہے اس لیے کہ یہ نظریہ ارتقاء کے مطابق وجود پاتی ہے چنانچہ یہ قرار پایا کہ ہر تبدیلی ترقی کی شاہراہ پر اگلا قدم ہوتی ہے اس لیے ہر نئی چیز ہمیشہ بہترین ہو گی اور پرانی چیزوں اور پرانے زمانے کے معیاروں کو تسلیم کرنا قدیم ترین اور نچلے درجے کے وجود کو ماننے کے مترادف ہو گا۔

۴ - وحی اور ماورائی قدروں پر مبنی تمام مذاہب ماڈرن سائنسی علوم کی وجہ سے متروک ہو چکے ہیں۔ ایک ایسا سماج جس کے ارکان اپنی زندگی کے جملہ معاملات کو چلانے کے لئے آسمانی قانون پر عمل کرتے ہیں' جمود اور پستی کا شکار ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جب سچائی کا علم ہو جائے تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا جب کہ تبدیلی کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔

یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے مستشرقین ہمارے ایمان کو ناپتے تولتے ہیں اسلام کا عطا کردہ سارا نظریہ ہی اس طریقہ کار کے بالکل مخالف ہے اس لیے اہل مغرب کا رویہ صرف اور صرف مخالفانہ اور دشمنی پر مبنی ہے۔ جس طرح ان کے اذہان منقسم ہیں اسی طرح وہ اسلام کو سمجھنے میں شدید غلطی کرتے ہیں۔"

* محترمہ مریم جمیلہ آگے چل کر لکھتی ہیں۔

"حتمی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا دعویٰ کرتے ہوئے' جو مافوق الفطرت وحی کے ذریعے عطا کی گئی ہیں' اور وقت و مکان کی قید سے آزاد اپنی حیثیت میں طے شدہ ہیں' اسلامی تعلیمات مغرب کے میکانکی ارتقاء کے تصور کو بالکل مسترد کر دیتی ہیں۔ عصری فکر کا کہنا ہے کہ مذہب کا آغاز حیوانیت کے ساتھ ہوا جس کے بعد اس کا واسطہ شرک سے پڑا۔ جس کے بعد وہ وحدانی اخلاقیات کی طرف مائل ہوا۔ حتی کہ ماضی کے تمام مذہبی اعتقادات کو سائنسی مادیت نے کمال غلبے کے ذریعے شکست دے دی جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی اس دنیا میں زندگی کو کامیابی سے ہم کنار کیا جائے اور طبعی طور پر بہتر حالت کو زندگی کا سب سے اہم مقصد قرار دیا جائے۔"[6]

مذہبی تعبیر مذہب کے کردار کے بارے میں مغربی نظریات سے اس مختصر تعارف کے بعد

ہم اس طرف آتے ہیں جس مقصد کے لیے یہ باب تحریر کیا جا رہا ہے یعنی انسانی حقوق کا مسئلہ اور اس کا مذہب سے تعلق۔ مغرب کا یہ دعویٰ بھی غلط ہو جاتا ہے کہ وہ انسانی حقوق کو مذہب کے تنگ قلعے سے نکال کر کائنات کی وسعتوں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ "انسان" کے بارے میں اہل مغرب کا نظریہ ارتقاء ظاہر کرتا ہے کہ انسان کے لئے حقوق کا مغربی فلسفہ اسے آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کے جنگلوں میں رہنے والے انسان کی حالت سے منسلک کرتا ہے مادر پدر آزادی کا تصور تب ہی مکمل ہو گا اگر انسان اپنی "فطرت" کو پہچانے جو مغرب کے بقول عریاں بھی ہے اور انفرادی بھی۔ یورپ میں کرسچین ڈیمو کریٹ انسانی حقوق کے بڑے علمبردار رہے ہیں اور اب بھی انسانی حقوق کے سارے فلسفے میں ان کے نظریات کو برتری حاصل ہے۔ ان کے خیال میں

"ہمارے اعتقاد کا پہلا راستہ انسان کی آزادی ہے وہ آزادی جو مسلسل خطرات کی زد میں بھی ہے اور مستقل طور پر ارتقاء پذیر بھی ہے۔ ایک فرانسیسی کرسچین ڈیمو کریٹ مصنف ایٹا نے گلسن کا کہنا ہے کہ ریاست کا کردار ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سماجی ذمہ داریوں میں اپنے ارکان سماج کے جملہ ترقیاتی امور میں بھرپور حصہ لے جس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر فرد کو اس کے فطری حقوق عطا کر دیئے جائیں...... اپنے منشور میں بیان کرتے ہوئے جملہ مسیحی خیالات اور نظریات کے مطابق سرگرمیاں جاری رکھنے میں کرسچین ڈیموکریٹ ناکام رہے ہیں اور یہ ناکامی اس وقت تحلیل ہو جاتی ہے جب وہ اپنی طرف سے اس کردار کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ایک زیادہ منصف سماج کی تشکیل کے لیے ادا کیا اور اس میں انسانی حقوق' یا فطری حقوق کو مختلف دساتیرکی بنیاد میں شامل کرایا اور یہ کام تب ہوا جب انہوں نے جنگ عظیم دوم کے بعد آئین تیار کئے۔ دستوری عدالتوں کے قیام کے ذریعے ان حقوق پر عمل درآمد کرایا گیا۔" 7

انسانی حقوق کی مغربی تعبیر میں بھی مذہب سے گہرا تعلق موجود ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انسانی حقوق دراصل مسیحی تعلیمات کو سیاسی انداز سے پیش کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انسانی حقوق کی تاریخ کیا ہے اور اس عمل میں ارتقاء کے مختلف مراحل کون سے تھے؟

فطری حقوق سے انسانی حقوق تک "انسانی حقوق" کی اصطلاح نسبتاً نئی ہے جو روز

مرہ زندگی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد زیر استعمال آنے لگی تھی اس کا سلسلہ 1945ء میں اقوام متحدہ کی بنیاد رکھے جانے تک پہنچتا ہے۔ اس سے قبل فطری حقوق کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی اس کو اس لیے ناپسند کیا گیا کہ "فطری حقوق" کے معاملے پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا جس کے بعد انسان کے حقوق "The Rights of Man" کی اصطلاح استعمال ہوئی اس میں قباحت یہ سامنے آئی کہ اس کے ذریعہ سے خواتین کے حقوق کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

انسانی حقوق کے طلبہ نے ان کا تعلق قدیم یونان اور روم کے نظریات سے قائم کیا ہے۔ جہاں انہیں ماڈرن دور سے قبل قدرتی یا فطری حقوق سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک فلسفی زینو کا مکتب فکر کام کر رہا تھا جس کا کہنا تھا کہ کائنات میں موجود کام کرنے والی قوت تمام مخلوقات میں رچ بس گئی ہے انسانی کردار کو بھی اس کے مطابق دیکھا جانا چاہیے اور اسے قانون فطرت سے ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال یونانی تہذیب میں انتی گنی سے ملتی ہے جس نے بادشاہ کریئسین کے حکم کے خلاف عمل کرتے ہوئے اپنے مقتول بھائی کو دفن کر دیا تھا بادشاہ نے کہا کہ اس نے دیوتاؤں کے ناقابل تنسیخ قوانین کے خلاف عمل کیا ہے"

"قرون وسطیٰ میں فطری یا قدرتی حقوق کا تعلق سیاست کے لبرل نظریات سے جوڑ دیا گیا۔ روم یونان اور قدیم دور کی دیگر تہذیبوں میں قدرتی یا فطری حقوق کو انسان کی ذمہ داریوں سے الگ قرار دے دیا گیا۔ ارسطو اور (Thomas Aquinas) کے فلسفے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان مکاتب فکر میں غلامی اور زرعی غلامی کو قانونی حیثیت دی گئی تھی ایسا کرتے ہوئے اس بنیادی خیال کو ترک کر دیا گیا تھا جسے آج کل انسانی حقوق کے نظریے کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے ----- یعنی آزادی اور مساوات۔

انسانی حقوق کے نظریے کو مضبوط کرنے کے لیے ضروری تھا کہ عام سماجی ضرورت اور حقیقت میں اسے رواج دیا جائے چنانچہ لازم ٹھہرا کر سماج میں اعتقاد اور اعمال کے حوالے سے بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں.......... مذہبی علوم رواداری اور سیاسی و معاشرتی غلامی کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک ایسی تبدیلی آنے لگی جس نے آزادی اور مساوات کے لبرل افکار کو تقویت پہنچائی خاص طور پر حق ملکیت اور اس ملکیت کو زیر استعمال لانے کے حقوق نے

اہم کردار ادا کیا۔ تب ہی وہ بنیادیں استوار ہو سکیں جن پر آج کل انسانی حقوق کے نظریے کی عمارت کھڑی ہے۔"

"تاہم سترھویں اور اٹھارویں صدی اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان میں فطری حقوق کے لیے قوانین کو تشکیل دے کر عمل کرایا جانے لگا۔ سترھویں صدی میں سائنسی اور فکری ترقی ہوئی ایک طرف گلیلیو اور آئزک نیوٹن کی ایجادات تھیں دوسری طرف تھامس ہابس کی مادیت، اپنے ڈیکارٹ کی عقلیت پسندی اور جی ڈبلیو بنز کا اس میں حصہ سپنی نوزوا کا وحدت الوجود، جان لاک اور فرانسس بیکن کی تجربیت کے نظریات تھے۔ یہ تمام افراد ماڈرن دور کے سب سے زیادہ اہم دانش ور ہیں جنہوں نے فطری قوانین کے لیے کام کیا۔ اٹھارویں صدی میں ہونے والے کام (Montesquieu) میں زیادہ کردار پیرس نے ادا کیا۔ والٹیئر اور جین جیکوس روسو اس سلسلے کے اہم نام ہیں"

"انسانی حقوق کو فطری حقوق کے طور پر لینے کا نظریہ بھی بدنامی سے خالی نہ تھا اور اب بھی جب کہ انسانی حقوق کو قبولیت حاصل ہے یہ عنصر موجود ہے۔ چونکہ فطری حقوق مذہب سے تعلق بھی رکھتے ہیں اس لیے لبرل فلاسفہ اور سیاست دانوں کے لیے یہ ناقابل قبول ہیں۔ دوسرے، یہ فطری قوانین، حتمی، ناقابل تنسیخ، ناقابل تبدیل اور لافانی سمجھے جاتے تھے چنانچہ ان میں تصادم کی کیفیت سامنے آئی۔ حتیٰ کہ دائیں اور بائیں بازو کے فلسفیوں اور سیاست دانوں نے مل کر ان پر زبردست تنقید کی۔"

"انسانی حقوق کو داخلی اور عالمی سطح پر ملنے والی قبولیت بہت بڑے پیمانے پر موجود ہے لیکن اس سے یہ سمجھ لینا سنگین غلطی ہو گی کہ ان پر کامل اتفاق پایا جاتا ہے۔ ان کی تعریف مختلف انداز میں کی جاتی ہے۔ بعض اہم امور ابھی تک جواب طلب ہیں۔ کیا انسان کے حقوق کو آفاقی، مساوی، اخلاقی سمجھا جائے یا انہیں قانونی قرار دیا جائے۔ کیا انہیں میلان طبع، رواج، عمرانی معاہدوں انصاف یا پھر خوشی کے حصول کے حوالے سے دیکھا جائے؟ کیا انہیں مکمل طور پر ناقابل تنسیخ قرار دیا جائے یا جزوی طور پر ایسا کیا جائے؟ کیا انسانی حقوق اپنی تعداد اور ہیئت میں زیادہ ہونا چاہیے یا محدود، ان معاملات پر بحث جاری ہے"

انسانی حقوق کی تعبیر انسانی حقوق کیا کی تعبیر ہے اس بارے میں مندرجہ ذیل امور قابل توجہ ہیں۔

"اول ــــ انسانی حقوق کے جواز یا ان کے مقام آغاز کی بحث سے قطع نظر' ان کے بارے میں یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ انفرادی اور گروہی مطالبات کو پورا کرنے سے متعلق ہیں جن کے ذریعے انسان یا گروہ اقتدار' دولت' خوشی اور زندگی کی دیگر زندہ قدروں کو حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ سماجی عمل جاری رہ سکے۔ ان میں سب سے اہم قدر عزت نفس کی ہے جس سے متعلقہ قدروں میں متناسب برداشت کی قوت' باہمی طور پر معاف کرنے کا جذبہ تاکہ دیگر قدروں کے حصول میں آسانی پیدا ہو سکے شامل ہیں' نتیجہ کے طور پر ان افراد اور اداروں کے خلاف انہیں بطور دعویٰ نافذ کیا جاتا ہے جو ان کا احساس نہیں کرتے اور ان سے متعلقہ قوانین اور روایات میں مزاحمت پیدا کرتے ہیں۔

دوسرے' انسانی حقوق' ماحول میں تبدیلی کااظہار کرتے ہوئے مختلف فیہ عالمی خیالات' قدروں کے عمل میں ایک دوسرے پر انحصار کرنے میں' زیادہ تر درست ہونے سے لے کر قابل جواز قرار پاتے ہیں' انسانی حقوق قانونی اور اخلاقی نظام میں براہ راست شرکت کرتے ہیں بعض اوقات ان میں فرق کرنا ممکن نہیں رہتا۔ ان سے انسانی معاملات کے وجود پذیر ہونے یا ان کے ممکن ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

تیسرے' اگر کسی حق کو انسانی حق قرار دیا جائے گا تو وہ اپنے جواز کے اعتبار سے کائناتی ہونا ضروری ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے پوری کائنات میں موجود انسانوں سے متعلق ہو' حتیٰ کہ جو انسان ابھی پیدا نہیں ہوئے ان کے معاملات سے بھی تعلق رکھتا ہو'ماضی میں بادشاہوں کے فرامین کے بر خلاف انسانی حقوق اپنے نظریے اور عمل میں اس زمین پرموجود ہر انسان کو بغیر کسی امتیاز کے ملنے ضروری ہیں۔

چوتھے' انسانی حقوق کا جواز اس اعتبار سے محدود بھی ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ پر انسانوں یا گروہ انسانی کو جو حقوق حاصل ہوں گے ان سے دوسرے انسانوں یا انسانی گروہ کے حقوق پر زد نہیں پڑے گی اور نہ ہی ان کے مشترکہ مفادات متاثر ہوں گے۔ ان حالات میں انسانی حقوق کو حتمی معنوں میں نہیں لیا جاتا۔

پانچویں اور آخری' انسانی حقوق کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا ہے کہ ان کو "بنیاد سمجھا جائے گا جو "غیر ضروری دعوؤں" اور چیزوں' سے دور ہیں۔ بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ انسانی حقوق کو محدود کرنا چاہیے مثال کے طور پر زندگی کا حق یا پھر مساوی مواقع میسر آنے

کا حق۔" 8

اقوام متحدہ کا چارٹر انسانی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے چارٹر میں مندرجہ ذیل باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

"بنیادی انسانی حقوق کی عزت و تکریم' مرد و زن کے مساوی حقوق اور تمام چھوٹی بڑی اقوام میں ان پر ایمان سے مشروط ہے اس سے یہ بات قرار پاتی ہے کہ ---اقوام متحدہ کی دیگر ذمہ داریوں کی طرح یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ------ "اقوام میں دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے جو ان کے افراد کی عزت اور ان کے استصواب رائے کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے کوشش کرے گی ------ تاکہ عالمی سطح پر تعاون حاصل کیا جائے --- جس کے ذریعے انسانی حقوق کا تحفظ اور ان کی حوصلہ افزائی کی جا سکے اور تمام انسانوں کی آزادی کو نسل' جنس اور مذہب کے امتیاز کے بغیر یقینی بنایا جا سکے ------ اس کی اہم دفعات میں کہا گیا ہے کہ "تمام ارکان (اقوام متحدہ مشترکہ اور انفرادی طور پر اس بات کی کوشش میں تنظیم اقوام متحدہ سے تعاون کریں گے کہ انسانی حقوق سے متعلقہ اور اس سے منسلکہ مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔" 9

انسانی حقوق کے حوالے سے اقوام متحدہ نے سیاسی اور شہری حقوق پر عالمی کنونشن کا انعقاد کیا۔ 1966 کے اس کنونشن پر 1976 میں عمل شروع ہوا۔ اور مندرجہ ذیل حقوق کو تسلیم کیا گیا۔

- زندگی کا حق
- تشدد سے تحفظ' ظلم' غیر انسانی یا باعث رسوائی سلوک کے خلاف تحفظ
- انسان کی آزادی کا حق' اور غیر منصفانہ گرفتاری یا حراست سے تحفظ
- قانون کے سامنے مساوات
- کسی کے نجی معاملات میں دخل اندازی کے خلاف تحفظ
- حرکت کی آزادی
- شہریت حاصل کرنے کا حق
- شادی کرنے اور خاندان بنانے کا حق
- فکر' شعور اور مذہب کی آزادی

- طہار رائے اور اظہار خیال کی آزادی
- پرامن اجتماع کا حق
- انجمن سازی' ٹریڈ یونین میں شمولیت کا حق
- ووٹ دینے اور حکومت میں شرکت کرنے کا حق

اقوام متحدہ نے اس کنونشن' کے تحت استصواب رائے کا حق بھی تسلیم کیا جس کا مقصد لوگوں کو اپنے سیاسی' معاشی' تہذیبی' سماجی معاملات میں رائے دینے اور فیصلہ کرنے کا حق دینا تھا۔ لوگوں کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ریاست کو قدرتی وسائل کے بہتر استعمال کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ معاشی' سماجی اور تہذیبی حقوق کے کنونشن میں قرار دیا گیا کہ ہر انسان کو کام کرنے' اجرت لینے' ٹریڈ یونین بنانے اور اس میں حصہ لینے' سماجی اور معاشی معیار زندگی بہتر کرنے' تعلیم حاصل کرنے' اپنے بچوں کی تربیت اور انہیں بیرونی استحصال سے بچانے اور معاشرے کی سماجی سرگرمیوں میں شرکت کے حقوق حاصل ہوں گے۔

تشدد' ظلم اور غیر انسانی سلوک کے خلاف اپنے کنونشن میں اقوام متحدہ نے یہ قرار دیا کہ تشدد' ظلم اور غیر انسانی سلوک کی ہر قسم کو روکنے کے لئے کام کیا جائے گا اور تشدد کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے جدوجہد کی جائے گی۔ ایسے علاقوں اور ریاستوں سے ان انسانوں کو نکالا جا سکتا ہے جنہیں وہاں تشدد کا نشانہ بننے کا خطرہ ہو۔ تشدد کرنے والوں کو گرفتار کرنے کے لیے رکن ممالک آپس میں تعاون کریں گے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ارکان کو تربیت دی جائے گی کہ وہ تشدد کرنے سے باز رہیں۔ نظربندوں پر تفتیش کے دوران تشدد کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اور متبادل طریقے استعمال کئے جائیں گے۔ تشدد کے تمام الزامات کی مکمل تحقیقات کرائی جائیں گی۔

نسلی امتیاز کے خلاف طے کیا گیا کہ نسلی امتیاز کے خاتمے کے لیے رکن ممالک کام کریں گے اپنے اپنے ملک میں تمام نسلوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے اقدامات کئے جائیں گے اور تمام سرکاری اداروں کو ان کا پابند بنایا جائے گا۔ نسلی امتیاز پیدا کرنے' ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے تمام قانون اور ضابطے ختم کر دیئے جائیں گے۔ نسلی برتری پر مبنی تمام نظریات کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اس قسم کے پروپیگنڈے کی مذمت کی جائے گی جس سے کسی دوسری نسلی وحدت کے خلاف نفرت پیدا کرنا مقصود ہو نسلی امتیاز

پیدا کرنے کے جملہ طریقوں کو ختم کیا جائے گا۔ قانون کے سامنے رنگ، زبان، نسل اور قومیت سے قطع نظر سب انسانوں سے برابری کا سلوک کیا جائے۔ نسلی امتیاز سے تحفظ اور اس کے شکار ہونے والوں کے لئے آئندہ بچاؤ کی تدابیر کی جائیں گی۔ تعلیم، تہذیب اور اطلاعات کے شعبوں میں تعاون کیا جائے گا تاکہ تعصبات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

خواتین کے خلاف ہونے والے امور اور ان سے امتیازی سلوک کے بارے میں اقوام متحدہ کے ایک اور کنونشن میں جو 1979 میں ہوا یہ طے پایا کہ انہیں ووٹ کا حق حاصل ہو گا۔ عوامی اداروں میں وہ منتخب ہو سکتی ہیں عوامی ذمہ داری کے قابل ہیں۔ حکومت اور پالیسی سازی میں شرکت کر سکتی ہیں سیاسی اور عوامی سطح پر وہ غیر سرکاری تنظیموں میں شامل ہو سکتی ہیں۔ قانون کی نظر میں وہ مرد کے برابر ہیں۔ انہیں شہریت کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ انہیں ملازمت کے مواقع اور کام کرنے کے سلسلہ میں مساویانہ حقوق حاصل ہوں گے۔ اور وہ اس کا معاوضہ وصول کریں گی۔ صحت، علاج معالجے اور خاندانی منصوبہ بندی کے مواقع حاصل ہوں گے اقتصادی فوائد اور خدمات حاصل کر سکیں گی۔ شادی اور خاندان میں مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ بچپن کی شادی کے خلاف انہیں تحفظ دیا جائے گا۔

بچوں کے حقوق کے حوالے سے 1989 میں کنونشن ہوا جس کی 1990 میں منظوری دی گئی اس میں کہا گیا کہ انہیں زندگی کا حق حاصل ہو گا انہیں سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔ وہ شہریت کے حق دار ہوں گے۔ وہ کسی ملک کو چھوڑ سکتے ہیں اپنے یا کسی بھی ملک میں داخل ہو سکتے ہیں انہیں غیر قانونی طور پر کسی دوسرے ملک نہیں لے جایا جا سکتا۔ گود لینے کے مقدمات میں بچے کے مفادات کو ترجیح حاصل ہو گی۔ وہ فکر، شعور اور مذہب میں خود مختار ہوں گے۔ انہیں علاج معالجے کی سہولتیں حاصل کرنے کا مساوی حق حاصل ہو گا۔ جن ریاستوں میں بچپن میں اموات کی شرح زیادہ ہے وہاں کوشش کی جائے گی کہ شیر خوارگی میں اموات پر قابو پایا جا سکے۔ انہیں سماجی تحفظ حاصل ہو گا اور وہ زندگی میں ایک معقول معیار حاصل کرنے کے حق دار ہیں۔ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے اس کے لئے رکن ممالک کوشش کریں گے کہ پرائمری تعلیم کو لازمی اور مفت قرار دیا جائے۔ بچوں کو معاشرتی استحصال سے بچانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اور ملازمت کے لیے عمر کی کم از

کم حد مقرر کی جانا ضروری ہے۔ منشیات کے استعمال' ترویج' سمگلنگ اور اس قسم کی دیگر سرگرمیوں میں بچوں کو بروئے کارلانے والوں کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ بچوں کو جنسی تشدد سے بچانا بھی ضروری ہے۔

ان حقوق کے تحفظ' ترویج اور ان پر عمل درآمد کے لئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی ہر سال انسانی حقوق پر باقاعدگی سے بحث کرتی ہے۔ اسمبلی کی تیسری کمیٹی کو متعلقہ امور کے بارے میں معاملات ارسال کئے جاتے ہیں۔ یہ کمیٹی سماجی اور انسانی معاملات پر غور کرتی ہے۔ اکنامک اینڈسوشل کونسل (ECOSOC) میں 54 حکومتوں کے نمائندے شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے آرٹیکل 68 کے تحت یہ کونسل معاشی اور سماجی شعبوں میں کمیشن قائم کرتی ہے اور انسانی حقوق کی ترویج کا کام کرتی ہے۔ 1946 میں کونسل نے ایک کمیشن برائے انسانی حقوق قائم کیا۔ اس کے اب 43 ارکان ہیں جن کا چھ ہفتوں کے لیے جینوا میں اجلاس ہوتا ہے۔ اس میں زیر بحث آنے والے معاملات اور قرار دادوں کا تعلق تشدد' غائب ہونے' نسلی و مذہبی امتیاز کا شکار ہونے اور استصواب رائے سے محروم رکھے جانے والے افراد کے معاملات سے ہوتا ہے۔ یہ کمیشن قرار دادوں کے ذریعے کونسل کو رپورٹ پیش کرتی ہے۔

اقوام متحدہ اور اس کے اداروں کے علاوہ یورپ کی کانفرنس برائے سلامتی اور تعاون (CSCE) بھی انسانی حقوق کی نگرانی کا کام کرتی ہے۔ اس کے ہلسنکی فائنل ایکٹ کی کیم اگست 1975 کو منظوری دی گئی تھی اس میں 35 یورپی ممالک نے شرکت کی۔ البانیہ اس میں شریک نہ تھا۔ یورپ کے علاوہ کینیڈا اور امریکہ نے بھی اس پر دستخط کئے۔ یہ ایکٹ عالمی سطح پر کوئی لازمی معاہدہ تو نہیں ہے تاہم سیاسی اعتبار سے یہ ایک اہم دستاویز ہے جس میں ہر رکن ریاست یا ملک نے رضاکارانہ طور پر انسانی حقوق کا وعدہ کیا۔ جن حقوق کی ضمانت فراہم کی گئی ان میں فکر وعمل کی آزادی' شعور اور ضمیر کی آزادی' مذہب اور اعتقاد کی آزادی اہم ہیں۔ میڈرڈ کانفرنس 83-1980 میں مزید پیش رفت ہوئی اور فائنل ایکٹ میں مزید ترمیم کی گئی پھر ویانا میں 19 جنوری 1989 کو حتمی دستاویز تیار کی گئی

ایک اور ادارہ کونسل آف یورپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس میں تیس مغربی یورپی ممالک شامل ہیں ان میں آسٹریلیا' بلجیم' قبرص' ڈنمارک' فن لینڈ' فرانس' جرمنی'

یونان، آئس لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، ہالینڈ، ناروے، پرتگال، سین میرینو، سپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ترکی اور برطانیہ شامل ہیں۔

انسانی حقوق کے پس منظر، تعریف اور اقوام متحدہ کے کردار سے متعلقہ نظری بحث کے بعد ہم اس مسئلہ کی طرف آتے ہیں جس کی بنیاد پر مسلمانوں پر اور اسلام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام عائد کر کے انھیں بنیاد پرست قرار دیا جاتا ہے، جیسے ہم نے "انسان" کے بارے میں مغرب کے نظریات کا خلاصہ پیش کیا ہے اسی طرح ہم چاہیں گے کہ "انسان" کے بارے میں اسلام کے نظریات اور تعلیمات بھی سامنے آئیں تاکہ دونوں کے تقابلی جائزے سے علم ہو سکے کہ "انسان" کو حیوان قرار دینے اور اشرف المخلوقات بنانے کے عمل میں کس قدر فاصلہ ہے اور اس کے بعد انسانی حقوق کی کیا تعبیر کی جا سکتی ہے۔

انسان۔ اسلام کی نظر میں قرآن حکیم انسان کا مقام بہت ہی خوبصورت انداز میں متعین کرتا ہے

"پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ انہوں نے عرض کیا۔ "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا! آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں" فرمایا۔ "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے" اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمہارا خیال صحیح ہے کہ (کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ" انہوں نے عرض کیا کہ نقص سے پاک تو آپ کی ہی ذات ہے ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں"

(البقرہ - ۳۰ - ۳۲)

"انسان" کے حوالے سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مقدمہ تفہیم القرآن میں جو بحث کی ہے وہ بہت ہی جامع ہے اور "انسان" کے بارے میں قرآنی تصور کو جامعیت سے بیان کرتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

۱- "خداوند عالم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے، اپنی بے پایاں

مملکت کے اس حصے میں' جسے زمین کہتے ہیں' انسان کو پیدا کیا۔ اسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲۔ اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک' معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو' نہ کسی دوسرے کے بندے ہو' اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت' بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہو گا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں کون امتحان میں کامیاب رہا ہے۔ اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو۔ اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزہ چکھنا ہو گا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳۔ یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد (آدم و حوا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اولین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں ان کا قانون حیات بتا دیا گیا تھا۔"۔ 10

انسان کی تخلیق اور اس کا مقصد وجود بتانے کے ساتھ ساتھ قرآن نے اسے مساوات

کے اصول سے بھی آشنا کرایا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

" زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کو باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اورلیٹے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب۔ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مدد گار نہ ہو گا۔

مالک۔ ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما۔ جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوند! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ جواب میں ان کے رب نے فرمایا! میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم ایک دوسرے کے ہم جنس پر ہو۔
ال عمران - آیات ۱۹۰-۱۹۵

گویا سب سے اولین شرط یہ ہے کہ اعمال کی دنیا میں مرد اور عورت میں کوئی تمیز نہیں ہے دونوں برابر ہیں اور اپنے اعمال میں خودمختار۔ اس اصولی بیان کے بعد انسان کے بارے میں اسلام اور قرآن کی دعوت کا جامع ترین نچوڑ نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۃ الوداع میں ملتا ہے۔ جہاں انسانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے انسان کاملؐ نے فرمایا:

" لوگو! اللہ تعالی فرماتے ہیں! اے لوگو!

ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تم پہچانے جا سکو ۔ یعنی باہم ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اور خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر

کوئی برتری نہیں ہے اور کسی کالے کو کسی گورے پر' اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے' فضیلت اور برتری صرف پرہیزگاری کی بنیاد پر ہے۔

سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں' خبردار' خون یا مال کا ہر وہ دعویٰ جس کے لوگ مدعی ہیں' وہ میرے قدموں تلے ہے (میں اسے باطل قرار دیتا ہوں) مگر بیت اللہ کی نگرانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت حسب دستور رہے گی۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا! اے گروہ قریش!

قیامت کے روز ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے آؤ' اور لوگ آخرت کا سامان لے کر آئیں' (یاد رکھو) ایسا ہوا تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکوں گا۔

خبردار! زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) کی تمام رسمیں' میرے قدموں کے نیچے روند دی گئی ہیں' زمانہ جاہلیت کے تمام خون (خواہ وہ کسی کے بھی ہوں) سب معاف ہیں (اب طرفین میں سے کوئی اس کا بدلہ نہ لے سکے گا)۔

میں اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے ہی خاندان کا ایک خون' جو کہ ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا ہے' معاف کرتا ہوں -----

لوگو! تمہارے خون (جانیں) تمہارے اقوال اور تمہاری عزت و آبرو قیامت تک ایک دوسرے پر حرام ہیں جس طرح تمہارے اس دن' اس مہینے اور اس شہر کی حرمت واجب ہے اور تم سب عنقریب اپنے پروردگار سے جا ملو گے جہاں تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ ہو گا۔

اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں' اور اسی طرح تم پر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں' تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے ہو' نیز ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کا کوئی کام نہ کریں' لیکن اگر وہ ایسا کریں تو تمہارے رب نے تمہیں یہ اجازت دی ہے کہ ان کے سونے کی جگہ اپنے سے الگ کر دو' (اگر اس پر بھی باز نہ آئیں تو) پھر تمہیں اجازت ہے کہ انہیں ایسی ہلکی مار مارو جس سے بدن پر نشان نہ پڑیں' اور اگر وہ اپنی نازیبا حرکتوں سے باز آ جائیں تو حسب دستور ان کا کھانا اور کپڑا تمہارے ذمے ہے۔

خبردار! کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دے' عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کے ہمیشہ پابند رہو۔ کیونکہ وہ تمہاری زیر نگرانی ہیں اور اس حیثیت میں نہیں کہ اپنے معاملات خود چلا سکیں' عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کے ذریعے ان کو اپنے لئے جائز و حلال کیا ہے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے (میراث کا قانون نازل کر کے) ہر حق دار کو اس کا حق دے دیا ہے' اس لئے اب کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت جائز و نافذ نہیں' بچے کا نسب اس مرد سے ثابت ہو گا جس کی وہ بیوی ہے' جس نے بدکاری کی' اس کے لئے سزا ہے (بچہ اس کا نہیں کہلائے گا) اور ان کا حساب و کتاب اللہ کے ذمے ہے۔

جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنی نسبت کی یا کسی غلام نے اپنے کو کسی دوسرے مالک کی طرف منسوب کیا' اس پر خدا کی لعنت ہے۔ قرض ادا کیا جائے گا' امانت واپس کی جائے گی' ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

خبردار! جرم کرنے والا خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔ باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں' اور بیٹے کے جرم کا ذمہ دار باپ نہیں۔

کسی شخص کے لئے کسی بھائی کی کوئی چیز لینا جائز نہیں' البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ وہ خوش دلی کے ساتھ دے' پس تم لوگ اپنے اوپر ظلم و زیادتی نہ کرو۔

لوگو! (خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ) ہر مسلمان' دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' اور سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ تمہارے غلام' تمہارے غلام ہیں تم خود جو کچھ کھاتے ہو ان کو بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں بھی پہناؤ۔

خبردار! میرے بعد گمراہ (یا کافر) نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو' اس پر لازم ہے کہ وہ امانت والے کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے لوٹا دے۔

اگر کوئی نکٹا اور سیاہ فام حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے' اور وہ کتاب اللہ (قرآن مجید) کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔"۔ 11

انسان کو دیا جانے والا یہ درس محض ایک خطبہ نہیں تھا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی ساری حیات طیبہ اس کی عملی تصویر تھی۔ خلفائے رسولؐ میں بھی یہی وصف نظر آتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے فتح بیت المقدس کے بعد جو صلح نامہ تیار کرایا اس میں لکھا کہ :

" ---- عبداللہ عمر امیر المومنین کی طرف سے اہل ایلیا (بیت المقدس) کی جان' مال' عبادت گاہوں' صلیبوں' شہر کے بیماروں' تندرستوں اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو امان دی جاتی ہے ان کے کنیسوں میں نہ تو سکونت اختیار کی جائے گی' نہ انہیں ڈھایا جائے گا' نہ ان کے کسی حصہ یا متعلقہ اراضی پر قبضہ کیا جائے گا ' نہ ان کی (سونے چاندی کی) صلیبوں یا مال و دولت کا حصہ کم کیا جائے گا۔ انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا' اور نہ ان کے ساتھ ایلیا میں کوئی یہودی رہے گا۔ اہل ایلیا پر لازم ہے کہ اتنا جذیہ دیں جتنا شام کے دوسرے شہر ادا کرتے ہیں' ان پر لازم ہے کہ وہ ایلیا سے بزنطیوں اور ڈاکوؤں کو نکال دیں جو بزنطی نکلیں گے۔ ان کی جان اور مال بزنطی حکومت کی عملداری میں پہنچنے تک محفوظ رہے گی اور جو بزنطی ٹھہرنا چاہیں انہیں بھی امان ہے بشرطیکہ وہ اہل ایلیا کے برابر جذیہ دینے کو تیار ہوں (ایلیا کے باشندوں میں سے) جو اپنے گرجے اور صلیبیں چھوڑ کر اور اپنا مال و متاع لے کر بزنطیوں کے ساتھ جانا چاہیں وہ اور ان کے گرجے نیز صلیبیں بزنطی حکومت کی عملداری میں پہنچنے تک محفوظ رہیں گی)"۔ 12

انسانی تعلقات کے بارے میں قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ

" اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔"

(الحجرات - ۱۱ - ۱۲)

ایک اور موقع پر ارشاد باری تعالیٰ ہے :

" تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحب قدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار' مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے۔ جو لوگ پاک دامن' بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

(النور - ۲۲ - ۲۴)

انسان کو حواس اور شعور کی طاقت دینے کا مقصد بھی بیان کر دیا گیا

" وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔"

(المومنون - ۷۸)

اسلام نے انسان کو اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہی ثابت نہیں کیا بلکہ اس تمام مخلوقات میں افضل قرار دیا اور اس کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے اس مقام کا منطقی تقاضا یہی ہے کہ اس کے حقوق بھی اس کے شایان شان ہوں وہ ادنیٰ سطح سے ارتقاء کے ذریعے انسان نہیں بنا بلکہ اسے پیدا ہی انسان کی حیثیت میں کیا گیا۔ یہی وہ نقطہ ہے جو ارتقائی انسان کے حقوق اور اسلام کے تصور انسانی میں حد فاصل کھینچتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کو ذلیل کمینے اور سمجھنے والے اس کے حقوق کے محافظ کہلائیں اور انسان کو اشرف و افضل کہنے والے تنقید کا نشانہ بنیں۔

اقوام متحدہ کا کردار انسانی حقوق کی خلاف ورزی روکنے کے لئے اقوام متحدہ نے اب تک جو کردار ادا کیا ہے وہ نئے عالمی نظام کے زیر اثر اپنی افادیت کے اعتبار سے بہت کمزور رہا۔ سیاسی فیصلوں کی روشنی میں ہونے والے ان اقدامات نے اپنے اثرات مرتب نہیں

گئے بلکہ انسانی حقوق کے نام پر بڑی طاقتوں بالخصوص امریکہ کی طرف سے فوج کشی کا جواز مہیا کرنے کا مظاہرہ ہوا ہے۔ امریکہ نے دنیا کو اپنی فوجی برتری کے لئے مختلف خطوں میں یہ کام شروع کیا ہے۔ اب انسانی بنیادوں پر مداخلت (Humanitarian Intervention) ایک عام معاملہ بن گیا ہے۔ امریکہ صومالیہ میں اسی حوالے سے داخل ہوا اور بعد میں اس نے اقوام متحدہ سے مینڈیٹ حاصل کیا اس طرح اقوام متحدہ کی حیثیت ثانوی ہو کے رہ گئی اسے باہر سے مسلط کئے گئے فیصلوں پر صاد کرنا پڑا۔ اس امریکی فیصلے پر خود امریکہ میں بہت تنقید ہوئی اور کہا گیا کہ :

" جارج بش نے بہت عجلت میں صومالیہ میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے ذریعے کہا گیا ہے کہ صومالیہ میں انسانی بنیادوں پر امدادی سرگرمیوں کو باقاعدہ بنانے کی کوشش کرنا مقصود ہے۔ امریکی افواج یہ ذمہ داری اقوام متحدہ کی امن فوج کے حوالے کر دیں گی جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ امدادی سرگرمیوں کے لئے حالات سازگار ہیں اور سلامتی کونسل کی پچھلے ہفتے کی قرارداد پر عمل ہو سکتا ہے اقوام متحدہ کی امن فوج کی ابھی تشکیل ہونا باقی ہے اور یہ بھی طے نہیں ہوا کہ اس کے اخراجات پورے کرنے کا فارمولا کیا ہو گا ------" 13

بظاہر یہ سب کچھ بہت سادہ اور سچا معلوم ہوتا ہے لیکن اصل تصویر یہ نہیں ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔ امریکی مقاصد صومالی عوام کی امدادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے سوا بھی بہت سے تھے۔ جن کے تذکرے کی یہاں ضرورت نہیں تاہم اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے حوالے سے کردار نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس میں مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں تو بہت سی باتیں خطرے اور مزید انسانوں کے اتلاف کے امکانات کو واضح کر دیتی ہیں۔

1) انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کی مناسب تحقیقات کئے بغیر کسی بھی ملک پر الزام عائد کیا جا سکتا ہے' وہاں صورت حال بہت بگڑ چکی ہے اس لئے اب اقوام متحدہ کی طرف سے انسانی بنیادوں پر مداخلت ناگزیر ہو چکی ہے۔ گویا امریکہ اور اس کے اتحادی اس ملک پر چڑھائی کر سکتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود

صومالیہ ہے۔ جہاں امریکی افواج اس اصول کے سہارے داخل ہوئیں اور صورت حال کو مزید خراب کر کے مجبوری کی حالت میں نکل گئیں۔

۲) اقوام متحدہ کی امن فوج کو بعض سفارتی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے اور دنیا کے مخصوص خطوں میں امریکی اور یورپی مفادات کے تحفظ کا انتظام کیا جا سکے۔ ان سفارتی مقاصد میں مخالف نظریات کے آگے بندھ باندھنا' کسی مخصوص تحریک کو کچلنا اور دہشت گردی کے نام پر مداخلت کرنا تاکہ جو مقاصد مذاکرات اور دھمکی سے حاصل نہ ہو سکیں انہیں اقوام متحدہ کے سائے تلے قوت کے ذریعے حاصل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر عراق میں کردوں کو پہلے بغاوت پر آمادہ کرنا پھر ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ کر ایسے حالات پیدا کرنے میں عراقی حکومت کی مدد کرنا جن سے کردوں کی آبادیوں میں خوف و ہراس پیدا ہوا اور پھر ان کی حفاظت کے لئے اقوام متحدہ سے مینڈیٹ لے کر ممنوعہ فضائی علاقے قائم کرنا' سوڈان کے جنوب میں بھی ایسے فضائی علاقے قائم کرنے کی تجاویز سامنے آئی ہیں۔

۳) انسانی حقوق کی شدید خلاف ورزیوں کا الزام عائد کر کے کسی بھی مخصوص ملک پر پابندیاں عائد کرنا' اقتصادی اور تجارتی بائیکاٹ کرنا اور اپنے مقاصد کے حصول کے بعد معاملات کو فراموش کر دینا۔

۴) انسانی حقوق کمیشن کے اجلاس میں شدید ترین خلاف ورزیوں کے معاملات کو بھی سبوتاژ کرنا' کسی مخصوص ملک میں مخصوص حالات میں خلاف ورزیوں کی بلا واسطہ اجازت دینا جیسا کہ انسانی حقوق کمیشن کے ۱۹۹۴ کے اجلاس میں پاکستان کو بھارت کے خلاف انسانی حقوق کی مقبوضہ کشمیر میں شدید ترین خلاف ورزیوں پر قرارداد مذمت پیش کرنے سے سفارتی انداز میں روک دیا گیا۔ اقوام متحدہ کا کمیشن' جن امور کو مسلسل نظرانداز کرتا ہے ان کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ ان میں سابقہ نو آبادیاتی دور کے تجربات کا عکس جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر

۱) جن ممالک میں بڑی طاقتوں' اقتصادی گروپوں اور سیاسی مفادات کے تحت کام کرنے والے گروپوں کا اثرورسوخ برقرار رکھنا ہو وہاں انسانی حقوق کی شدید ترین خلاف ورزیوں پر توجہ ہی نہ دینا حالانکہ وہاں انسانی زندگی بسااوقات جہنم بن جاتی

ہے۔ بھارت اس امتیازی سلوک کی بڑی واضح مثال ہے جہاں انسان کو ہریجن اور شودر بنا کر جانوروں سے بھی بدتر حالت میں رکھا جاتا ہے۔

" --- ۲ فروری ۱۹۹۴ کو حیدر آباد میں تعینات گڑھوال را ئفلز کے صوبے دار میجر پریم سنگھ کی قیادت میں ایک ٹرک میں سوار فوجیوں نے حیدر آباد کے لنگر حوض پولیس تھانہ پر حملہ کر کے وہاں پر موجود سپاہیوں بشمول اسسٹنٹ پولیس کمشنر کے سری ہری' ایس ایچ او اور مدن موہن اور سب انسپکٹر ڈی راجہ کو بری طرح زدوکوب کیا اور انہیں اپنے ٹرک میں لاد کر فوجی چھاؤنی لے کر چلے گئے۔ یہی نہیں' جاتے جاتے ان فوجی جوانوں نے اپنی فرقہ پرستی کا بھی ثبوت دیا اور پولیس تھانے سے ایک کلومیٹر پر واقع ایک مسلم بستی محمدی لائنس جا کر وہاں کے آٹھ مسلم گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ وجہ؟ فوجیوں کے خیال میں ان کے دو بچوں کے اغوا اور قتل کے پیچھے اس تھانے کی غفلت تھی جس کا ایک پولیس انسپکٹر مسلمان بھی تھا۔" ۔ 14

بھارت میں انسداد دہشت گردی کا قانون حکومت کا وہ سب سے بڑا ہتھیار ہے جو کسی بھی شہری کو گرفتار کرنے' غیر معینہ مدت تک زیر حراست رکھنے اور اس کے جملہ انسانی حقوق پامال کرنے کا باقاعدہ لائسنس بن جاتا ہے۔ اس قانون کے تحت 1993 سے قبل ہونے والی گرفتاریوں کی رپورٹ روزنامہ انڈین ایکسپریس نے اپنی ۱۱ اکتوبر کی اشاعت میں دی جس کے مطابق مختلف جگہوں سے گرفتار ہونے والوں کی تعداد یہ رہی

پنجاب	۱۳۴۵۷	ہریانہ	۹۱۲	مدھیہ پردیش	۱۰۳
گجرات	۱۴۰۹۴	اترپردیش	۸۵۱	اروناچل پردیش	۸۸
آسام	۱۰۷۷۹	مغربی بنگال	۵۲۰	ہماچل پردیش	۵۰
مہاراشٹرا	۱۱۲۵	راجستھان	۴۲۲	تری پورہ	۴۷
آندھراپردیش	۵۷۱۴	بہار	۱۹۰	کرناٹک	۲۶
منی پورہ	۱۰۰۳	تامل ناڈو	۱۴۷		

اسی طرح تقریباً دس ماہ کے عرصے میں ۵۲۳۶۸ انسانوں کو پابند سلاسل کر دیا

گیا لیکن اقوام متحدہ نے ان خلاف ورزیوں کا کوئی برائے نام نوٹس بھی نہیں لیا۔ اس روش نے حکومتوں کو یہ حوصلہ دیا ہے کہ وہ کسی بھی سیاسی مخالف کو دہشت گرد قرار دے کر قتل کر دیتی ہیں۔

۲) دوسرا بڑا عنصر یہ ہے کہ جن علاقائی وحدتوں یا خطوں میں بڑی طاقتوں کے پیش نظر کسی ریاست یا ملک یا آبادی کا اپنے مخصوص مفادات کے زیر اثر وجود ضروری ہوتا ہے اسے مختلف طریقوں سے برقرار رکھا جاتا ہے۔ حکومتوں کو مدد دی جاتی ہے کہ وہ اپنے عوام کو ہراساں کریں۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے اردگرد اسلامی ممالک میں مستقل عدم استحکام رکھا جاتا ہے۔ تاکہ وہاں گڑ بڑ کے نتیجہ میں سیاسی عمل پائیدار نہ ہو سکے اور امریکی و یورپی مفادات کے تابع حکومتیں کام کرتی رہیں جنہیں سیاسی عمل کے منصفانہ ہونے کی صورت میں اقتدار سے محروم ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ یہاں ایک بڑا ہی دلچسپ تضاد سامنے آتا ہے جب مقبوضہ عرب علاقوں میں ہونے والے ہنگاموں میں فلسطینی عوام کو نشانہ بنانے کے لیے ان پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اسرائیلی قابضین کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ جو لوگ قابض ہیں وہ معصوم ٹھہرتے ہیں اور جو اس قبضے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں وہ مجرم بن جاتے ہیں۔ نیوز ویک کا نمائندہ لکھتا ہے۔

"اسرائیلی قبضے کے خلاف تحریک کا آغاز غزہ کی پٹی سے ہوا تھا۔ ایسا یہاں پر اسلامی عسکری تنظیم حماس نے کیا تھا۔ مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس کے برعکس اس خطے کی اہمیت فوجی اعتبار سے اسرائیل کے لیے بہت معمولی ہے اس خطے میں کوئی زیادہ اقتصادی صلاحیت بھی نہیں ہے تو پھر اسرائیل اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟

بہت سے اہم اسرائیلیوں سمیت کابینہ کے دو ارکان کا کہنا ہے کہ اسرائیل کو یہ علاقہ چھوڑ دینا چاہیے جب کہ دوسرے جن کی قیادت وزیراعظم رابن کرتے ہیں وہ غزہ کی پٹی کو اس وقت تک اپنے زیر قبضہ رکھنا چاہتے ہیں جب تک اسے کسی امن معاہدے کے ذریعے مشروط نہ کر دیا جائے"۔[15]

اس نقطہ نظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسرائیل پی ایل او معاہدہ پر غور کریں تو سارے منصوبے کا تارو پود بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اقوام متحدہ اور امریکہ نے ایک ایسے کام کے لیے عربوں کی ساری قوت تباہ کرکے رکھ دی جو اسرائیل کے مفادات کے لیے ضروری تھا لیکن اس سے مقاصد کیا حاصل ہوئے! مقبوضہ عرب علاقوں پر اسرائیل کا حق تسلیم ہوا' جب مذاکرات جاری تھے ان علاقوں میں انسانی حقوق کی تنظیمیں اپنے افراد کے ذریعے بنوائی گئیں جو مذاکراتی ٹیم میں فلسطینی وفد کی طرف سے شامل تھے اب فلسطینی پولیس اریحہ اور جریکو میں امن بحال کرے گی اور یہ تنظیمیں اس کے خلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی چارج شیٹ تیار کرتی رہیں گی۔

۳) نئے عالمی نظام سے متصادم سیاسی قوتوں کو ان کے ممالک میں کچلنے کے لیے حکومتوں کو کھلی چھٹی دی جاتی ہے۔ لیبیا کو اس وقت تک کچھ نہیں کہا گیا جب تک وہاں اسلامی تحریک کے افراد پھانسی چڑھتے اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے لیکن مفادات کی بھٹی میں اس کی وقعت نہ رہی اور اسے بے دست و پا کرنا مقصود تھا تو پان ایم طیارے کے معاملے میں لیبیا کے ذریعے تباہی پر عدم ثبوت کے باوجود اقوام متحدہ نے پابندیاں عائد کر دیں یہ پابندیاں پہلے امریکہ نے عائد کیں جن کو بعد میں سلامتی کونسل کی قرار داد نے اقوام متحدہ کا لبادہ اوڑھا دیا۔

۴) مختلف ملکوں میں اپنی پسند کی حکومتیں قائم کرنے' وہاں کے لوگوں کے ووٹ کے حق کو پامال کرنے میں امریکی اقدامات کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے۔ الجزائر میں اسلامی سالویشن فرنٹ کی انتخابی جیت کو فرانس اور امریکہ نے مل کر ایک ایسی خانہ جنگی میں بدل دیا جس سے اسلام پسندوں کو اقتدار میں آنے سے روکنا مقصود تھا۔ امریکی ترجمان نے کہا کہ سب کچھ الجزائر کے آئین کے مطابق ہو رہا ہے۔ اقوام متحدہ نے ان علاقوں میں اور اس قسم کے معاملات میں ووٹ کے حق کو تسلیم کرانے کے لیے کیا کردار ادا کیا؟ اس نے الجزائر کی حکومت کو جو خود اپنے وجود کا قانونی جواز فراہم کرنے میں ناکام رہی جنرل اسمبلی میں کیسے بیٹھنے دیا؟ اس کے

برعکس ہیٹی میں امریکہ کے کردار کو سامنے رکھا جائے تو بالکل مختلف صورت سامنے آتی ہے جہاں ایک سیاسی حکمران کی فوج کے ہاتھوں برطرفی پر ساری امریکی قیادت پریشان رہی اور فوجی مداخلت کے امکان پر بھی غور کیا گیا کہ کس طرح ہیٹی کے فوجی حکمرانوں کو سیاسی حکمران کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے!

۵) اقوام متحدہ نے امن مشن ترتیب دیتے ہوئے بعض دیگر مقاصد کے حصول کے لیے بھی کام جاری رکھا۔ امن مشن کے لیے جانے والی امن فوج میں متحارب ممالک کی افواج کے دستے شامل کرائے گئے۔ مثال کے طور پر صومالیہ میں پاکستان اور بھارت کو غیر فطری طریقے سے قریب لانے کے لیے ان کے فوجی دستوں کو امن فوج میں شامل کیا گیا تاکہ پاکستان میں قوت کے سرچشموں کو بھارت سے صلح صفائی سے رہنے کا عادی بنایا جا سکے اور وہ مقبوضہ کشمیر کے مسئلہ پر بھارت کے خلاف کسی سخت اور غیر لچکدار موقف کو اختیار نہ کریں۔ کیا ایسی صورت میں دونوں فریقین کے مفادات کا تحفظ ممکن ہوا؟ اس سوال کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔

انسانی حقوق کی پامالی کے بڑے پیمانے پر ہونے کا اندازہ مہاجرین کی اس تعداد سے بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ملکوں سے نکل کر دوسرے ملکوں کی سرحدوں میں موت و زیست کی جنگ لڑ رہی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ان کے گھربار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ لوگوں کو زیادہ تر لسانی اور نسلی بنیادوں پر قتل کیا گیا اور انہیں دربدر کر دیا گیا۔ جنوبی ایشیا میں تقریباً" تین لاکھ روہینگیا مسلمانوں کو برما کی حکومت نے بنگلہ دیش ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان مسلمانوں کی سالیڈیریٹی آرگنائزیشن نے اپنے ایک نیوزلیٹر (یکم فروری 1994) میں اقوام متحدہ کے کردار پر لکھا کہ

" جینوا میں حال ہی میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے کمیشن نے دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر بحث کرنا ہے اس بحث میں زیادہ زور نو آبادیاتی اور دیگر آزاد ممالک اور علاقوں پر دیا جائے گا......... جہاں تک برما کا تعلق ہے اقوام متحدہ کے اس ادارے نے اب تک فوجی حکمرانوں کی

مذمت میں قرار دادیں ہی پاس کی ہیں یا پھر ان پر اقتصادی پابندی لگانے کا کہا ہے۔ اس صورت حال سے برما کے حکمران مشتعل ہی ہوتے ہیں انہوں نے ان قراردادوں کے جواب میں نہ تو برما کے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا چھوڑا ہے اور نہ ہی اقوام متحدہ کے مطالبے پر عوام کے خلاف شدید اور سنگین نوعیت کے جرائم کے ارتکاب سے خود کو باز رکھا ہے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ ان کی حکومت کو کمزور بھی نہیں کر سکتا"

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ستمبر 1991 میں مسلمانوں کو برما میں قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ سینکڑوں قتل کر دیئے گئے ان کے گھربار کھیت اور فصلیں قبضے میں لے لی گئیں۔ مساجد اور مدرسے تباہ کر دیئے گئے۔ عورتوں کو فوجی کیمپوں میں اغوا کرکے لے جانا اور ان کی آبروریزی کرنا معمول بن گیا عورتوں بچوں اور بوڑھوں سے فوجی بیگار لی جاتی رہی اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ان حالات میں یہ مسلمان بنگلہ دیش میں پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے۔ برما اور بنگلہ دیش نے ان مہاجرین کی واپسی کے ایک معاہدے پر دستخط کئے لیکن اس معاہدے کے ذریعے وہ تحفظات فراہم کرنے میں اقوام متحدہ ناکام رہی جو ان مہاجرین کی بحفاظت واپسی اور ان کے آبائی گھروں میں ان کی آباد کاری کو یقینی بناتی اس بات کا بھی کوئی اہتمام نظر نہیں آیا کہ اراکان (برما) میں ان مسلمانوں کے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جا سکے گا یا نہیں۔ اگست 1992 میں ایمنسٹی نے بیس کے قریب حکومتوں کو خطوط کے ذریعے اس صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ جب تک اقوام متحدہ کے کمشنر برائے مہاجرین اس کام کی دیکھ بھال نہیں کریں گے۔ یہ معاملہ حل نہیں ہو گا۔ ایمنسٹی کا کہنا تھا کہ جب تک برما میں ایک مضبوط امن فوج موجود نہیں ہو گی تب تک انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اقوام متحدہ کا ادارہ یہ سہولت فراہم نہ کر سکا اس لیے کہ سلامتی کونسل اس کے لیے تیار نہ تھی۔

چین اور امریکہ کشمکش انسانی حقوق کے مسئلہ پر امریکہ اور چین کے درمیان سرد جنگ بھی ایک دلچسپ بحث ہے جس کا انجام یہ ہے کہ امریکہ اب تک اپنے کلچر کو چین میں فروخت کرنے میں ناکام رہا ہے اور یہی ناکامی انسانی حقوق کے معاملے کو ایک بنیاد بنانے کا

سبب بن گئی ہے۔

"چین نے ایسی تمام سیاسی اور اقتصادی اصلاحات سے انکار کر دیا جو امریکہ وہاں نافذ کرانا چاہتا تھا۔ ان اصلاحات ذریعے چین نے امریکہ کی وہ خواہش پوری نہ ہونے دی جو امریکی کلچر کو رواج دینے کا سبب بنتی۔ چین نے امریکہ کا خریدار بننے سے انکار کر دیا۔ " سیاسی قیدیوں" کی رہائی کا معاملہ (جس میں صرف قیدی رہا کرانا مطلوب تھے جن کی امریکہ کو ضرورت تھی نہ کہ سارے سیاسی قیدی) قیدیوں کی تیار کردہ مصنوعات کی برآمد روکنے کا مطالبہ جیلوں کے معائنے کے لیے غیر ملکی انسپکٹروں کو اجازت دینے کی بات وغیرہ یہ سب باتیں چین نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی دھمکی دی گئی کہ ان مطالبات کو ماننے سے انکار کا نتیجہ یہ ہو گا کہ امریکہ چین کو مراعات یافتہ ملک (Most Favoured Nation) کی سہولت نہیں دے گا۔ امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے ان مقاصد کے حصول کے لیے چین کا دورہ بھی کیا اور چینی قیادت کو باور کرانا چاہا کہ ان مطالبات کی منظوری نہ ہونے سے چین کو M F N کی سہولت نہیں مل سکے گی۔ چین نے جواب دیا کہ وہ امریکہ کی اس ہدایت کو اپنے اندرونی معاملات میں مداخلت سمجھتا ہے اگر چین سے سہولت واپس لی گئی تو اس کے برعکس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔امریکہ چین کے خلاف ناکام رہا۔

چینی قیادت نے امریکہ کو یاد دلایا کہ اس وقت انسانی حقوق کے حوالے سے بہت سی دستاویز دنیا میں موجود ہیں لیکن امریکہ کے دستخط صرف ایک پر موجود ہیں۔ جب کہ دیگر چھ کنونشن ایسے ہیں جن پر امریکہ نے ابھی تک دستخط نہیں کئے۔ امریکہ کا اصرار ہے کہ اس کا آئین اور قانون ان پر برتری رکھتا ہے۔ ایک طرف اس کا یہ کہنا ہے کہ " وہ انسانی حقوق کا محافظ ہے" جب کہ دوسری طرف وہ ان کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے صومالیہ میں خواتین پر فائرنگ کی بچوں کو قتل کیا اس نے کھلے عام اجازت دے رکھی ہے کہ اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں میں فلسطینیوں کو قتل اور ہراساں کیا جائے۔ وہ دیگر ممالک کے سیاسی اور سماجی نظام میں مداخلت کرتا ہے۔ ان ممالک کے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں ہے اس لیے انہیں امریکہ کی مرضی تسلیم کرنا پڑتی ہے۔ چین نے کہا کہ اسے امریکہ کا یہ طرز عمل پسند نہیں ہے"۔۔۔ 16

امریکہ کو علم ہے کہ چینی قیادت کو دبانا ممکن نہیں ہے اس لیے انسانی حقوق کے

معاملے کو ایک اور رنگ دینے کے لیے کام کا آغاز کر دیا گیا۔ چین میں عیسائیوں کی سرگرمیوں کو مانیٹر کر کے وہاں یہ ظاہر کرنا پالیسی کا حصہ ٹھہرا کہ ریاستی تشدد کے باوجود چرچ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس حوالے سے پروپیگنڈہ کو تیز کرنے کے لیے امریکہ کے میڈیا نیٹ ورک نے کام کا انداز تبدیل کیا۔ عیسائی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک امریکی رسالے نے لکھا

" ان (چینیوں) کی سیکیورٹی فورسز اب بھی زبردستی چرچ بند کرتی ہیں غیر ملکی مشنریوں کو چین سے نکال دیا جاتا ہے یا بند کر دیا جاتا ہے بعض معاملات ان کے قتل سے متعلقہ بھی سامنے آئے ہیں۔ مقامی پادریوں کو قتل کیا گیا ہے۔...... چین میں مسیحی ہونے والوں میں نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کیمونزم نے روحانی خلا پیدا کر دیا تھا۔ چینی لوگ اس خلا کو پر کرنے کے لیے تیزی سے عیسائیت قبول کر رہے ہیں"

" مستقبل میں عیسائیت کے احیاء کے امکانات چین میں بڑے روشن ہیں۔ زیر زمین گرجا گھر اب باقاعدہ سامنے آ کر کام کر رہے ہیں ریاستی قانون کے تحت چلنے والے گرجا گھروں نے بھی خود کو زیادہ آزاد کر لیا ہے ان کو دبانے والے قوانین اور ضابطے اب زیادہ قوت نہیں رکھتے اس لیے ان کا نفاذ نہ ہونے کے برابر ہے۔" 17

یہی میڈیا جب اسلام کے احیاء کی کسی تحریک کو دیکھتا ہے یا کہیں مسلمانوں کو اجتماعی طور پر کسی مطالبے میں شریک ہی دیکھتا ہے تو اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں اور اسلام ایک خطرے کے طور پر نظر آنے لگتا ہے۔ مصر میں مسلمانوں پر ان کے حکمرانوں کے مظالم کا جواز ان الفاظ میں فراہم کیا جاتا ہے۔

" مصری حکومت کو اسلامی انتہا پسندی (یہاں انتہا پسندی اور عیسائیت کے معاملہ میں احیاء کی تحریک بن جاتی ہے) سے بجا طور پر تشویش ہے یہ ایک خطرہ ہے۔ ان میں سے (اسلامی تحریک کے کارکنوں کو) گرفتار کر کے قید سخت میں رکھا گیا ہے ان کی تعداد سینکڑوں میں ہے انہوں نے افغانستان میں اشتراکیت کے خلاف لڑتے ہوئے تربیت حاصل کی ہے۔ پچھلے سال اگست میں (مصری) حکومت نے انسداد دہشت گردی کا ایک قانون متعارف کرایا تھا جس کے ذریعے بیرون ملک فوجی تربیت لینا سزائے موت کے برابر جرم قرار دیا گیا۔ اس کے تحت دسمبر(1992) میں آٹھ نوجوانوں کو سزائے موت دے دی گئی ان پر ملک سے باہر

فوجی تربیت حاصل کرنے کا الزام تھا۔"

آگے چل کر تجزیہ نگار لکھتا ہے۔

"کیا مصر اسلامی انتہا پسندوں کے خلاف جنگ میں کامیاب ہو رہا ہے یا ہار رہا ہے۔ ریاستی سلامتی کے نام پر سیاسی تشدد بعض اوقات رد عمل کا اظہار بھی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اسلامی انقلابیوں پر سخت ہاتھ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان سے تعاون کا ہاتھ بھی بڑھایا ہے۔ اب ریاستی ٹی وی پر مذہبی پروگراموں کا دورانیہ تیس فیصد کر دیا گیا ہے۔ درحقیقت حکومت ملک کے اندر موجود دباؤ کے سامنے جھک گئی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مصریوں میں اسلامی جنون میں اضافہ ہوا ہے۔"۔ 18

سوڈان کے خلاف مہم سوڈان کے خلاف مہم بھی انسانی حقوق کے نام پر جاری ہے سوڈان کے خلاف چارج شیٹ کا مضمون یہ ہے کہ

" سوڈان کی حکمران جماعت، نیشنل اسلامی فرنٹ" نے ملک کے تمام سول اداروں پر اپنا مضبوط کنٹرول قائم کر کے حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ فرنٹ نے پانچ ہزار افسروں پر مشتمل فوج ترتیب دی ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی ہے ہزاروں باغی اساتذہ اور سرکاری ملازم برطرف کر دیئے ہیں۔ سیکیورٹی فورسز باقاعدگی سے سیاسی مخالفین کو گرفتار کرتی ہیں انہیں ٹارچر سیلوں میں لے جا کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے جن لیڈروں کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا ہے ان میں ملک کے برطرف صدر صادق المہدی شامل ہیں۔ عیسائیوں کو برابر ہراساں کیا جاتا ہے اور بائبل کی تعلیم دینے والی کلاسیں ختم کر دی گئی........"۔ 19

سوڈان کو نشانہ بنانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا اسے سمجھنے کے لیے ایک اہم لیکن طویل ملخص سے مدد ضروری ہے (مقصد کے پیش نظر اقتباس کی طوالت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مصنف) اس کے مطابق

"اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے انسانی حقوق نے سوڈان میں انسانی حقوق کی صورت حال پر پہلی بار اپنے 47 ویں اجلاس منعقدہ 1991 میں غور کیا۔ اکنامک اینڈ سوشل کونسل کی قرار داد 1503 (xlviii) منظور شدہ 27 مئی 1970 کے تحت کانفیڈنشل پروسیجر اختیار کیا گیا۔ 12 مئی 1992 کو کمیشن نے مسٹر گاسپر بائیو (Gasper) کو آزادانہ کام کے لیے بطور ماہر مقرر

کیا۔ انہیں حکومت سوڈان نے ہر طرح سے مدد اور تعاون فراہم کیا تاہم اس آزاد ماہر کی رپورٹ سے قبل ہی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنے 49 ویں اجلاس میں سوڈان کے بعض مخالف ممالک کی درخواستوں پر ایک قرار داد نمبر ۱۳۲ / ۴۷ بتاریخ 18 دسمبر 1993 کو منظور کر لی۔ امریکہ نے تمام سفارشات مسترد کر دیں اور کمشن نے 10 مارچ 1993 کو ایک قرار داد منظور کر لی۔ اس قرار داد کے ذریعے سوڈان میں انسانی حقوق کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے ایک خصوصی نمائندے کا تقرر کیا گیا جسے جنرل اسمبلی کے 48ویں اجلاس اور کمیشن کے 50ویں اجلاس کو اپنی سفارشات پیش کرنا تھیں۔

یہ مرحلہ وار کام ایک مستقل طریقہ کار کو ظاہر کرتا ہے اس سے امتیازی سلوک' جانبداری اور غیرواضح مقاصد کے لیے اقوام متحدہ کے کمشن برائے انسانی حقوق کو استعمال کرنا مقصود ہے تاکہ مخصوص سیاسی نتائج حاصل ہو سکیں۔ ڈاکٹر گاسپر بائیرو نے اپنی پہلی رپورٹ پر ایک دستاویز (B/cn.4/1994/48) پیش کی جس سے انہی مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے طریقہ کار واضح ہوتا ہے اس نے کہا کہ سب سے اہم مقصد تو یہی ہے کہ سوڈان میں نافذ اسلامی شرعی قوانین کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔ اس سے ہی خصوصی نمائیدے کے کام کے ایجنڈے کا علم ہو جاتا ہے"

" خصوصی نمائندے کو جو ذمہ داری دی گئی تھی اس نے اس سے صریحا انحراف کیا۔ اس نے

(۱) اقوام متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل (۱) کی ذیلی شق (۳) کے تحت اس اصول کو پامال کیا کہ " انسانی حقوق کے احترام کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اور تمام بنیادی آزادیوں کو کسی قسم کی نسلی' جنسی' لسانی یا مذہبی امتیاز کے بغیر فروغ دیا جائے گا

(۲) اس نے انسانی حقوق کے عالمی اعلان کے آرٹیکل (18) کے خلاف کام کرتے ہوئے اس کو پامال کیا۔

(۳) اس نے آرٹیکل (۲) کی ذیلی شق (۷) کے بھی خلاف کام کیا

اس خصوصی نمائندے نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں بتایا کہ سوڈان کے پینل قوانین عالمی کنونشن سے کہاں متضاد ہیں۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اسلامی شرعی قوانین اور پبلک لاء میں کیا تعلق ہے اور یہ کہ یہ قوانین کس طرح عالمی قوانین کا تحفظ کرتے ہر

اب ان الزامات کا جائزہ لیتے ہیں جو اس نمائندے نے عائد کئے تھے (ان کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ کیا جا رہا ہے)

(۱)اس رپورٹ میں بار بار ایسے ٹارچر سیلوں کا حوالہ دیا گیا جہاں مبینہ طور پر نظربندوں پر تشدد کیا جاتا ہے۔ حکومت سوڈان نے بارہا تردید کی کہ ایسے کوئی سیل یا " بھوت گھر" سوڈان میں موجود نہیں ہیں۔ حکام کا کہنا ہے کہ خصوصی نمائندہ خرطوم میں موجود رہا اور اس نے یہاں اس قسم کے مراکز کی طرف نشان دہی کی لیکن اپنے قیام کے دوران میں اس نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ اسے ان مراکز میں لے جایا جائے۔ اگر حکام نے انکار کیا ہوتا تو وہ اس انکار کو اپنی رپورٹ میں پیش کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے تصدیق کئے بغیر الزامات عائد کئے۔

(۲) اس نے امدادی گاڑیوں کے دونوں طرف مسلح فوجیوں کے چلنے کی طرف اشارہ کیا جو ان ریل گاڑیوں کو لوٹنے سے بچانے کے لئے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس نے اس بنیاد پر انسانی مداخلت کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کی لیکن اس بات کو فراموش کر دیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پانچ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے والی امدادی ٹرین کے دونوں سمت فوجی محافظ پیدل چلیں اور اسے باغیوں سے بچا سکیں!

(۳) نمائندے نے حکومت سوڈان کو ایک فہرست دی جس میں کہا گیا تھا کہ ان افراد کو گرفتار کیاگیا ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے افراد کا سرے سے وجود ہی نہ تھا بعض رہا ہو چکے تھے بعض افراد کو غیر جانب دارانہ مقدمہ کی سماعت کے بعد سزا ہوئی تھی جن افراد کے بارے میں کہا گیا کہ انہیں عدالتی کاروائی کے بغیر سزائے موت دی گئی ہے وہ خود نمائندے کے سامنے حاضر ہوئے اور ثابت کیا کہ غلط الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ نمائندے نے ان باتوں کا اپنی رپورٹ میں ذکر نہیں کیا۔

حکومت سوڈان نے اس قسم کے دیگر الزامات کا بھی مکمل جواب دیا اور اس بنیاد پر انسانی حقوق کے کمشن سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے پر غور کی تحریک کو نا منظور کرے۔ اگر کمشن یہ درخواست مسترد کرتا ہے تو حکومت سوڈان کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ اسلامی حکومت سوڈان کے خلاف اس کے جانبدارانہ رویے' پیشہ ورانہ اہلیت کے نہ ہونے اور بے مقصد تحقیقات کرنے والے نمائندے گاسپرو کو سوڈان میں داخل نہ ہونے

دے۔"۔ 20

سوڈان کے خلاف الزامات اور اسے انسانی حقوق کے نام پر عالمی سطح پر بلیک میل کرنے کا اگلا قدم اسے دہشت گرد قرار دینا تھا۔ امریکہ نے سوڈان کو دہشت گرد قرار دیا اور اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا مجرم ٹھہرایا لیکن ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اپریل 1993 کی رپورٹ' جس میں جنوری سے دسمبر 1992 تک کے دورانیے کی انسانی حقوق کے بارے میں تفصیل درج ہے' امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی رپورٹ' دفتر خارجہ کی رپورٹ' اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسداد امتیازی سلوک' عرب ورلڈ ہیومن رائٹس آرگنائزیشن اور سوڈان بار ایسوسی ایشن کی رپورٹوں میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔ امریکہ' برطانیہ اور اسرائیل کے ساتھ موازنے سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی درج ذیل صورت حال ان ممالک میں جنوری سے دسمبر 1992 تک یوں رہی ہے۔

خلاف ورزی کی نوعیت	امریکہ	برطانیہ	اسرائیل	سوڈان
پناہ لینے والوں کے معاہدے کی خلاف ورزیاں		4·321	89	520
ضمیر کے قیدی	33	41	4221	3
قوت کا بے محابا استعمال	630	1132	10·987	14
جسمانی تشدد	310	981	20·110	7
مسلح افواج کی طرف سے غیر منصفانہ قتل	43	685	82·11	1
تفتیش کے دوران زیادتی اور تشدد	733	418	9·342	31
دوران حراست ہلاکتیں	19	6	10	0
وطن سے بے دخلی	13	5	416	0
شہریوں سے ناروا سلوک	222	46	2100	0
بجلی کے ذریعے قیدیوں پر تشدد	82	46	816	0
مار پیٹ کے واقعات	94	32	3211	14
پولیس کے کتوں کا غیر ضروری استعمال	47	16	1·827	0
مقامی افراد کے خلاف تشدد	3·121	49	14·222	69
عدم انصاف کے واقعات	49	132	609	0

فرقہ کی بنیاد پر قتل و غارت	22	1	29	1
حصول انصاف میں رکاوٹ	14	89	96	0
بچوں کے خلاف تشدد	161	339	1719	0
بغیر خبردار کئے قتل	49	92	212	0
مذہبی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات	6	29	42	0
سیاسی مہاجرین کی بے دخلی	9	32	0 191	
غائب ہونے کے واقعات	0	0	91	2
جائیداد کی ضبطی	0	0	3114	29
پھانسی	31	0	0	1
تشدد اور مارپیٹ	535	1121	26618	21

مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی صورت حال بھارت کی مسلح افواج کے ہاتھوں مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بوسنیا پر سرب جارحیت سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جس طرح سربوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے لیے بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام کیا اسی طرح بھارتی مسلح افواج نے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں۔ ان کے طریقہ کار میں مندرجہ ذیل باتوں کو اہمیت حاصل ہے۔

(ا) قتل و غارت بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں پندرہ سال سے لے کر پچاس سال کے ہر مرد کو تشدد کا نشانہ بنایا اور اس عمر میں مردوں اور نوجوانوں کا بالخصوص قتل عام کیا۔ بھارت کے تسلط کے خلاف تحریک کے پہلے دو سالوں میں دس ہزار افراد قتل کر دیئے گئے۔ اب تک قتل کئے جانے والوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔

قتل وغارت کے لیے مظاہرین پر بے دریغ فائرنگ جیسا کہ بیج بہاڑا میں واقعہ رونما ہوا' گھر گھر تلاشی کے دوران فائرنگ کر کے مارنا' گرفتاری کے دوران قتل کرنا' دوران حراست تشدد سے قتل کرنا اور مجاہدین کے ساتھ جھڑپوں میں انہیں شہید کرنا شامل ہے' گھروں کو آگ لگا کر مکینوں کو زندہ جلا دینا بھی بھارتی فوج کے سیاہ کارناموں کا حصہ ہے۔ تقریباً چار سو افراد اس طرح زندہ جلائے گئے 1863 افراد کو تشدد کر کے ہلاک کیا گیا۔ آزاد کشمیر آتے ہوئے بھی سینکڑوں کشمیری بھارتی فوج کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہے اور بن رہے ہیں۔

(ب) **آبروریزی** گھر گھر تلاشی کے دوران اور عام گشت کے دنوں میں بھی بھارتی فوجیوں کو باقاعدہ ہدایت کی گئی کہ وہ مسلم خواتین کی عصمت دری کریں۔ کونان پش پورہ کا واقعہ ساری دنیا میں مشہور ہوا۔ سری نگر ہسپتال کے ملازمین کی بیویوں کو مئی 1994 میں اجتماعی آبروریزی کا نشانہ بنایا گیا۔ مقامی آبادی کو حواس باختہ کرنے کے لیے یہ طریقہ بھارتی افواج عام طور پر استعمال کرنے لگی ہیں۔

(ج) **گرفتاریاں** بھارت نے ٹارچر سیلوں' جیلوں اور پرانے قلعوں میں مسلمانوں کو قید میں رکھا ہے۔ مقبوضہ کشمیر سے گرفتار ہونے والے مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ راجستھان کی جیلیں بھی ان سے بھری ہوئی ہیں۔ سید علی گیلانی کو تہاڑ جیل دہلی میں رکھا گیا۔ ان گرفتاریوں کی وجہ سے تقریباً" پچاس ہزار خاندانوں کا ذریعہ معاش ختم ہو گیا ہے۔

(د) **مکانات اور دکانوں کا جلا دینا** بھارتی فوج اب تک سات ہزار مکانوں اور سات ہزار دکانوں کو جلا چکی ہے۔ جہاں بھارتی فوج کو شک ہو کہ یہاں کوئی مجاہد روپوش ہے بغیر کسی وارننگ کے گن پاوڈر چھڑک کر اس مکان یا دکان کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ اس طرح لوگوں کی رہائش سہولتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں جائیداد تباہ اور ذریعہ معاش ختم ہو جاتا ہے۔

(ر) **ملازمت سے برطرفی** سینکڑوں ہزاروں مسلمانوں کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا ہے۔ ان کی جگہ جنہیں بھرتی کیا جاتا ہے انہیں بھی جلد فارغ کر دیا جاتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی بیوروکریسی ان کی تنخواہیں کھا جاتی ہے۔ خاندانوں کو ہراساں کرنے کے لیے یہ طریقہ بھی کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام اس ساری بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انسانی حقوق کا موجودہ مسئلہ اخلاقی اور انسانی سے زیادہ سیاسی ہے۔ اس کا ایک استعمال عیسائیت کی تبلیغ کے لیے بھی ہوتا ہے۔ جسے انسانی حقوق کے نعرے میں اپنا کام کرنے میں آسانی محسوس ہوتی ہے۔ انسانی حقوق کا تحفظ ہر انسان' ہر سماج اور ہر ادارے کی بھی اتنی ہی بڑی ذمہ داری ہے جس قدر یہ ذمہ داری حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی کرنے والی حکومتوں کو

مخصوص سیاسی حالات اور مفادات کے پیش نظر انہی قوتوں کی آشیر باد بھی حاصل رہتی ہے جو انسانی حقوق کا نعرہ بہت شد و مد سے لگا رہی ہیں۔

عالم اسلام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی' اسلامی تحریکوں پر انہیں پامال کرنے کا الزام محض ایک سراب ہے۔ اصلی واقعہ تو یہ ہے کہ یورپ نے انسان کو انسان کے روپ میں نہیں دیکھا بلکہ اسلام نے اسے ایک ایسی مخلوق کے روپ میں پیش کیا ہے جو تمام مخلوقات سے افضل اور اشرف ہے۔ انسان کے بارے میں قرآن کا پیغام اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ نشان منزل بھی ہیں اور اصل مقصد بھی ہیں۔ اسلامی تحریکوں کو بنیاد پرست قرار دے کر انہیں انسانی حقوق کی پامالی کی مجرم قرار دینا مغربی دنیا کی کمزوری ہو سکتی ہے انسانیت کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے انسانیت تو جہاں سے بھی اپنی ترویج اور تحفظ کا سامان دیکھے گی اسے حاصل کرے گی اسے سب سے زیادہ سکون اسلام کے سایہ عاطفت میں ہی ملتا ہے یہی اس کی بنیاد ہے اور یہی اس کی فطرت کی آواز ہے۔

-1

"Human Rights or Wrong"

Kunde Dixit - The Muslim - 30 Nov. 1992

-2

"MICRO AND MACRO OF HUMAN RIGHTS" - S.M. ZAFAR

The Nation - 3 March, 1994

-3

"Morality, East and West"

Dr. M. Raziullah Azmi

The News - 16 Feb. 1993

-4

"Through Western Eyes"

Janeen Kerper - Dawn, 2 Feb. 1993

-5

"Sexual Correctness"

Newsweek - 25 October, 1993

"Islam and Orientalism" -6

Maryam Jamilah

185 - 186 صفحہ

-7

"The Christian Democratic

Parties of Western Europe"

R.E.M. Irving - London 1979

36 صفحہ

-8

Encyclopedia Britanica

جلد 20 صفحہ 656-8

9- ایضاً صفحہ 660

10- "مقدمہ تفہیم القرآن" سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ صفحہ 17-18

11- "خطبہ حجۃ الوداع" مرتبہ محمد میاں صدیقی صفحہ 19-22

شعبہ دعوت و ارشاد - ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد - ذوالحجہ 1400ھ

12- "حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط" ڈاکٹر خورشید احمد

صفحہ 105 ادارہ اسلامیات لاہور - مئی 1978

13- "ٹائم" 14 دسمبر 1992ء ص23

14- "ماہنامہ افکار ملی" دہلی مارچ 1994ء ص32

15- "نیوز ویک" 22 مارچ 1993ء

16- May 1994 - P-10 Impact International London

17- "نیوز ویک" 23 مئی 1994ء

18- "نیوز ویک" 15 مارچ 1993ء

19- "نیوز ویک" 10 جنوری 1994ء

20- May 1994 - P-18,19 Impach International London

۱۲

دہشت گردی۔ الزام اور حقائق

پس منظر سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اہل مغرب نے اسلام کو دشمن نمبر ایک قرار دے کر اس کا راستہ روکنے اور مسلمانان اسلام کو ناکام بنانے کی حکمت عملی اختیار کی۔ بنیاد پرست مسلمان اور اسلامی بنیاد پرستی کی اصطلاحات کا استعمال کر کے مسلمان کو دہشت گرد اور اس کے فلسفہ حیات کو فقط دہشت گردی کا محافظ قرار دینا شروع کر دیا گیا۔

"دہشت گردی کے بارے میں خیال تھا کہ دنیا کی نئے حالات کی طرف مراجعت، سیاسی مصالحت کی پیش رفت، عالمی تصادم کے خاتمے اور منصفانہ سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ یہ کم ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن قوم پرستی کی کھلے عام جنگوں نے جو بلقان اور قفقاز میں میں لڑی جا رہی ہیں ایک متضاد صورت حال کو جنم دیا ہے دہشت گردی میں پہلے کی نسبت زیادہ اضافہ ہوا ہے ---- دہشت گردی کرنے والی تنظیموں کو ایک ہی نظر سے دیکھنا اس لیے ممکن نظر آتا ہے چونکہ یہ ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں گہرا تعلق قائم کرتی ہیں اور ان سب کو سوویت یونین کی پشت پناہی حاصل رہی تھی۔ مشرق وسطیٰ میں اس کے حامی بھی اسے امداد فراہم کرتے تھے۔ کیمونزم نے ان تمام تحریکوں کو یک جان کر کے ایک مقصد کے تحت لا کھڑا کیا تھا ---- ایک ہائیڈرا کی طرح ان تنظیموں کا وجود یا تو کیمونسٹ روس کی بدولت تھا یا پھر چین کی وجہ سے۔ مقامی حالات میں ابھرنے والا تصادم اس کی عام وجہ نہیں تھا اگرچہ اس میں بھی صداقت تھی"۔ 1

مغرب کا موقف ہے کہ سوویت یونین اور چین ان تحریکوں کی قیادت کرتے اور ان کو مہارت، تربیت اور سرمایہ اور نیٹ ورک فراہم کرتے تھے۔ مغرب خود کو دہشت گردی

سے بری الذمہ قرار دے کر اسلام کو مورد الزام ٹھہراتا ہے تاکہ اسے عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دیا جا سکے اور سرمایہ داری کے سائے میں عیسائیت کو عالمی مذہب کے طور پر سامنے لایا جائے۔ دو بڑے مذاہب میں کش مکش کو جاری رکھنے کی مغربی پالیسی عالمی امن کے لیے کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ لیکن صلیبی جنگوں کی روش نہ چھوڑنے والا مغرب اسلام کو "جاہلیت کا نظام" ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ پروفیسر ظفر علی قریشی کا ایک بہت خوبصورت مضمون جو روزنامہ دی مسلم کی 27 اگست 1993 کی اشاعت میں شامل کیا گیا۔ بہت جامعیت کے ساتھ اسلام اور مغرب کے مابین کشمکش کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ ظفر علی قریشی لکھتے ہیں۔

"عیسائیت اور اسلام کے ما بین تعلقات پر نظر ڈالتے ہوئے ایچ جی ویلز کہتے ہیں کہ "ان دونوں مذاہب کے مابین بالکل غیر منطقی اور برداشت نہ کرنے کی صلاحیت پروان چڑھتی رہی ہے اور ہمارے دور تک آن پہنچی ہے۔" فلپ کے ہٹی (PHILIP-K-HITTI) لکھتے ہیں "صلیبی زمانے کی جنگوں والے ماضی پر مشتمل یادیں اور مستقبل کی امیدیں نسلوں تک موجود رہی ہیں۔ Zoroastrianism اور بدھ مت کبھی بھی اس قدر تلخ گالم گلوچ اور مذمت کے قابل نہیں سمجھے گئے۔ وہ مغرب کے عہد قدیم میں ایک خطرہ ضرور تھے لیکن وہ مقابلے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ یہ مغرب کے اسلام کی طرف خوف پر مشتمل رویے، دشمنی اور تعصبات تھے جنہوں نے اسلام کے بارے میں مغرب کے نظریات کو بدل کے رکھ دیا اور اس کے کردار کو مشروط بنا دیا۔ اسلامی نظریات دشمن نظریات قرار پا گئے اور اسی طرح وہ مشکوک ٹھہرے اگر چہ وہ جھوٹے نہیں بھی تھے۔" واٹ کہتا ہے کہ "ایک مسئلہ یہ ہے کہ حادثاتی طور پر اس موضوع کا مطالعہ کرنے والے ابھی تک ان تعصبات سے باہر نہیں نکل سکے جو عہد قدیم کے آباؤ و اجداد سے مخصوص تھے۔" واٹ کہتا ہے کہ

In the bitterness of the crusades and later wars against the saracens they came to ragard the Muslims and in particular Muhammad (PBUH), as the incarnation of all that was evil and the continuing effect of this propaganda of that period has not yet completely removed

from the occidental thinking about Islam".

(Cambridage History of Islam)

ہینڈرک وان لون ہمیں بتا رہا ہے کہ "صلیبی جنگیں جاری ہیں" وہ لکھتا ہے۔
"وہ عظیم اساتذہ کے ماننے والے جو بہت ہی قریبی تعلق دار تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ شدید نفرت سے دیکھا اور بارہ صدیوں سے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ لڑتے آرہے ہیں یہ جنگ ابھی تک ختم نہیں ہوئی"

(Tolerance, New York)

ڈبلیو کانٹ ویل سمتھ بتاتا ہے۔ "یورپ نے اسلام کو صدیوں تک ایک دشمن اور خوف کی صورت میں دیکھا ہے اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماننے والوں کو مغرب میں ترجمان نہیں مل سکے۔ (بادنیٰ تصرف۔ ترجمہ) اس لیے اسلام کو بیرونی دنیا کے ایک مذہب کے طور پر بہت کم ہی جانا گیا اور اس کی تعریف کی گئی۔ کارل مارکس اور کیمونزم کے آغاز سے قبل تک اسلام ایک سنجیدہ خطرہ تھا جس سے مغربی تہذیب کو اس کی پوری تاریخ میں کوئی سابقہ پڑا تھا۔"

(Islam In Modern History, New York)

یہ حوالے دینے کے بعد پروفیسر ظفر علی قریشی لکھتے ہیں کہ اشتراکیت کے خاتمے کے بعد مغرب نے اپنی توپوں کا رخ پھر اسلام کی طرف کر لیا ہے۔ افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد امریکہ کے سابق صدر نکسن جیسے شخص نے بھی کہا کہ اب مغرب کو اسلام کی طرف توجہ دینا ہو گی یہی کچھ نکسن کی مراد تھی جو آج ہو رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کا تسلسل جاری ہے بلکہ خود صلیبی جنگ جاری ہے۔

موجودہ جنگ کا یہ پہلو بہت خوفناک ہے کہ مغرب نے مسلم حکمرانوں کو عالم اسلام کی تحریکوں جو اصلاحی و اقامتی تحریکیں ہیں دشمن قرار دے لیا ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے عمل سے مغرب سے اشتراک عمل کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مغرب مسلمانوں پر دہشت گردی اور بنیاد پرستی کا الزام عائد کرتا ہے یہی الزام مسلم حکمرانوں کی طرف سے اسلامی تحریکوں پر لگایا جاتا ہے۔ اس سازش کا مرکزی نکتہ اقامت دین کی جدوجہد کو جو پرامن بھی ہے اور بامقصد بھی ہے۔ نہ صرف روکنا بلکہ اہل اسلام کو جذبہ جہاد کے خلاف ابھارنا ہے۔ اس

وقت بھی بہت سے ایسے حکمران ہیں جو مسلم ممالک کی حکومتوں پر قابض ہیں اور ان کا موقف ہے کہ جہاد دہشت گردی کی سرپرستی کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اب بھی مغرب کا مطالبہ ہے کہ مسلمان جہاد ترک کر دیں اور راہب بن جائیں۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کے اپنے علاقوں میں ہی محصور بنایا جاتا ہے۔ بیلٹ کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ اس پر احتجاج کو دہشت گردی قرار دے دیا جاتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم دہشت گردی' اسلام پر اس ضمن میں الزامات اور دنیا بھر میں مغرب کے اسلام کے بارے میں' عالم اسلام کے بارے میں نظریات اور اقدامات کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی مختصر سا جائزہ پیش کریں گے کہ اس وقت دنیا میں دہشت گردی کا شکار خود مسلمان ہے جس کے خلاف ہر حربہ' ہر ہتھیار' اور ہر سفارتی ہتھکنڈہ استعمال ہو رہا ہے۔ مغرب نے جہاد افغانستان کو نئے دور میں دہشت گردی کی تربیت گاہ قرار دیا ہے اور انقلاب ایران کے دوسرے ملکوں میں پھیلنے کے موہوم خطرے کو پہاڑ بنا دیا ہے۔ جہاں مسلمان صیہونی اور عیسائی ظلم و ستم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دہشت گرد قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ مغرب مسلمان ملکوں کی اقتصادی ناکہ بندی کرتا ہے تاکہ بے روزگاری' ترقی سے محرومی اور اس طرح کے حالات پیدا کر کے مسلم ممالک میں بے چینی کو فروغ دے۔

ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ یورپ اور امریکہ کی سازشوں کا شکار مسلمان دو طرفہ حملے کی زد میں ہے اگر وہ بیلٹ کی طرف جاتا ہے تو اس کو حکومت سازی کا موقع نہیں دیا جاتا جیسا کہ الجزائر میں ہوا ہے۔ مغرب وہاں کی اسلامی تحریک کی کامیابی کو خواہ کسی رخ میں پیش کرے یہ امر تو تسلیم شدہ ہے کہ انہوں نے کامیابی بیلٹ باکس کے ذریعے حاصل کی تھی جس کے دوران میں ایک بھی بلٹ نہیں چلی تھی۔ مغرب خود ایسے حالات پیدا کر رہا ہے کہ جمہوری اور معروف سیاسی جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے حقوق نہ مل سکیں اور وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوں۔ اس سازش کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جب مسلمان ان علاقوں میں جہاں وہ غیر مسلموں کے زیر عتاب ہے' اپنی بقاء کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ معروف طریقوں سے آزادی چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے اور اسی حالت میں اسے ختم کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے جیسا کہ مشرق وسطیٰ' فلپائن' کشمیر اور وسط ایشیا میں ہو

رہا ہے۔ نظریاتی طور پر جب مسلمان اپنے عقائد کی اصلاح کے لیے مغربی استعمار کی میڈیا مہم کے خلاف اپنا بچاؤ کرنا چاہتا ہے تو جاہل اور پرانے خیالات کا حامل قرار پاتا ہے۔ اسلامی تشخص کا احیاء ہو یا آزادی کی تحریکیں' جہاد کرنا دہشت گردی بن جاتا ہے۔ باوجود یکہ جہاد کرنے والے صرف وقت ضرورت اور صحیح موقع پر اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔ مسلمان کی قوم پرستی کو تعصب کی حد تک لے جانے کی روش سے فطری نفرت کو بھی محل نظر ٹھہرایا گیا ہے اور مسلم سماج کی تعمیر کا کام تخریب کاری اور سیکولرازم کے خلاف بغاوت کہا جاتا ہے جس کی سزا سیاسی اور سفارتی علیحدگی ہے۔ سوڈان' ایران' افغانستان اور پاکستان جیسے اسلامی شناخت کے ملک دہشت گرد کہے جاتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے معمول کے باہمی رابطوں کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور باقاعدہ فرد جرم عائد کی جاتی ہے۔ آیئے ایک فرد جرم کا مطالعہ کرتے ہیں اس کا ماخذ امریکی ایوان نمائندگان کی Task force on Trrerorism And Conventional War fare کی یکم فروری 1993 کی ایک رپورٹ ہے۔

مغرب کی فرد جرم 1992 کے اختتام کے ساتھ ہی اسلامی دہشت گردی میں نہایت اہم اضافہ ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے ہنگامہ آرائی' توڑ پھوڑ اور اس قسم کی دیگر سرگرمیوں کو تقویت ملی ہے۔ ان سرگرمیوں کا ہدف بننے والے ممالک میں دوسروں کے علاوہ بھارت' پاکستان' اسرائیل' مصر' اردن' الجزائر' نائیجریا' صومالیہ بھی شامل ہیں۔ ان واقعات کے مختلف ماحول کے باوجود انہیں الگ الگ واقعات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ صیہونی اور عیسائی عالمی نظام کے خلاف اسلامی جہاد کے مربوط سلسلے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغرب میں دہشت گردی میں مستقبل میں زیادہ اضافہ ہو گا۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ اس اسلامی جہاد میں شیعہ مسلمانوں کے علاوہ سنی مسلمان بھی شریک ہو گئے ہیں۔ اور دونوں نے مل کر یا انفرادی سطحوں پر بہت سے جہادی گروپ بنا لیے ہیں۔ ان کو ایران کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ سوڈان کے شیخ ڈاکٹر حسن الترابی کی قیادت میں منظم ہو رہے ہیں۔ جو ایک عالمگیر اسلامی تحریک Islamist International کے لیے کام کر رہے ہیں جسے ایران کے مرحوم راہنما آیت اللہ خمینی نے بھی عالمی اسلامی انقلاب کے لیے لازمی قرار دیا تھا۔ جس کے لیے شیعہ اور سنی مسلمان مل کر اور متحد ہو کر عظیم شیطان کا مقابلہ کر

رہے ہیں اس تحریک کی باقاعدہ فوج بھی ہے۔ جسے مسلم تحریک اسلامی Armed Islamic Movement کہا جاتا ہے اس کا معروف نام انٹرنیشنل بریگیڈ ہے۔ اس تحریک نے اپنے افغانی لیڈروں کی قیادت میں کام شروع کیا۔ جن کی زیر نگرانی بہت بڑی تعداد میں کمانڈروں کو افغانستان میں باقاعدہ تربیت دی گئی تھی اور اب یہ سب کے سب مجاہدین کہلاتے ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد ایشیا' افریقہ اور یورپ میں اسلامی آزادی کی تحریکوں سے وابستہ ہے۔ ان کی سرگرمیاں' اسرائیل' اردن' عراق' کشمیر' مصر' الجزائر' تیونس اور فلپائن میں جاری ہیں۔ بوسنیا ہرزی گووینا میں ان کی سرگرمیوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ان مجاہدین کو ایران' سوڈان اور افغانستان میں تربیتی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ پاکستان رابطے کا کام کرتا ہے۔ ان کیمپوں یا مراکز میں مجاہدین کو جدید فوجی اور حربی طریقے بتائے جاتے ہیں۔ جدید اسلحہ کی تربیت دی جاتی ہے دہشت گردی کی ان تحریکوں کے درمیان تین امور بہت حد تک مشترک ہیں۔

(1) ایران کا انقلاب اسلامی جس کے اثرات اخوان المسلمون نے قبول کئے تھے اور اخوان کے بنیادی فلسفے میں تبدیلیاں آئیں جن کے نتیجے میں اخوان المسلمون نے دنیا میں عسکری گروپوں کے قیام اور امداد کا فیصلہ کیا۔

(2) ایران اور شام کی مدد سے جاری عالمی تحریک دہشت گردی سے متاثر ہونے والے لوگوں نے حزب اللہ کو اپنا آئیڈیل بنایا۔

(3) جہاد افغانستان نے لوگوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے اور عرب نوجوانوں نے بالخصوص افغان مجاہدین کے ساتھ مل کر جنگ کی اور خود بھی مجاہدین کہلائے۔

ایران کا انقلاب ایران کے اسلامی انقلاب کو آیت اللہ خمینی نے دنیا بھر میں پھیلانے کا اعلان کرتے ہوئے 21 مارچ 1980 کو جشن نو روز کے پیغام میں کہا تھا کہ

> "ہمیں دنیا بھر میں اپنے انقلاب کو پھیلانے کے لیے کام کرتے ہوئے ان عناصر کی باتوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہیے جو ہمیں ایسا کرنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام مسلم ملکوں کے جغرافیائی تفرقات کو تسلیم نہیں کرتا۔ ساری مسلم امت ایک ہے اسلام تمام مجبور اور مقہور انسانوں کا سرپرست ہے بعض طاقتیں

ہمیں تباہ کرنا چاہتی ہیں اگر ہم اب بھی بند دائروں سے باہر نہ نکلے تو ہمیں یقینی شکست ہو جائے گی۔ ہمیں دنیا کی سپر طاقتوں اور دیگر قوتوں کو صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ ہم اپنی مشکلات کے بوجھ کے باوجود اپنے اعتقادات پر عمل کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔"

اخوان المسلمون کو آیت اللہ خمینی کی تحریک سے آغاز میں شدید اختلاف تھا لیکن بعد میں ملاجلا ردعمل ہوا۔ مصر میں اخوان کے بعض حلقوں نے اس تحریک کو پسند کیا۔ عمر تلمسانی جیسے لوگوں نے انقلاب ایران کو خوش آمدید کہا تھا۔ متحدہ عالم اسلام سب مسلم لیڈروں کا مقصد تھا اور ہے۔ یہ لوگ مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کو اسلامی تقاضوں کے مطابق لازمی قرار دیتے ہیں۔ جس کو بروئے کار لانے کے لیے وہ جہادی تنظیمیں بناتے ہیں۔ اس لیے ایران کے انقلاب کے آپریشنل حصے کو پسند کیا گیا اور ان جہاد گروپوں نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ ان گروپوں نے وہی طور طریقے اختیار کئے جو حزب اللہ لبنان میں اختیار کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے۔ عرب قوم پرستی کے خاتمے کے بعد عرب نوجوانوں میں یہ جہادی گروپ بہت مقبول ہوئے اور انہوں نے بالخصوص قبلہ اول کی آزادی کے لیے جہاد کو راستہ قرار دیتے ہوئے ان گروپوں کی رکنیت اختیار کی۔ عرب مغربی گروپوں نے یورپ میں دہشت گردی کی کارروائیاں کی تھیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو پان اسلام کی طرز پر ایک کرنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک "عرب مسلمان اور عرب نسل کی حیثیت سے اب تک ایک سراب تہذیب کے تعاقب میں رہے ہیں۔ جسے مغربی تہذیب نے زہر آلود کر دیا تھا۔ ہمیں شدید مخالفانہ حالات کے باوجود ایسے مواقع اور طریقے تلاش کرنا چاہئیں جن سے ہم اپنے مشترکہ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کے لیے ہمیں مسلم امت اور مسلم ممالک میں قوت تلاش کرنا ہو گی انہیں صیونیت کے خلاف متحرک کرنا ہو گا۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہو گا تاکہ اسلام کی اصل روح کے مطابق اس کا مکمل سیاسی نظام بھی نافذ کرایا جائے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے ہمارے آباؤ اجداد کو دنیا بھر کا حکمران بنا دیا تھا۔

ایران نے 1980 کے عشرے کے وسط میں اس بات کی شعوری کوشش کی تھی کہ دنیا بھر میں سنی اور شیعہ دونوں قسم کے مسلمانوں کی مشترکہ تربیت کے لیے ایک اسلامی فرنٹ

بنایا جائے۔ اس خیال کو سنی مسلمانوں نے بھی تسلیم کیا تھا تاکہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم میسر آسکے۔ 1984 کے وسط میں ایرانی حکام نے حزب اللہ کے ساتھ اس قسم کے فرنٹ بنانے کے لیے مذاکرات بھی کیئے تھے۔ بعد ازاں دیگر راہنماؤں نے سینوں کی اسلامی تحریک اور حزب اللہ کے مابین تعلقات کار قائم کرنے پر اتفاق بھی کیا گیا۔ لیکن حزب اللہ کے کمانڈروں نے اسلامی تحریک پر اعتماد نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ تعلقات کار قائم نہ رہ سکے۔

جہاد افغانستان کا آغاز انقلاب ایران کے علاوہ 1980 کے عشرے کا اہم واقعہ انقلاب افغانستان تھا جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف متحد کر کے افغانستان میں جہاد کرنے کے لیے جمع کر لیا تھا۔ جہاد افغانستان دنیا کا واحد واقعہ تھا جس میں شیعہ اور سنی مسلمانوں کے متحدہ فرنٹ نے سوویت یونین کا مقابلہ کیا اور کسی قسم کے اختلافات سوویت یونین کے انخلاء تک ظاہر نہ ہونے دیئے۔ جہاد افغانستان کو بعض ریٹائرڈ مصری جرنیلوں' پاکستان کی افواج اور سوڈانی اور ایرانی فوجی ماہرین کی خدمات حاصل تھیں۔ جہاد افغانستان کے لیے سب سے پہلے مصر نے اسلحہ فراہم کیا تھا جو پاکستان کے راستے افغان گروپوں کو مہیا کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں افغانستان کے اس معرکے میں شرکت کے لیے دنیا بھر میں جوش و ولولہ موجود تھا جس کو تیز کرنے میں پاکستان کی جماعت اسلامی پیش پیش تھی جس نے اخوان المسلمون کے تعاون سے جہاد افغانستان کو مستحکم کرنے میں ایک انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان تحریکوں کے انقلابی کارکن پشاور کے راستے افغانستان داخل ہوتے رہے۔ ان کو افغانستان میں تربیت دینے کے لیے جماعت اسلامی پاکستان کا ذیلی ادارہ احیاء العلوم سرپرستی فراہم کرتا تھا جس کے سربراہ ڈاکٹر مراد علی شاہ تھے۔ یہ تنظیمیں جہاد سے اپنی گہری وابستگی کو پوشیدہ نہیں رکھتیں اور علی الاعلان مسلم سماج کی تعمیر کے لیے کام کرتی ہیں۔ ادارہ احیاء العلوم کے افغانستان کے لیڈر گلبدین حکمت یار سے بہت ہی قریبی روابط تھے جو حزب اسلامی کی قیادت کرتے ہیں۔ یہی وہ رابطہ اور تعلق تھا جس نے افغانستان اور پاکستان کی اسلامی تحریکوں کو یکجا کر دیا تھا۔ 1980 کے عشرے کے وسط میں افغانستان میں جہاد کی غرض سے جانے والوں کو ٹرانسپورٹ سمیت بہت سی سہولیات میسر آگئیں تھیں جن کی وجہ سے ان کی تعداد میں زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ 1980 کے عشرے کے وسط میں یہ تعداد

بڑھ کر سولہ سے بیس ہزار ہو گئی تھی ان میں سے ایک بڑی تعداد حزب اسلامی سے وابستہ تھی۔ عربوں نے اپنے بعض لیڈروں کو "جہاد کا مطالعہ" کرنے کی غرض سے بھی افغانستان بھیجا تھا۔

پاکستان میں اسلامی تحریک کے رضاکاروں میں اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ یہاں کی فضا اسلامی کارکنوں کے لیے سازگار تھی جس نے افغان مزاحمت کو تقویت دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ افغان تحریک مزاحمت نے اپنے سامنے صرف یہی مقصد نہیں رکھا تھا کہ وہ سوویت یونین سے اپنے ملک کو آزاد کرائے گی بلکہ اس نے افغانستان میں ایک مسلم معاشرے کے قیام کا بھی عہد کیا تھا۔ یہ قوم پرستی کی تحریک نہیں تھی بلکہ اسے جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا تھا اور سمجھا جاتا تھا۔ اسی نظریے کے تحت سوویت فوجوں کو افغانستان کے پہاڑوں میں موت کی نیند سلانے کا کام جاری رہا تھا۔ جن علاقوں کو آزاد کرایا گیا وہاں ان جہادی گروپوں اور جماعتوں نے اسلامی معاشرت قائم کر دی تھی جہاں عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ چار شادیاں کرنے کی اجازت تھی لڑکیاں سکول نہیں جاتی تھیں۔ ان علاقوں پر ملا اور مولوی اپنے تمام تر جبر کے ساتھ موجود تھے۔ ان حالات اور رویوں نے عرب جنگجوؤں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان کے باہمی تعاون سے ایک عالمی تحریک جہاد وجود میں آگئی تھی۔ جس کے مراکز پاکستان اور افغانستان میں تھے۔ عبداللہ عزام کی شخصیت افغان جہاد میں ایک انتہائی اہم لیڈر کی حیثیت اختیار کر گئی تھی وہ اردن کے فلسطینی تھے۔ وہ اس تحریک کے بانیوں میں سے ہیں جسے آج کل انٹرنیشنل بریگیڈ کہا جاتا ہے۔ وہ پشاور میں اپنے دفتر کے ذریعے عرب مجاہدین کی افغانستان میں تربیت کا اہتمام کرتے تھے ان کے ذریعے تربیت پانے والے عرب مجاہدین نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی احیاء کا کام شروع کر دیا تھا۔ جس کی مثال الجزائر بھی ہے۔ الجزائر کے مجاہدین کی تین ہزار کی تعداد نے افغان جہاد میں حصہ لیا تھا جس کے بعد وہ اپنے ملک جا کر احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے عبداللہ عزام کو 24 نومبر 1989 کو شہید کر دیا گیا تھا۔

جہاد افغانستان کی وجہ سے یاسر عرفات نے بھی اسلامی اصطلاحات کا استعمال شروع کر دیا تھا اور اسرائیل کے خلاف جدوجہد کو وہ جہاد قرار دیتے تھے۔ 15 اکتوبر 1985 کو خرطوم میں اپنی تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ عرب ذہنوں میں عرب انقلاب آج بھی زندہ ہے

حالانکہ صیہونی اور استعماری قوتوں نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقدس جنگ اور مسلم جدوجہد میں اضافہ ہو گا میں صدر ریگن اور عرب میں امریکی ایجنٹوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں ہمیں کوئی نہیں ہٹا سکتا اس لیے عرب قوم کی فتح یقینی ہے۔ (غور کیجئے کہ یاسر عرفات نے جہاد کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ اسلامی انقلاب کی جگہ عرب انقلاب کا ذکر کیا جو ان کی عرب قوم پرستی کی تحریک سے وابستگی کی علامت ہے۔ اسلامی امت کے تصور سے وابستگی کی نہیں)

بہرحال 1986 سے پی ایل او نے پاکستان کے راستے افغانستان بہت سے رضاکاروں کو تربیت کے لیے بھیجنا شروع کر دیا تھا جہاں سپیشل فوجی تربیت دی جاتی تھی۔

پاکستان کی انٹر سروسز انٹیلی جنس (ISI) نے بھی جہاد افغانستان میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور وہ افغان تحریک مزاحمت کے پھیلاؤ اور استحکام کے لیے کام کرتی تھی۔ اس ایجنسی کے ذریعے بھی عرب مجاہدین افغانستان میں فوجی تربیت اور افغان جہاد میں حصہ لینے کے لیے آتے تھے۔ اور واپسی پر وہ سوڈان اور یمن میں مزید تربیت حاصل کرتے تھے۔ بہت سے عرب تربیت حاصل کرنے کے بعد چلے جاتے تھے انہیں دوسروں کی طرح دھماکہ آمیز مواد کے استعمال کی تربیت خصوصی طور پر دی جاتی تھی۔ ایران پاکستان میں اسلامی مزاحمتی گروپوں کے تربیتی پروگراموں سے مطمئن اور خوش تھا۔ دسمبر1985 کے شروع میں ایران کے ماہرین کی کونسل کے وائس چیئرمین آیت اللہ ابراہیم امینی کے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کی تعریف کی تھی۔ اور ایرانی تجربات کا ذکر کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اسلامی انقلاب کے لیے جماعت اسلامی پاکستان کی جدوجہد اور سوچ کی حمایت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایران کو پاکستان ہر قسم کی قانونی امداد دینے پر تیار تھا۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ جماعت اسلامی پاکستان نے کبھی بھی مسلح انقلاب کی بات نہیں کی اور جمہوری راستوں سے تبدیلی کے لئے کام کرتی رہی ہے۔ لیکن امریکی رپورٹ اس کام کو سبوتاژ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے)

دنیا بھر میں مسلمانوں کے سنی حلقوں میں عالم اسلام کے اتحاد کی تحریک کو بہت تقویت ملی تھی۔ سوڈان دہشت گردی کی اس نئی مہم کا اہم مرکز بن گیا تھا۔ ڈاکٹر شیخ حسن عبداللہ الترابی کی قیادت میں اخوان المسلمون کو بہت زیادہ قوت حاصل ہوئی۔ حسن الترابی 1980

کے عشرے کے وسط سے ہی اس کوشش میں تھے کہ دنیا بھر میں اسلامی نظریے کے حاملین کو متحد کیا جا سکے۔ وہ مصر کی اخوان المسلمون کو بھی اس کام پر قائل کرتے رہے۔ انہوں نے یورپ' امریکہ اور ایشیا کی اسلامی برادریوں کو متحد کرنے کے لیے بھی بہت کام کیا۔ ان کی قیادت میں انقلاب ایران کی حمایت کی جاتی تھی۔ اس لیے سوڈان' لیبیا اور عراق کے اتحادی کے بجائے ایران کا اتحادی بن گیا تھا۔ جس کا مقصد دونوں ملکوں میں مشترکہ کاز کے پیش نظر تعاون میں اضافہ کرنا تھا۔

جنرل عمر حسن البشیر نے 30 جون 1989 میں فوجی قوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کیا تھا اور وہ سوڈان میں ایک اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بارہا عرب اتحاد کے لیے بھی اپنی حمایت کا اعادہ کیا ہے تاکہ استعماری اور صیہونی سازشوں کا متحد ہو کر مقابلہ کیا جا سکے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے انقلابی کمان کونسل کے بیشتر ارکان بھی اسی فلسفے کی حامی ہیں۔ اس سے قبل کی کونسل کے بعض ارکان نے اس فلسفے سے اختلاف کی وجہ سے جنرل بشیر کو ہٹانے کے لیے 1990 میں بعض کوششیں کی تھیں پہلی کوشش مارچ میں اور دوسری اپریل میں کی گئی۔ ان کوششوں کو دبانے کے بعد جنرل عمر حسن البشیر نے اپنی توجہ جنوبی سوڈان میں عیسائی اور ملحد لوگوں کی بغاوت کی طرف مرکوز کر دی تھی جس کے لئے وہ خلیجی بحران تک لیبیا کے ذریعے شام' مصر اور عراق سے مدد حاصل کرتے رہے اسی لیے بحران کے دنوں میں انہوں نے لیبیا اور عراق کی حمایت کی تھی۔ جنرل عمر حسن البشیر کے اسلامی کردار کے اثرات میں اضافہ ہوتا رہا۔ اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد شیخ حسن الترابی نے انھیں بتایا کہ اخوان المسلمون کو سوڈان میں گہرا اثر و رسوخ حاصل ہے۔ دونوں نے اگست 1989 میں سوڈان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنانے کے لیے باقاعدہ معاہدہ کر لیا تھا۔ یکم اکتوبر 1990 کو کرنل سلیمان محمد سلیمان نے ایران کا دورہ کیا اور کہا کہ "مجھے امید ہے کہ ایران کے اہم اور دور رس کردار کے پیش نظر سوڈان اور ایران کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہوں گے۔ جنرل حسن بشیر نے ایران کے انقلاب کے اسلامی کردار کی تعریف پر مبنی ایک خط بھی ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی کو روانہ کیا تھا۔ کرنل سلیمان نے ایران کے ساتھ جنوبی سوڈان کی بغاوت ختم کرنے کے لیے فوجی امداد پر بھی مذاکرات کئے تھے۔

پی ایل او کی قیادت خرطوم میں بہت اثرورسوخ رکھتی تھی۔ اس کے باوجود اسرائیل اور امریکہ کے لیے وہ فلسطینی زیادہ بڑا خطرہ تھے۔ جو اسرائیل کے اندر اسلامی تحریک چلا رہے تھے۔ 1991 کے وسط تک سوڈان اس بات کا قائل ہو چکا تھا کہ تمام اسلامی قوتوں کا اتحاد ضروری ہے۔ جنرل بشیر نے حسن الترابی کو سوڈان کا روحانی راہنما تسلیم کر لیا تھا۔ دنیا بھر میں حسن الترابی کی قیادت میں پاپولر انٹرنیشنل آرگنائزیشن کے کام کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور اسلامی تحریکوں نے اس سلسلہ میں حسن الترابی کو مستقبل کا قائد قرار دے لیا تھا۔ 1991 کے اختتام تک حسن الترابی کے تجزیے کے مطابق پاپولر آرگنائزیشن مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کر سکی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے قیادت، کمان اور کنٹرول کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کئے تاکہ اسلامی تحریک کو مزید گہرا اور مضبوط بنایا جا سکے۔ اس آرگنائزیشن کے لیے 1991 کے اختتام پر ایک سپریم کونسل بنائی گئی۔ جس میں مختلف مسلم ممالک سے 350 ماہرین اور سیاستدانوں نے شرکت کی۔ اس کے اہم راہنماؤں میں شیخ عمر عبدالرحمان (مصر) شیخ حسن الترابی (سوڈان) راشد الغنوشی (تیونس) اور عباسی مدنی (نظربند الجزائر) شامل تھے۔ شیخ عمر عبدالرحمان نیویارک اور راشد الغنوشی لندن میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں وہیں رہتے ہوئے کونسل کی سینیئر قیادت میں شامل کیا گیا تھا۔

ان لیڈروں نے اپنی تنظیموں کو دہشت گردی کی خصوصی کارروائیاں کرنے کے لیے احکامات دیئے تھے۔ ان کا ابتدائی دائرہ کار الجزائر، مراکش، سعودی عرب، لیبیا، یوگنڈا، برطانیہ، کویت اور بحرین کے علاوہ موریطانیہ، کینیا اور بھارت تک پھیلا ہوا تھا۔ سوڈان ان اسلامی تحریکوں کو مالی امداد بھی فراہم کرتا تھا۔ ڈاکٹر حسن الترابی کی قیادت میں بنیاد پرستوں نے پہلا عالمی اسلامی بنک "تقویٰ بنک" کے نام سے الجزائر میں قائم کر لیا تھا۔

پاپولر انٹرنیشنل آرگنائزیشن سے وابستہ تنظیموں کا تعارف مختصر طور پر یوں کرایا جا سکتا ہے۔ ان تنظیموں کو امریکی حکومت کیٹ TASK FORCE ON TERRORISM & UNCONVENTIONAL WARFARE کی ایک رپورٹ کے حوالے سے دیا جا رہا ہے جو 1993 میں تیار کی گئی تھی۔

(1) مشرق وسطیٰ

(ا) حزب اللہ : اس کے مراکز تہران اور بیروت میں ہیں آیت اللہ فضل اللہ اس کے مرکزی لیڈر ہیں۔

(ب) القدس فورسز : یورپ' امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے کے لیے یہ گروپ ایران میں بنایا گیا جس میں سنی مسلمانوں کو تربیت دی جاتی ہے۔

(ج) اخوان المسلمون : اس کے مراکز قاہرہ اور خرطوم میں ہیں جہاں سے مختلف تنظیموں کو نظریاتی اور روحانی راہنمائی فراہم کی جاتی ہے۔ اس کی شاخیں سوڈان' مصر اور اردن میں ہیں۔

(د) آرمڈ اسلامی موومنٹ : اسے انٹرنیشنل بریگیڈ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مراکز خرطوم' تہران اور پشاور میں ہیں۔

(2) افغانستان

جمعیت اسلامی : مذکورہ بالا تنظیموں سے اس کا تعلق ہے۔ اس کے مراکز افغانستان اور پاکستان میں ہیں۔

(3) الجزائر

(ا) اسلامی سالویشن فرنٹ (FIS) : انتہا پسند سنی تحریک جو اخوان المسلمون کی شاخ ہے اس کے مراکز الجزائر' سوڈان' پاکستان اور افغانستان میں ہیں۔ ان کے لیڈر عباسی مدنی اور علی بالحاج ہیں۔

(ب) افغان اسلامک آرمی : افغان جہاد میں حصہ لینے والے الجزائر کے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ عیسیٰ مسعودی سربراہ ہیں۔

(ج) جماعت التبلیغ : اسلامی سالویشن فرنٹ کی ایک شاخ ہے۔ دہشت گردی کی کارروائیاں کرتی ہے۔

(د) جماعت الجہاد : یہ بھی جماعت التبلیغ کی طرح کی ایک شاخ ہے۔

(ر) اہل الدعوۃ : یہ بھی اسلامی فرنٹ کی ایک شاخ ہے اور اس کی ایماء پر دہشت گردی کرتی ہے۔

(س) حماس الجزائری: یہ بھی اسلامی فرنٹ کی ایک شاخ ہے اور جماعت الجہاد اور اہل الدعوۃ کی طرح کے کام کرتی ہے۔

(4) آزاد ملکوں کی دولت مشترکہ

(ا) حرکت نہضت اسلامی: وسط ایشیا کی ریاستوں میں یہ جماعت اخوان المسلمون کی طرز پر کام کرتی ہے۔

(5) جزائر کومورو

اسلامی فرنٹ برائے آزادی کو مدد دیتی ہے۔ اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔ اس کے مراکز سوڈان میں ہیں۔

(6) مصر

(ا) اخوان المسلمون: اس کے سربراہ شیخ محمد حامد ابو النصر ہیں۔

(ب) جہاد گروپ: اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔ اس کے مراکز مصر، سوڈان، پاکستان اور افغانستان میں ہیں۔

(7) اری ٹیریا

اسلامی جہاد: اری ٹیریا اور سوڈان میں اس کے مراکز ہیں جبکہ یہ اخوان المسلمون کی شاخ ہے۔

(8) ایتھوپیا

اسلامی فرنٹ یہ بھی اخوان المسلمون کی ہی ایک شاخ ہے۔

(9) بھارت

(ا) جامع مسجد دہلی: یہ بھی ایک تنظیم ہے جو سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس کے مراکز سوڈان اور ایران میں ہیں۔ یہ بھی اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔ اس کے سربراہ سید عبداللہ بخاری ہیں۔ (غور کیجئے معلومات پر دسترس رکھنے والوں کا علم کیا ہے؟)

(ب) انقلابی عوامی فرنٹ مانی پور: اسے پاکستان اور برما کی حمایت حاصل ہے۔

(10) اسرائیل

اسلامی تحریک : یہ ایک سیاسی پارٹی ہے۔ جو اخوان المسلمون سے منسلک ہے۔ جو اسرائیل میں دہشت گردی کی سرگرمیوں کی ذمہ دار ہے۔

(11) اردن

(ا) اسلامی جہاد : یہ عالمی حزب اللہ کی ایک تنظیم ہے۔ جس کا اخوان المسلون سے بھی تعلق ہے۔

(ب) اسلامی جہاد : یہ بیت المقدس اسلامی جہاد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اوپر ذکر کی گئی تنظیم سے اس کا بھی تعلق ہے۔ اس کی ایک شاخ الاقصیٰ میں بھی ہے۔

(ج) حماس : اسرائیل کے خلاف انتفاضہ کی قیادت کرتی ہے اس کے سربراہ شیخ احمد یاسین ہیں۔

(د) اخوان المسلمون : اس کے سربراہ شیخ عبدالرحمان الخلیفہ ہیں۔ ان کے علاوہ درجن بھر مزید چھوٹی چھوٹی تنظیمیں اور گروپ ہیں۔

(12) کشمیر

(ا) حزب المجاہدین : یہ جماعت اسلامی کی فوجی شاخ ہے۔ اس کے لیڈر عبدالمجید ڈار ہیں۔

(ب) جموں کشمیر لبریشن فرنٹ : اس کا تعلق بھی اخوان المسلمون سے ہے۔ (یہ علیحدگی پسند تنظیم ہے اس کا اخوان المسلمون سے نظریاتی اختلاف ہے۔ اور اخوان المسلمون سے دور پرے کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے)۔

(ج) اخوان المسلمین : یہ اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔ اس کے سربراہ ہلال احمد بیگ ہیں۔

(د) محاذ آزادی : یہ بھی اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔

(ر) جماعت اسلامی : یہ بھی اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے جس کے پاکستان اور کشمیر میں مراکز ہیں۔

(س) اللہ ٹائیگرز : اسلامی تنظیم جسے پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔

(ش) العمر مجاہدین: یہ بھی اللہ ٹائیگرز طرز کی تنظیم ہے۔
(ص) الجہاد تحریک: حزب المجاہدین کی ایک شاخ ہے۔
ان کے علاوہ پانچ مزید ایسی ہی تنظیمیں ہیں۔

13- لیبیا

(ا) جماعۃ الاسلامیہ۔ اس کے سوڈان میں مراکز ہیں اور یہ اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔

14- پاکستان

(ا) جماعت اسلامی۔ یہ ایک اسلامی سیاسی جماعت ہے جو عالمی اخوان المسلمون سے وابستہ ہے۔ جو پاکستان اور اس سے باہر کاروائیاں کرتی اور ان کی نگرانی کرتی ہے۔ اس کے لیڈر قاضی حسین احمد ہیں۔
(ب) ادارہ احیاء العلوم۔ یہ ایک مسلح تحریک ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر مراد علی شاہ ہیں۔ اسے جماعت اسلامی پاکستان کی حمایت حاصل ہے۔

فلپائن

مورو اسلامی فرنٹ اخوان المسلمون کی شاخ ہے جس کے سوڈان میں مراکز ہیں۔

16- سوڈان

نیشنل اسلامی فرنٹ ایک سیاسی جماعت جس کا عالمی اخوان المسلمون سے تعلق ہے۔ یہ سوڈان کے ذریعے اپنی کاروائیاں کرتی ہے۔

17- شام

اخوان المسلمون کے مراکز خرطوم میں ہیں۔

18- تیونس۔

النہضہ سنی تحریک ہے۔ جو اخوان المسلمون کی ہی شاخ ہے۔ اس کے سوڈان اور تیونس میں مراکز ہیں۔

19-یمن

اسلامی فرنٹ یمن بھی اخوان المسلمون کی ایک شاخ ہے۔ اس کے بھی سوڈان میں مراکز ہیں۔

غیر منطقی سوچ مسلمان ایک طویل عرصے سے مغرب کے ان رجحانات کا نشانہ بنتے آ رہے ہیں مغرب کو ہر وہ چیز تشدد اور دہشت گردی کی تصویر بنتی نظر آتی ہے جس سے پہلے اسلامی کا حوالہ موجود ہو۔ اس کا رشتہ "اسلامی" ہونے کے ناطے "بنیاد پرستی" سے جوڑا جاتا ہے اور جو تصویر پھر دنیا کو دکھائی جاتی ہے اسے "اسلامی بنیاد پرستی" کا لباس اوڑھنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اہل مغرب کو عالم اسلام کے خلاف دہشت گردی کی فضا پیدا کرتے' پہلے سے موجود فضا کو تحفظ دیتے اور نئے حالات میں اسلام کو عصر حاضر کا جدید دہشت گرد ثابت کرتے تامل نہیں ہوتا۔ تاہم عالم اسلام کو خوفزدہ کرنے والے اقدامات' مسلمانوں کا قتل عام' ان کے بنیادی حقوق کی پامالی اور مسلم حکومتوں کے ذریعے کارروائیوں کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جہاں اسلام ہو گا وہاں اسلامی بنیاد پرستی ہو گی جہاں اسلامی بنیاد پرستی ہو گی وہ دہشت گردی کرے گی۔

"آج کی دنیا میں دہشت گردی کا مفہوم اور اس کے بارے میں رویہ زیادہ متضاد ہو گیا ہے یہاں تک کہ کسی ایسی تحریک کے بارے میں ایک ہی طبقہ کا رویہ بھی بدلتا رہتا ہے۔ سب سے پہلے ہندوستان میں اور اس کے آس پاس دیکھا جائے تو پنجاب اور آسام اور سری لنکا و افغانستان میں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ سری لنکا میں ابتدا" تامل بغاوت کی ہندوستان کی کانگرسی حکومت نے مدد کی پھر اس سے جنگ کی۔ افغانستان میں مجاہدانہ تحریک ابتداء میں دہشت پسند طرز کی کارروائیوں پر مشتمل تھی امریکی حکومت نے اس تحریک مزاحمت کو تسلیم کیا اور روسیوں نے اس کو محض پاکستانی تخریب کاری قرار دیا۔ اب انہی مجاہدین کو امریکہ والے بنیاد پرست کہہ رہے ہیں حالانکہ ان کا اسلامی موقف زمانہ جہاد کے مقابلہ میں کچھ نرم ہوا ہو تو ہو پہلے سے سخت قطعی نہیں ہوا"۔ 2

یہی مضمون نگار آگے چل کے لکھتا ہے کہ

"کشمیر کے تعلق سے ہر سنجیدہ اور منصف مزاج مبصر کی یہ رائے ہے کہ کشمیر کے

ہندوستان سے تعلقات اب اپنی عمر کی آخری منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ کشمیری عوام کا بھارت سے کوئی ذہنی' جذباتی و روحانی تعلق باقی نہیں رہا۔ لیکن یہ صورت حال نتیجہ ہے ۴۷ سالہ ناانصافیوں' محرومیوں' جبروستم اور ظلم و زیادتیوں کی۔ قدرت کی نعمتوں سے مالا مال اس سر زمین سے ہندوستان کی تمام حکومتوں نے فائدے بٹورنے کی تو پوری کوشش کی مگر اس خطہ کی ترقی اور عوام کی معیشت کو بہتر بنانے' صنعتوں اور کاروبار کو فروغ دینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ شاید مرکزی سرکاروں کی یہ حکمت عملی رہی ہو کہ کشمیری عوام کا مرکز پر انحصار ختم نہ ہونے پائے۔ ساتھ ہی ان ۴۷ سالوں میں کشمیری عوام کے جمہوری حقوق کو پامال کیا گیا مرکزی سرکاریں عوام پر اپنی پسند کی حکومتیں تھونپتی رہیں نیز کشمیر کو عملاً ایک فوجی چھاونی بنا دیا گیا۔ متحدہ محاذ کی شکل میں کشمیری عوام نے انتخابی سیاست کے ذریعہ اپنے حقوق کو حاصل کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔ تاہم جب انتخابی جمہوریت سے مایوس ہو کر کشمیریوں نے اپنے جائز حقوق کے مطالبے کے لیے احتجاجی سیاست کا رخ اختیار کیا تو ان پر فوج اور سیکیورٹی دستے تعینات کر دیئے گئے۔ سیکیورٹی دستوں کی چیرہ دستیوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

آج اگر کشمیری نوجوان جنگ جوئی کا راستہ اختیار کر رہا ہے اور مرکزی سرکار کے الفاظ میں پاکستان کے ذریعہ "گمراہ" ہو رہا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے اس مقام تک کس نے پہنچایا۔ اس کے جائز حقوق اور تمناؤں کو کس نے پامال کیا؟ کس نے اس کی ماؤں اور بہنوں کے دامان عصمت کو تار تار کیا؟ کس نے ان میں جہاد کا جذبہ اور شہادت کی آرزو پیدا کی؟ وادی گلپوش اگر آج انسانی خون سے لالہ زار ہو رہی ہے اور جہلم کی لہروں میں ٹھنڈے پانی کے بجائے گرم خون دوڑ رہا ہے تو بجا طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ انسانی خون کی ارزانی کا ذمہ دار کون ہے؟ کشمیری نوجوانوں کو ہم دہشت گرد کہیں یا عسکریت پسند گمراہ کہیں یا حریت پسند' اصطلاحوں کی بازی گری سے گناہ دھل نہیں جاتے۔ اور الفاظ کے پیرھن سے ذمہ داری نہیں ختم ہو جاتی۔

سری لنکا میں ماضی میں تامل لبریشن ٹائیگرز (ایل ٹی ٹی ای) اور جنتا وِمکتی پیرا مونا (جے وی پی) کے درمیان خونریز تصادم ہوئے حالانکہ یہ دونوں مارکسی دہشت پسند تنظیمیں رہی ہیں اور دونوں ہی ہندوستان کی امن فوج کے خلاف مرنے مارنے کی پالیسی پر عمل پیرا

تھیں۔

مغرب کی نظر میں مسلم دہشت پسندی اور اسلامی بنیاد پسندی تقریباً" ایک ہی چیز ہے۔ (اس معیار کا اطلاق ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے) لیکن غور طلب چیز یہ ہے کہ "بنیاد پسند دہشت پسند" گروہ سعودی عرب' سوڈان' مصر' تیونس اور الجزائر میں اپنے یہاں کی حکومتوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں دوسری طرف سعودی حکومت خود بھی بنیاد پسند کہلاتی ہے جس سے امریکہ کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ سوڈان کی حکومت پر خود امریکہ میں دہشت پسندی کی سرپرستی کا الزام عائد کیا جا رہا ہے عراقی حکومت کو شیعہ اور سنی مذہبی تنظیموں کی شدید مخالفت کا سامنا ہے جب کہ اسی حکومت کو دہشت پسند قرار دے کر بغداد پر میزائلی حملہ کیا گیا ہے۔

فرانس کے خلاف الجزائر کی طویل تحریک آزادی اور اسرائیل و امریکہ کے خلاف فلسطینی تحریک آزادی نے ابتدائی برسوں میں دہشت پسند طریقہ کار اختیار کیا۔ الجزائر حریت پسندوں کو فرانس کی حکومت ابتداء میں دہشت پسند کہا کرتی تھی اس تحریک کو کچلنے کے لیے انتہائی سفاکانہ طریقوں میں ناکامی کے بعد الجزائر کے حق خود ارادیت کو اصولاً" تسلیم کر لیا تو فرانس میں‌اس چیز کے خلاف ایک دہشت پسند گروہ نمودار ہو گیا۔ فرانسیسی مفادات کی حفاظت کرنے والے سوشلسٹوں کے خلاف جب صدر بومدین کا گروہ سرگرم عمل ہوا جو خود بھی سوشلسٹ تھے تو ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اس کو دہشت پسند قرار دیا گیا تھا۔ پھر اسلامی تحریکات کے مقابلے میں مغرب نے ان کی اور ان کے جانشینوں کی حمایت کی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جن اسلام پسندوں کی انتخابی کامیابی کو فوجی طاقت کے ذریعہ ناکام بنا دیا گیا تھا ان کی جدوجہد پر اب مغربی دنیا اور اس سے متاثر پریس میں دہشت گردی کا لیبل لگایا جا رہا ہے"

"مغربی ذرائع ابلاغ نے "اسلامی" کے نام سے ایک زہریلا ہتھیار تراشا ہے اس کے ذریعے ناانصافیوں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اسی ذریعے سے کسی بھی مسلم گروہ یا ملک کو مستقبل میں نشانہ بنانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

"اسلامی دہشت ایک بار پھر میدان عمل میں "--------- "اللہ کے نام پر"---------

ایسی شہ سرخیاں ہیں جو اب زیادہ زہر آلود خیال نہیں کی جاتیں۔ ٹائم میگزین 30 اگست 1993 اپنی اشاعت میں دکھاتا ہے کہ سوڈان میں مسلمان نماز ادا کر رہے ہیں جسے حال ہی میں امریکہ نے دہشت گرد قرار دیا ہے۔ تصویر کے نیچے کی عبارت یوں ہے کہ "سوڈانی لوگ ایران کے ساتھ نظریاتی اور عملی یکجہتی کے اظہار میں نماز ادا کر رہے ہیں۔

ٹائم کے رپورٹروں نے ایک قطعی درست عمل کو (یعنی پانچ وقت نماز ادا کرنے کے عمل کو) اپنی رپورٹنگ کے ذریعے دنیا کے لیے ایک ایسی علامت بنا دیا ہے جس سے نفرت کرنا' اسے گولی سے اڑانا اور مار دینا آسان ہو گیا ہے۔ مسلمان پانچ وقت کی فرض نمازیں ادا کر رہے ہیں اب اس میگزین کے لاکھوں قارئین کے ذہنوں میں نماز اور دہشت گردی یکساں اعمال کے طور پر محفوظ رہیں گے۔

امریکہ کے اٹارنی جنرل نے ایک نابینا مسلم عالم کو ایک "دہشت پسند گروہ کا لیڈر" قرار دیا ہے۔ جس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم دھماکہ کرایا۔ جس کا دوسرا ہدف تھا کہ نیو یارک سٹی میں سرنگوں اور عمارتوں کو اڑا دیا جائے ---------"[3]

مغرب کے اقتصادی مفادات مغرب ان رویوں کو جب اقتصادیات کی زبان سے ادا کرتا ہے تو اسے ان اقتصادی اور معاشی حوالوں سے خوف محسوس ہوتا ہے جو ابھی وجود پانے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ اس کے تصور میں اس وسیع اور بہت بڑے اقتصادی بلاک کی قوت زلزلہ برپا کئے ہوئے ہے جو آبادی کے اعتبار سے یا خریداروں کی مارکیٹ کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا بلاک بن جائے گا۔ اس اقتصادی بلاک میں اسے چین' جاپان' تائیوان' سنگاپور' کوریا' ملائیشیا اور انڈونیشیا جیسے ملک نظر آتے ہیں اس بلاک کا داعی ملائیشیا کا وزیراعظم ڈاکٹر مہاتیر محمد ہے جس کا آئندہ پیش رو ڈاکٹر انور ابراہیم پر بھی گہری اسلامی چھاپ ہے۔ اس روپ میں چین ایسا ملک ہے جو آبادی' وسائل اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے امریکہ اور مغرب کی مشترکہ منڈیوں کو چیلنج کر سکتا ہے۔ جس تیزی سے ٹیکنالوجی چین منتقل ہو رہی ہے اس تیزی سے چین نئی قسم کی ٹیکنالوجی پیدا بھی کر رہا ہے۔ امریکہ کو خطرہ ہے کہ کنفیوشس کے نظریات اس بلاک پر حاوی رہیں گے اس لیے ان ممالک کو خراب کرنا ضروری ہے۔ امریکہ کے ادارے سی آئی اے کے توسط سے 1993 کے دوسرے نصف حصے میں ایک کتاب چین سمگل کی گئی جس میں مسلمانوں کے مقدس

راہنماؤں اور مشاہیر اسلام کی تصاویر تھیں۔ اس کتاب کی سمگلنگ کے ذریعے چینی مسلمانوں کے جذبات مشتعل کرنا اور انہیں چین کے خلاف استعمال کرکے پاک چین تعلقات خراب کرنا' چین کے عالم اسلام سے تعلقات خراب کرنا مقصود تھا۔

اہل مغرب کو ایک ایسا اسلامی اقتصادی بلاک بھی مستقبل میں ناگزیر نظر آ رہا ہے جو وسائل کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا بلاک بن سکتا ہے۔ مغربی تجزیہ نگاروں نے اسلام کو سرد جنگ کے بعد کا خطرہ قرار دیتے ہوئے اس پہلو کو بھی خصوصی طور پر پیش کیا۔ مسلم ممالک کی آبادی' انکا جغرافیائی محل وقوع اور پھیلاؤ یورپی منڈیوں کے لیے سنگین خطرہ بن سکتا ہے۔ ان ممالک کو ایک حد کے اندر رکھنے کے لئے یہاں حکومتوں پر مغرب نے شروع سے ہی موثر کنٹرول رکھا اور انہیں اسلام پسند گروہوں سے مسابقت پر مجبور رکھا اس مسابقت کو بھی اسلامی بنیاد پرستوں کی دہشت گردی قرار دے کے سفارتی اور سیاسی دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔

تیسرے مغرب کا یہ بھی پروپیگنڈہ ہے کہ اہل اسلام کے ہاتھوں میں ایٹمی ہتھیاروں کو دینا یا رکھنا سنگین ترین خطرہ ہے ان کے خیال میں یورپ کے کسی شہر میں ایسا ہتھیار سمگل کر کے ناقابل یقین تابکاری کے ذریعے تباہی پھیلانے کا منصوبہ مسلمانوں کے انقلابی گروپوں کا تیار کردہ ہے۔ حالانکہ سائنسی اعتبار سے یہ معاملہ کس حد تک قابل عمل ہے خود اہل مغرب بھی جانتے ہیں۔

اہل مغرب دنیا کی آبادی میں تیز رفتاری سے اضافے کو بھی ٹائم بم قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے کہ اسرائیل کے ہمسایہ ممالک بالخصوص اور شمالی افریقہ میں بالعموم آبادی کا اس قدر زیادہ ارتکاز ہو جائے گا جس سے عرب نوجوانوں میں اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد زیادہ بہتر انداز سے کرنے اور بے روز گاروں کے یورپ چلے جانے کے خطرات حقیقت بن جائیں گے۔

"نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکے پر تجزیہ کرتے ہوئے جارج جے چرچ نے لکھا کہ "یہ بات یقینی ہے کہ ایک بار پھر ایسا ہی ہو گا اور پھر دوبارہ ایک اور واقعہ ہو گا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ سابقہ سوویت بلاک کی حکومتوں نے دہشت گردی کو جو فروغ دیا تھا وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کے بالکل مخالف سمت میں دنیا بھر میں دہشت گردی کو فروغ

مل رہا ہے اور اس میں تنوع پیدا ہو رہا ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکہ اور پچھلے ہفتے کی گرفتاریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ محفوظ نہیں ہے۔ اب وہ دنیا کی واحد سپر طاقت کی حیثیت سے بے شمار ناراض گروپوں کا ہدف ہے۔ بالکل ایسے جس طرح وہ دنیا کی امید بھی ہے۔ بروس ہاف مین کا کہنا ہے کہ دہشت گردی اب جرم کی واضح موجودگی کا ثبوت بن کر امریکی شہروں کی تباہی کے آثار دکھا رہی ہے۔

بغداد پر اتوار کی صبح میزائلوں سے حملہ اس خوف کے خاتمے میں حصہ ڈالنے میں بہت کم کردار ادا کرتا ہے۔ تاہم یہ کارروائی دہشت گردی کرنے والوں کے خلاف ایک فوری، مضبوط اور بروقت رد عمل تھا۔ یہ حملہ اس وقت کیا گیا جب سی آئی اے اور ایف بی آئی کو یقین ہو گیا کہ عراقیوں نے کویت کے دورے کے موقع پر صدر جارج بش کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا جس کے لیے کار بم استعمال کیا جانا تھا (یہ منصوبہ امریکی خفیہ اداروں کے ذہنوں کی پیداوار تھی جو بعد میں جھوٹا ثابت ہوا۔ اگر یہ سچا بھی ہوتا تو ایک فرد کے بدلے میں ایک شہر کے خلاف دہشت گردی کا جو جواز دیا جا رہا ہے وہ کوئی ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کرتا) مصری حکومت دہشت گردی کا مقابلہ کرنے میں کم خوش قسمت واقع ہوئی تھی امریکہ میں دھماکے سے چھ دن پہلے قاہرہ میں داخل ہونے کے ایک چھوٹے راستے پر ہاتھوں سے بنا ہوا بم پھٹا جس سے سات افراد ہلاک اور بیس زخمی ہوئے تھے۔ یہ فروری سے مصری دارالحکومت کے اندر یا قریب چوتھا دھماکہ تھا۔ جن میں اکیس افراد ہلاک اور 76 زخمی ہوئے تھے"۔ 4

جارج چرچ کا کہنا ہے کہ اسی دن ایک امریکی پروفیسر اس وقت شدید زخمی ہوا جب وہ یونی ورسٹی کے قریب ایک پیکٹ کھول رہا تھا جس میں دھماکہ خیز مواد موجود تھا۔ جارج چرچ کا تجزیہ یہ کہتا ہے کہ دہشت گردی میں اضافے کی بنیادی وجہ جرائم میں بے پناہ اضافہ اور دونوں میں قریبی رابطہ ہے۔ اس کے مطابق منظم گروہ، مرکزی طور پر مربوط اور ریاستی مقاصد کے لیے کام کرنے والے دہشت گرد گروہوں میں زوال ہو رہا ہے۔ کیوں کہ سرد جنگ کے خاتمے نے انہیں رقم کی عدم فراہمی کے مسئلہ سے دو چار کر رکھا ہے۔ ان کے ہتھیار فرسودہ یا ختم ہو رہے ہیں۔ لیکن ایک پہلو سے جارج کی بات میں جانب داری ضرور نظر آتی ہے جب وہ ان تمام گروپوں کو مشرقی یورپ اور سوویت یونین کا آلہ کار بتا کر

مغرب اور امریکہ کو بری الذمہ قرار دے دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شام اور لیبیا نے اس لیے دہشت گردی و ترک کر دیا ہے چونکہ انہوں نے جان لیا ہے کہ وہ اب زیادہ عرصے تک یہ سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتے۔ اس کے خیال میں اٹلی کے ریڈ بریگیڈ اور جرمنی کی ریڈ آرمی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ مغرب میں ایسے مسلح گروہوں کی طرف سے کارروائیوں کو قبول کرنے کے رجحان پر تبصرہ نہیں کرتا اس طرح اس کی جانب داری کا علم ہو جاتا ہے۔

اس کے خیال میں پرانے طرز کی دہشت گردی دراصل سیاسی مقاصد کے حصول کا ایک تشدد ذریعہ ہے۔ یہ واقعات جس ملک میں ہوتے تھے اس ملک کے باشندے ان میں شریک ہوتے تھے۔ اب دہشت گردی اور منظم جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اٹلی اور کولمبیا ان کے بڑے مرکز ہیں۔ 1992 میں دہشت گردی کے 5404 واقعات ہوئے جو 1991 کے مقابلے میں گیارہ فیصد زیادہ تھے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر دھماکے میں گرفتار ہونے والے مسلمانوں کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے جیفری سٹین برگ (Jeffery Stein Berg) نے سرب دہشت گردوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ

"ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکے میں اسلامی دہشت گردی کا ہاتھ ثابت کرنے کے خلاف رد عمل کو ماہرین اور وفاقی تحقیقاتی افسروں نے دبانے کی کوشش کی ہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس واقعے کے ذمہ دار دراصل سرب ہیں۔ یا بلقان میں سربوں کے حامی ہیں ایک ایسوسی ایٹڈ پریس رپورٹ کے مطابق جو اس صبح جاری کی گئی جس دن سلامے کو گرفتار کیا گیا تھا پولیس بڑی سرگرمی سے سربوں کو تلاش کر رہی تھی۔ کیوں کہ سربوں کے لبریشن فرنٹ کی طرف سے دھماکے کے بارے میں ایسی تفصیلات ظاہر کی گئیں تھیں جو اعلیٰ حکام کے سوا کسی اور کے علم نہیں تھیں بوسینا کے سرب لیڈر راداوان کرادزچ نے ایک کھلا خط امریکہ کے عوام کے نام لکھا تھا جس میں صدر کلنٹن کو خبردر کیا گیا تھا کہ وہ بلقان کی جنگ میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے باز رہیں ورنہ نیو یارک سٹی میں اس بم دھماکے کو ایک مثال سمجھیں جس کو امریکی مداخلت کا جواب بنایا جائے گا۔ امریکہ کے بیمار ذہنوں کے حامل لوگوں کو باز رہنا چاہیے جو "انسانی بنیادوں پر امداد اور تعاون" کے نام پر ایک مقامی جنگ کو

ایک علاقائی جنگ میں بدل دیں گے۔ جس سے عالمی جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔"۔ 5

امریکہ کی بوسنیا کے بارے میں پالیسی امریکہ کی بوسنیا کے بارے میں پالیسی کبھی بھی حوصلہ افزا نہیں رہی محض معمولی سی حمایت پر بھی سربوں کی طرف سے اس طرح کے شدید رد عمل کے بعد امریکی اداروں کی کارکردگی بوسنیا کے حوالے سے مزید کم ہوتی گئی۔ 3 ستمبر 1992 کو (اس واقعے سے بہت پہلے) امریکہ کے ایوان نمائندگان کی War fare Task Force on Terrorism and Conventional کو ایک خفیہ رپورٹ پیش کی گئی جس میں بوسنیا کے مسلمانوں کو فراموش کرنے اور ان کے قتل عام کے حق میں تفصیلات دی گئی تھیں یہ امریکی ٹاسک فورس نو ریاستوں کے پندرہ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں بوسنیا کے صدر علی جاہ عزت بیگ پر الزام لگایا کہ وہ یورپ میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کر رہے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اسی کے مستحق ہیں۔ یہ پالیسی عزت بیگ کے ان پے درپے اعلانات کے باوجود اختیار کی گئی جس میں انہوں نے کہا کہ وہ بوسنیا کو کثیر نسلی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ رپورٹ میں ان کے بیانات کو مسترد کرتے ہوئے کہا گیا کہ ایسی کوئی ریاست یورپ میں نہیں بنے گی اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ

"ذیل کے صفحات میں بوسنیا ہرزی گووینا میں حالیہ تصادم کی تاریخ اور اس کے ایران سے تعلقات پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ دی جا رہی ہے جو سابقہ یوگو سلاویہ کی مسلم آبادی سے خصوصی طور پر متعلق ہے۔ اس رپورٹ میں اس بات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ اس تصادم کے یورپ میں مسلم آبادیوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اس رپورٹ میں مندرجہ ذیل اہم نکات شامل ہیں۔

— یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کی تاریخ مظلومیت کی تاریخ رہی ہے۔ خصوصاً" مارشل ٹیٹو کے دور میں بوسنیا ہرزی گووینا کے مسلمانوں نے اپنی پوزیشن بہتر بنائی ہے۔

ایران کا دہشت گردی پر مبنی ڈھانچہ اپنے لیے زیادہ تر حمایت علی جاہ عزت بیگ کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ جو "فدائین اسلام" نامی تنظیم کے ایک رکن ہیں اور ایک بنیاد پرست مسلمان ہیں۔ اس گروہ کا مقصد ہر اس جگہ اسلامی حکومت قائم کرنا ہے جہاں مسلمان آباد ہیں

- بوسنیا کے مسلمانوں کے لیے حمایت میں اضافے کے لیے عزت بیگ نے ایرانی طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے مظالم کا ارتکاب کیا ہے اے بی سی کے نمائندے ڈیو کپلن کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔
- بوسنیا کی جنگ میں امریکہ کی بے عملی دراصل یورپ کو اسلامی برادری سے خالی کرانے میں مدد دینے کی حکمت عملی ہے۔ ایران نے مغربی یورپ کی مسلم آبادی میں بھی گہرا نفوذ کر لیا ہے۔
- بوسنیا کی جنگ میں آیت اللہ احمد جنتی کی قیادت میں ایک وفد بوسنیا گیا تھا وہاں سے واپسی پر انہوں نے کہا تھا کہ بوسنیا کی شکست کی صورت میں مسلمان یورپ کے خلاف گوریلا وار شروع کر دیں گے۔
- اس وقت یورپ کے مسلمانوں کی تین سے چھ فیصدی آبادی کسی نہ کسی طرح اسلامی نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ جس سے اس بات کا امکان بڑھ رہا ہے۔ کہ مستقبل میں یورپ کے خلاف مسلم کیونٹی دہشت گردی شروع کر دے گی۔

ایک اور شدید تضاد امریکی ایوان نمائندگان کو فراہم کی جانے والی رپورٹ بھی اسی طرح گمراہ کن اور خلاف حقائق باتوں پر مبنی ہے جس طرح کی رپورٹ اسلامی تحریکوں کے بارے میں پیش کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد ایوان نمائندگان کو غلط معلومات فراہم کر کے گمراہ کرنا' مسلمانوں کے خلاف اقدامات کے لیے رضا مند کرنا' مخصوص مسلم ممالک کو دہشت گرد قرار دینا' جہاں مسلمانوں کی نسل کشی مطلوب ہو اس علاقے میں کسی بھی پڑوسی یا غیر پڑوسی اسلامی ملک کا عمل دخل ختم کرنا' اس خطے کے مسلمانوں کو تنہا کر کے ہلاک کرنا ہے۔ یہ عمل مصر کے ساتھ دھرایا جا رہا ہے۔ مصر کو عالم اسلام سے الگ تھلگ کرنے' مسلمانوں کی نظر میں اسے ناقابل برداشت بنانے اور اس کے اسلامی تہذیب کے نشانات ختم کرنے کی مہم جاری ہے۔ نیوزویک کے مطابق

"واشنگٹن کو یقین ہے کہ مصر کے اسلامی انقلاب پسندوں اور بنیاد پرستوں کے آگے جھک جانے کے امکانات ایک ڈراؤنا خواب ہیں۔ مصر وہ واحد ملک ہے جس نے اب تک اسرائیل کے ساتھ امن سے رہنے کی پالیسی پر عمل کیا ہے۔ اسے امریکی مشرق وسطی پالیسی

میں بنیادی سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر مصر عسکری مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تو اس کثرت آبادی والے ملک کا یوں چلا جانا پورے خطے کی نفسیات تبدیل کر دے گا۔ یہی وہ خطرہ ہے جو امریکہ کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مصر کے اسلامی انقلاب پسندوں کو ایران اور سوڈان اسلحہ اور رقم فراہم کرتے ہیں۔ پچھلے ہفتے واشنگٹن نے سوڈان کو دہشت گرد ملکوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر کے مطابق بیرون ملک دہشت گردی کرنے والوں میں سوڈان ایک بڑا ملک ہے۔ امریکہ کے اس اقدام سے سوڈان کو تمام تر امریکی امداد جو انسانی بنیادوں پر مل سکتی تھی بند ہو گئی ہے اور اس کو بہت سی تجارتی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا چونکہ سوڈان کی امداد اور تجارت پہلے ہی صفر کے برابر ہے۔ اس لیے امریکی اقدام کے اثرات بھی محض علامتی ہوں گے۔" 6

سوڈان اور ایران کی مداخلت کے جواز کو مسترد کرتے ہوئے ایک امریکی جریدہ لکھتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ بھی 30 اگست 1993 کا ہی شمارہ ہے ٹائم میگزین کی تحقیقی رپورٹ میں کہا گیا کہ

"یہ درست ہے کہ شمالی افریقہ سے لے کر خلیج فارس تک ہر سیکولر عرب ریاست کو بنیاد پرست خطرے کا سامنا ہے لیکن وہ اسے کسی غیر ملکی مداخلت کے بغیر ہی محسوس کر رہے ہیں۔ ایک امریکی ماہر کا کہنا ہے کہ مصر کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اسے ایرانی یا سوڈانی حمایت سے دہشت گردی کا سامنا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اندرون ملک بڑھتی ہوئی غربت اس کا اصل سبب ہے۔ بے روزگاری' رشوت اور بدعنوانی اور وسیع پیمانے پر یہ خیال کہ معاملات درست نہیں جا رہے مصر کی بے چینی کے اصل اسباب ہیں۔ عرب قوم پرستی اور سوشلزم کی ناکامی سے دل برداشتہ لاکھوں مصری مسلمانوں نے اس بات پر یقین کرنا شروع کر دیا ہے کہ "اسلام ذریعہ نجات ہے"

مصر کی بڑھتی ہوئی مشکلات کا سبب اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔ حسنی مبارک بارہ سال قبل صدر بنے تو مصر کی آبادی 4 کروڑ 30 لاکھ تھی آج (1993 میں) اس کی آبادی 5 کروڑ 80 لاکھ ہو گئی ہے۔ نوجوان' تعلیم یافتہ عرب آبادی کے لیے ملازمت کے امکانات نہیں ہیں۔ انہیں ٹیکسی ڈرائیور کی جگہ بھی کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ایک برطانوی سفارت کار کے مطابق یہ لوگ "بنیاد پرستی کی تحریک کے سپاہی بن رہے ہیں" ان

کا تعلق نہ صرف انتہائی غریب آبادی سے ہے بلکہ ان میں مڈل کلاس کے نوجوان بھی شامل ہیں۔

بنیاد پرستی کا چیلنج مزید دو رخ اختیار کر رہا ہے اس کا پہلا رخ روائتی ہے اخوان المسلمون نے 1971 میں ہنگامہ پرور سیاست کو خیرباد کہہ دیا تھا اب وہ ایک مذہبی' تعلیمی اور خیراتی کام کرنے والی جماعت بن گئی ہے اس کے 65 سالہ سربراہ کی سوچ بہت معتدل ہے۔ اس نے پچھلے ہفتہ ایک بیان میں "بم دھماکے کرنے کو ایک خطرناک برائی" قرار دے دیا ہے۔

اخوان المسلمون نے پچھلے سال (1992میں) سیاسی جماعت کی حیثیت سے رجسٹر ہونے کی درخواست دی تھی۔ لیکن الجزائر میں 1991 کے عام انتخابات کے پہلے راؤنڈ میں بنیاد پرستوں کی زبردست فتح کے پیش نظر مصری حکومت نے درخواست مسترد کر دی تھی۔
اس فیصلے سے دل برداشتہ ہونے والے زیر زمین نوجوان کارکنوں کا اب یہ نظریہ بن رہا ہے کہ انہیں سیاسی عمل میں شرکت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ الجزائر کے بنیاد پرستوں کو کامیابی کی دہلیز سے واپس کر دیا گیا تھا اور پھر انہوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ اگر انتخابی جیب کوئی وقعت نہیں رکھتی تو پھر دوسرا راستہ اختیار کرنا ہی بہتر ہو گا"

(TIME- Augst 30, 1993. page-23)

سوڈان کے کردار کے بارے میں اسی میگزین کی ایک تفصیلی رپورٹ بھی بعض پہلوؤں کو کھولتی ہے یہ مارگریٹ مائیکل کی رپورٹ ہے جس کے مطابق "پچھلے چار سالوں میں مغرب کی خفیہ ایجنسیوں کو سوڈان پر شک رہا ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی دہشت گردی کو فروغ دے رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکا۔ کوئی عینی شاہد' کوئی تصویر' کوئی دستاویز ایسی نہیں ہے۔ تاہم امریکہ نے پچھلے ہفتے سوڈان کو اس فہرست میں شامل کر لیا ہے جو دہشت گردی کے بارے میں ہے۔ امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے کہا ہے کہ حال ہی میں ملنے والے ثبوت سے پتہ چلا ہے کہ سوڈان نے اپنی سرزمین کو ہر قسم کی اسلامی بنیاد پرستی اور تربیت کے لیے کھلا قرار دے دیا ہے جہاں انقلابی تنظیمیں آ کر تربیت حاصل کرتی ہیں۔ یہ اعلان ان خبروں پر مبنی رپورٹ کے بعد کیا جا رہا ہے جن میں کہا گیا تھا کہ نیو یارک شہر میں بم دھماکے کرانے کی ناکام کوششوں کو سوڈان کے دو سفارت کار منظم

کر رہے تھے۔ تاہم اس کو دہشت گرد قرار دینے کا جواز قرار نہیں دیا گیا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان مائیک میک کرے نے کہا۔۔۔۔۔۔ یہاں ایک ہی کردار کا بار بار ثبوت ملا ہے۔ ہم نے سوڈان سے کئی مہینوں سے اس پر بات کی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ سوڈان مسائل کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے سے انکار کر رہا ہے جو ہمارے خیال میں باعث اطمینان ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔"

سوڈان کو دہشت گردی کی فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ اور اسے لیبیا' عراق' ایران' شام' شمالی کوریا اور کیوبا کے ساتھ ملانے کا اقدام دراصل اس پالیسی کا ایک نظر ثانی شدہ حصہ تھا جو بش انتظامیہ نے شروع کی تھی۔ اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ سوڈان کے خلاف اس اقدام سے مصر کے صدر حسنی مبارک کو حمایت کا عملی پیغام بھیجا جا سکے جو آج کل بنیاد پرستوں کے حملوں کی زد میں ہیں۔ مارگریٹ مائیکل آگے چل کے لکھتی ہیں۔

"سوڈان کو سارے عالم اسلام میں طویل عرصہ تک اس کی میزبانی کی وجہ سے ایک خصوصی مقام حاصل رہا ہے۔ کوئی بھی مسلمان کسی ویزا کے بغیر سوڈان جا سکتا ہے اس سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کا کہنا ہے کہ سوڈان وہ ملک ہے جہاں افغان جہاد میں چودہ سال گزارنے والے مجاہدین بالآخر آکر رکتے ہیں۔ سوڈان ان انقلابی عربوں کو بھی واپس لے لیتا ہے جنہیں عرب حکومتوں نے جہاز بھر بھر کر افغان جہاد میں صرف اس لیے روانہ کیا تھا کہ وہ واپس نہ آ سکیں۔ مصر نے ایک قانون کے ذریعے ہر اس مصری کو پھانسی دینے کا اعلان کیا ہے جس نے بیرون ملک فوجی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔"

(Time- Augst 30, 1993)

ہم نے کوشش کی ہے کہ مغرب کی فرد جرم کو یک قلم غلط قرار دینے کے بجائے اس پر اس انداز سے بحث کی جائے جس سے مغرب کے الزامات کا جواب خود مغرب ہی دے' مغرب کے ذرائع ابلاغ کا تضاد ہی ان الزامات کو غلط ثابت کرے جو اسلام اور عالم اسلام کو بدنام کرنے' اسلام کو ایک انتہا پسند' قدامت پرست اور غیر منطقی نظام ثابت کرنے کے لیے لگائے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں جن ممالک کو مغرب نے خصوصی ہدف بنا کر ہر دہشت گردی کو اسلام سے منسلک کر دیا ہے ان ممالک کی صفائی بھی وہ خود ہی پیش کریں۔ اس حصے میں ہم نے اسلامی تحریکوں کی مغربی تعبیر پر کوئی بات نہیں کی۔ مغرب خود ہی اخوان

المسلمین کو ایک اصلاحی، تعلیمی اور خیراتی جماعت قرار دیتا ہے جس کی سیاسی کردار کی خواہش کو مصری حکومت مسترد کر رہی ہے اور پھر خود ہی بے شمار تنظیموں کو اس سے تعلق بتاتا ہے کہ یہ اس کے ایماء پر دہشت گردی کرتی ہیں۔

مغرب اور امریکہ کی یہ کوششیں اسلامی دنیا کے مسلم معاشروں کو الٹ پلٹ کرنے اور انھیں نفسیاتی طور پر "قومے" کی حالت میں رکھنے کے مقاصد کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مسلم حکمرانوں کو بے عمل بنا کر، ان کے اندر کوئی جذبہ موجود بھی ہو تو اس کے راستے اقتصادی اور سفارتی ذرائع سے مسدود کر کے، انھیں ان کی عوام سے مسلسل برسرپیکار رکھنا بھی انھیں مقاصد کا حصہ ہے۔ جس سے ان ممالک میں ترقی کی رفتار رک جاتی ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے اور ہنگامہ پرور دور شروع ہو جاتا ہے۔ ان ہنگاموں کو جواز بنا کر ایک بار پھر مسلم ممالک میں دہشت گردی کے جراثیم تلاش کئے جاتے ہیں۔ مغرب یہ بتانے سے قطعی قاصر ہے کہ 1992 میں 5404 واقعات ایسے تھے جن میں دہشت گردی ہوئی ان واقعات میں کتنے تھے جن کا مسلمانوں نے ارتکاب کیا۔ اسلام کو خوف و دہشت کی علامت بنا کر مغربی دنیا کو اسلام سے دور رکھنا ہی مغربی حکومتوں کا اصل مقصد ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

" یہ اسلام کی سیاہ تصویر ہے جو خوف اور دہشت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا واحد مقصد دنیا بھر سے سیکولر حکومتوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ یہ مغربی اقوام کو بھی نقصان پہنچاتی ہے چونکہ یہ اقوام جدید اور سیکولر حکومتوں کی حمایت کرتی ہیں۔ اس کے اثرات اس کی عددی حیثیت سے کہیں زیادہ ہیں۔ احیائے اسلام کی یہ تحریک اپنے آغاز میں بہت پرامن تھی جب مشرق وسطیٰ میں اس کا مقصد دینی اخلاص قرار دیا گیا تھا۔ لیکن عظیم مایوسی کے بعد مٹھی بھر انقلابیوں نے فوجی ایکشن کا رخ کیا تاکہ وہ قوت کے ذریعے اسلامی نظریہ کو نافذ کرا سکیں۔ ان انقلاب پسندوں کی اکثریت کو کسی حکومتی پشت پناہی کے بغیر کام کرنا پڑا ہے۔ تنظیمی اعتبار سے کم منظم یہ گروہ اپنی جبلت اور فطرت کے اعتبار سے ملی ٹینٹ ہیں جو اپنے ہم خیال ذرائع سے اسلحہ، روپیہ اور دہشت گردی کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ یہ گروہ 1980 تک کے فلسطینی اور شیعہ گروہوں سے بہت مختلف ہیں۔ مایوسی کی فضا سے جنم لینے والے یہ گروہ اس حزب اختلاف کی پیداوار ہیں جو غیر جمہوری ممالک میں موجود ہے

اور خود اعلان کردہ جنگ کے ذریعے خالص' غیر ملاوٹ شدہ اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں یہ کام ان معاشروں میں شروع کیا گیا ہے جہاں ان کو حمایت نہیں مل سکی۔ ان گروہوں کی طرف سے امریکہ کے اندر کارروائیاں اس بات کا اظہار ہیں کہ وہ واشنگٹن کی اسرائیل اور سیکولر عرب ریاستوں سے دوستی کو ناپسند کرتے ہیں۔ "۔ 7

"اسلام ریاست اور مسجد کے درمیان کوئی فرق نہیں روا رکھتا۔ اس کے مطابق نظریات اور سیاست میں کوئی تفاوت نہیں ہونا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ تمام مسلمان ایسے نہیں ہیں جنہیں امریکہ بنیاد پرست کہتا ہے۔ اسلام میں اس اصطلاح کو استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اسلام کے بارے میں پرجوش لوگوں کو "اسلام پسند" یا "کارکن" کہتے ہیں۔ واشنگٹن امریکن یونیورسٹی میں اسلام پر نظر رکھنے والی پروفیسر میری جین کا کہنا ہے کہ " مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ان معنوں میں سیکولر ہے چونکہ وہ اعتقادات کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتی ہے" تمام مسلمان جو بنیاد پرست کہلاتے ہیں وہ بھی خوف اور دہشت کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کرتے۔

لیکن چند ایک ایسے لوگ ضرور ہیں جو اپنے راہنماؤں کو اس لیے تباہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ اسلام کے شرعی اصولوں اور قانونی ضابطوں کو اپنی زندگی پر نافذ نہیں کرتے۔ خوف اور ہنگامہ آرائی کرنے اور پھیلانے والے مسلمان سیاسی اور سماجی کاموں کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس پر شریعت کا مکمل نفاذ ہو۔ حتیٰ کہ ایران بھی نہیں' سوڈان اور سعودی عرب بھی اس زمرے میں نہیں آتے۔ یہ ممالک بھی جدید دنیا کے ساتھ بعض معاملات پر سمجھوتہ یا مفاہمت کر لیتے ہیں۔ اسلام پسندوں نے اپنے غم و غصے کا مرکز الجزائر' مصر اور تیونس جیسے ممالک کو بنا رکھا ہے کیونکہ ان ممالک نے خود کو قوم پرستی کے حوالے کرنا چاہا ہے اور مغربی جمہوریت اختیار کرنے کی طرف پیش رفت شروع کی ہے۔

شہروں میں کبھی کبھار اور حکومتوں کے خلاف منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کرنے والوں کا تعلق جن تنظیموں سے ہے ان میں اہم ترین مصر کے ! جہاد اور اسلامی گروپ' الجزائر کی اسلامی سالویشن فرنٹ اور تیونس کی نہضت الاسلامی بھی شامل ہیں۔ ان کو دبانے والی حکومتوں کا موقف ہے کہ ان گروہوں کے اصل مراکز ان کے ممالک سے باہر ہیں جہاں سے

انہیں خونریز ہنگاموں کے لیے ہدایات دی جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں افغانستان' ایران اور سوڈان ان کو تربیت اور رقم فراہم کرتے ہیں۔ زیادہ تر کردار افغانستان میں سابقہ سوویت یونین میں چودہ سالہ جنگ کا ہے جس نے تربیت کے مواقع انہیں فراہم کیے ہیں۔

ان دہشت گردوں کے ابھرنے کی وجوہات میں ملکی بدعنوان ماحول اور غربت اہم ہیں جو ان گروپوں کو کارکن مہیا کرتی ہیں۔ عرب حکمرانوں کو یہ آسانی ہے کہ وہ مبالغہ آمیز حد تک ان کا تعلق دوسرے ملکوں سے جوڑ دیتے ہیں۔ مقامی سطح پر اقتدار اور اختیار حاصل کرنے کے دعوے دار گروپ اپنے پیروکاروں پر مشتمل فوج تیار کرتے ہیں اس میں شدید قسم کے جنونی شامل ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی مرکزی نظام کے بغیر عرب حکومتیں خود کو جہاد افغانستان سے واپس آنے والے دہشت گردوں کے محاصرے میں محسوس کرتی ہیں۔ سوڈان کے ڈاکٹر حسن الترابی جیسے احیاء پرست راہنما عرب ممالک میں غیر مطمئن مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی اب تک ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ انہیں ان ممالک میں موجود اپنے خفیہ گروپوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

اسلامی دنیا کے جذباتی طور پر متحرک کارکن جدید دنیائے عرب سے الگ تھلگ ہو جانے اور سماجی طور پر بے خانماں ہونے کی وجہ سے حمایت حاصل کرتے ہیں۔ جن مسلم ممالک میں غربت میں اضافہ ہو رہا ہے' بے روزگاری بڑھ رہی ہے اور قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں وہاں بے اطمینانی اور بے چینی میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ شہروں کی طرف تیزی سے ہجرت نے اس صورت حال کو مزید خراب کر دیا ہے چونکہ شہروں میں انہیں مناسب سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ کم تعلیم یافتہ اور غریب کسان بنیاد پرستی کی تحریک کے لیے سبز چارہ ہیں۔ نوجوان نسل کے غریب اور بے روزگار افراد بھی اسی طرح رکن بنتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں اچھے مستقبل کا وعدہ نہیں دیا جاتا۔

بنیاد پرستی اور دہشت گردی بنیاد پرستی کی اپیل میں قوت دراصل عرب خطے میں عرب لوگوں کے معیار زندگی کے پست ہونے میں پنہاں ہے۔ یہ لوگ نو آبادیاتی نظام کے مظالم اور خطے میں اسرائیل کی صورت میں ایک طاقت ور دشمن کی موجودگی سے پریشان ہوتے ہیں۔ امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کے ایک افسر زلمے خلیل زاد کا کہنا ہے کہ مسلم

معاشروں میں معاملات خلط ملط ہو گئے ہیں کیونکہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔ ایسا انہوں نے مغربی اخلاقی بے راہ روی اور ظلم و ستم سے متاثر ہو کر ہی کیا ہے صرف صراط مستقیم کی طرف پلٹ کر ہی یہ لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں انہیں مغرب کو باہر نکال پھینکنا ہو گا۔"۔ 8

"دراصل بنیاد پرستی اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہو کر مشرق وسطیٰ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر سکتی ہے۔ لیکن ایران کے علاوہ کسی ملک میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ اس خطے میں حکومتوں کو گرا سکے۔ روایتی مسلم معاشروں کے لوگ بھی خوشحالی اور امن چاہتے ہیں۔ وہ اقتصادی ترقی کو اہمیت دیتے ہیں اور تیزی سے سماجی انصاف اور سیاسی عمل میں شرکت چاہتے ہیں۔"۔ 9

عالم اسلام پر بنیاد پرستی کے حوالے سے دہشت گردی کے مغربی الزامات کی فرد جرم کے طور پر مذکورہ طویل اقتباس سے بہت سے پہلو واضح ہوتے ہیں جو اہل مغرب کے خیال میں عالم اسلام میں بنیاد پرستوں کی دہشت گردی' ان کے لیے کارکنوں کی فراہمی' خفیہ دہشت گرد سیلوں کے قیام' ان سیلوں کا مربوط نظام بنانے' عرب ممالک میں دہشت گردی کی کارروائیوں کے مقاصد' دہشت گردوں کی تربیت اور انہیں رقم اور اسلحہ کی فراہمی کے بارے میں مغرب کا نکتہ بیان کرتے ہیں۔ عالم اسلام پر دہشت گردی کا الزام سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد زیادہ شدت سے سامنے آیا ہے۔ جن ممالک میں احیائے اسلام کے امکانات نے مغرب کو متوجہ کیا ان ممالک میں ان امکانات کے خاتمے کے لیے کوششیں شروع کی گئیں اور انہیں اسلامی دہشت گردی کے مراکز کے طور پر پیش کیا گیا۔ اسلامی ممالک میں ہر کارروائی کو اسلامی تحریکوں کے کارکنوں (بنیاد پرست دہشت گردوں) سے منسلک کرنا' ہر سماجی بے چینی کے پس پردہ ان کا ہاتھ ظاہر کرنا' اقتصادی اور سیاسی ناہمواریوں کا سبب اسلام اور اس کے پیروکاروں کو قرار دینا بھی اسی تحریک کا حصہ ہے جو اسلام کو بنیاد پرستی کے تحت لا کر اس کے تمام اعمال و افعال کو غلط انداز میں پیش کرنے کے مترادف ہے تاکہ مغرب میں اسلام کا تعارف تشدد' جاہل اور زمانے کی رفتار سے صدیوں پیچھے نظام کے طور پر کرا کے اشتراکیت کے خاتمہ کے بعد سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کے لیے لوگوں کو تیار رکھا جا سکے اور مارکیٹ اکانومی کے راستے میں حائل وہ رکاوٹیں دور کی جائیں جو دراصل

مغرب کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو فرد جرم مسلم ممالک اور معاشروں پر عائد کر کے انہیں بنیاد پرستی کے شکار قرار دیئے اور پھر سزا سنانے سے متعلق اہل مغرب پیش کرتے ہیں' اقتصادی طور پر خوشحال ہونے کے باوجود مغربی ممالک میں اسی قسم کی فرد جرم موجود ہے جسے ان معاشروں پر اس انداز سے لگانے پر کوئی تیار نہیں ہے۔ جس طرح اسے مسلم ممالک پر لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ خود ان کے ذرائع ابلاغ ان وجوہات اور علامات کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ نوجوان نسل کے جوش و ولولے اور بوریت کے خلاف ان کے "جہاد" کی وجہ سے پیدا ہونے والے واقعات ہیں۔ ان کی حیثیت ان کے خیال میں انفرادی کارروائیوں کی ہے اجتماعیت ان میں موجود نہیں لیکن کسی معاشرے میں تسلسل کے ساتھ ایسے واقعات کا ہونا انفرادی رویوں کے اجتماعی ماحول کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہوتا ہے۔ آیئے ان واقعات کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

"امریکی متشدد جرائم کے نتیجے میں اٹھنے والے جنازوں کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں فی الوقت آپ کو جولائی (1993) کے دس جنازوں کے بارے میں بتانا مقصود ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دوران ملازمت قتل کیا گیا ہے یہ واقعات ایک ہفتہ کے دوران میں رونما ہوئے اور ان کی مقدار دس ہے ---- اخبارات میں شہ سرخیاں ان واقعات کی خبر دے رہی ہیں اور روزانہ کی کرائم رپورٹنگ میں اضافہ کر رہی ہیں۔ لیکن یہ اموات ہماری سماجی زندگی کے وسیع منظر میں تشدد میں اضافے کی نشاندہی کرتی ہیں ---- 1980 سے اب تک تقریباً" 750 افراد کو ایک سال کے دوران ملازمت کے اوقات میں قتل کیا جا رہا ہے۔ ملازمت کے دوران میں مارے جانے والے افراد کی یہ تعداد پیشہ ور افراد کے قتل میں تیسری بڑی وجہ ہے---- ملازموں کے ہاتھوں مارے جانے والے مینجروں کی تعداد پچھلے سال سے دگنی ہو گئی ہے اور اب تک بارہ کے بجائے چوبیس مینجر قتل کئے جا چکے ہیں۔ نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی سان فرانسسکو کے ڈین آف کالج برائے کرمینل جسٹس جیمز فوکس کا کہنا ہے کہ اس قسم کی تحقیقات میں پچھلے سال کی نسبت آٹھ گنا اضافہ ہوا ہے"۔ 10

"متشدد ملازمتیں' ادارے ایک متشدد معاشرے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک وجہ یہ ہے کہ بندوق عام ہو چکی ہے۔ پچھتر فیصد افراد کو دوران ملازمت آتشیں اسلحہ سے ہلاک کیا گیا ہے ---- ایک بیمار معیشت میں لوگوں کو سہولیات زندگی مہنگے داموں

ملتی ہیں ان کی ملازمت دباؤ میں رہتی ہے۔ اور ان کے ادارے انہیں نکال باہر کرتے ہیں۔ اس طرح لوگ اپنے مالکان اور اداروں کو اپنے مسائل کا سبب قرار دیتے ہیں۔"۔ 11

نیوز ویک کو انٹرویو دیتے ہوئے رابرٹ میک نے جنرل ڈائنا میکس کے ایک سپاہی کو قتل کرنے کی وجوہات بتائیں۔ میک اس وقت سان ڈیگو میں اسمبلی لائن ورکر اور میزائل مکینک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس نے پچیس سال کمپنی میں کام کیا ایک سال قبل اسے کہا گیا کہ تمہاری کارکردگی خراب ہو گئی ہے اس لیے تم مشاورتی بورڈ سے رابطہ کرو اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ انتظامیہ نے ڈیوٹی کا وقت' صبح چھ بجے کے بجائے ساڑھے پانچ بجے کر دیا جو اس کے لیے اذیت کا سبب بن گیا۔ اس کے مطابق اس نے ساری ملازمت کے دوران میں کچھ نہیں بچایا ساری زندگی یہاں کھپا دی۔ زندگی بسر کرنے کے لیے میرے پاس کوئی رقم نہیں تھی۔ مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا میں سمجھتا تھا کہ کمپنی مجھے نہیں نکالے گی میں طے کر چکا تھا کہ کمپنی کی بیرونی سمت خود کو ختم کر لوں گا۔ ملازمت سے نکالنے کے خط نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

"اگست 1980 میں اٹلی کے شہر بلوگنا (BOLOGNA) میں ایک بم دھماکے میں 85 افراد مارے گئے تھے جبکہ دو سو افراد زخمی ہوئے۔ کوئی ملزم گرفتار نہ ہو سکا نہ ہی کوئی سراغ ملا۔ کسی کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس ظلم سے کسی نے کیا مقاصد حاصل کئے۔ جون 1993 کے پہلے ہفتہ میں بھی اٹلی کے شہر اوفیزی (UFFIZI) کے فلورنس پرنسپل میوزیم میں بم دھماکہ ہوا۔ رات کے وسط میں ایک دین پھٹ پڑی جس میں دھماکہ خیز مواد لدا ہوا تھا۔ پانچ افراد مارے گئے۔ میوزیم کی ایک دیوار' لائبریری اور ریکارڈ روم تباہ ہو گئے۔ اٹلی کے حکام کا خیال ہے کہ دہشت گرد ریکارڈ روم سے معروف مصور بوتے سیلی Botticelli کی نادر تصاویر چوری کرنا چاہتے تھے۔ اس واقعے نے اٹلی کے تمام عجائب گھروں اور گرجا گھروں کو غیر محفوظ بنا دیا ہے اور سیاحت کی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ حکام کا کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ایسی وارداتوں میں کمی رہی ہے تاہم انفرادی نوعیت کے واقعات ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اب جنگ پھیل چکی ہے۔ بوسنیا میں سرب مسلمانوں کا باقاعدہ قتل عام کر رہے ہیں ان کی تاریخی مساجد تباہ کر رہے ہیں۔ ان کے تاریخی ریکارڈ کو ضائع کر رہے ہیں جو کھلم کھلا ان کی ثقافتی زندگی کا خاتمہ کرنے کے برابر ہے۔ یہ سب کچھ

وہ انسانوں کے خاتمے کے لیے کر رہے ہیں۔ دہشت گرد اس بات کو جانتے ہیں کہ لوگوں کی قوت حافظہ بہت کمزور ہے چند سالوں بعد کسے یاد رہے گا کہ ایک ریلوے اسٹیشن پر بم پھٹے گا اور 85 افراد مارے جائیں گے یا دس افراد قتل ہو جائیں گے اس کا ایک حل یہ ہے کہ آپ بھی انسانی زندگی کے بجائے کوئی ایسا نقصان پہنچائیں جو آئندہ برسوں میں دوبارہ ایک نیا ذریعہ بن سکتا ہو۔ یہ نقصان ایسی چیز کا ہو سکتا ہے جو مستقبل میں ماضی کا حوالہ بن جائے کیونکہ ایسی چیزوں کے بغیر کوئی مستقبل کوئی تہذیب نہیں رہتی"۔ 12

اس بم دھماکے کی نسبت کہیں خوبصورت وہ اسلوب ہے جس کے ذریعے مضمون نگار نے اٹلی کے بم دھماکے کو بوسنیا کے مسلمانوں سے جوڑ دیا اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ چونکہ بوسنیا کے تاریخی حوالوں کو سرب ضائع کر رہے ہیں اس لیے بوسنیا کے مسلمانوں نے یورپ میں مغربی تاریخ کے حوالوں کو ضائع کرنے کا پروگرام شروع کر رکھا ہے۔ کہاں کا واقعہ اور تجزیہ نگار کی مہربانی سے کہاں اس کا رشتہ جوڑا گیا ہے۔ دہشت گردی کے ہر واقعہ کی پشت پر عالم اسلام سے ملزم تلاش کرنا مشغلہ بھی ہے اور پالیسی کا حصہ بھی۔ اس مشغلے کا مقصد مسلمانوں کو نفسیاتی مریض بنانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نئی نسل کے ذہنوں میں متلون مزاجی اور انتقامی رویوں کی آمیزش کے لیے ضروری ہے کہ اسے باور کرایا جائے کہ اس کا نظریہ حیات ہی ان خوبیوں سے عبارت ہے جدید دنیا ترقی کر رہی ہے جبکہ عالم اسلام میں تشدد پروان چڑھ رہا ہے۔

دہشت گردی کے اس سارے افسانے میں کرداروں کی تخلیق سے لے کر واقعات کے رونما ہونے تک ہر چیز اور ہر عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام بے صبرے اور جاہل مسلمانوں نے کیا ہے۔ جہاں واقعات رونما ہوتے ہوئے یہ تاثر قائم نہ ہو وہاں یہ کام خود ذرائع ابلاغ کے ذریعے کرایا جاتا ہے۔ غور طلب بات تو یہ ہے کہ اسلامی دہشت گردی کو عدم سے وجود میں لایا جا رہا ہے تاکہ فلسطین' افغانستان' کشمیر اور اس نوعیت کے دیگر حساس خطوں میں جدوجہد میں مصروف مسلمانوں کے حوصلے پست کر کے انہیں سرنگوں کیا جا سکے۔ دہشت گردی کے جو اسباب شروع میں مسلمانوں کے حوالے سے بیان کئے گئے تھے۔ ایسے ہی اسباب مغربی ممالک میں خود ان کے باشندوں کی دہشت گردی میں موجود ہیں۔ مغربی ممالک میں سہولتوں کی فراوانی اور بے فکری نے لوگوں میں ذہنی الجھنوں کو "

ترقی" دی ہے۔ جو اسلحہ کے بڑھتے ہوئے استعمال اور جرائم کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ دہشت گردی کے شکار مسلمانوں کا ایک مختصر سا حوالہ ذیل میں دیا جا رہا ہے۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دہشت گردی کے شکار ہونے والے کون ہیں۔ اصل کردار کون سے ہیں اور ان کے مقاصد کیا ہیں؟

اسلامیان فلسطین کے خلاف سرگرمیاں فلسطینی مسلمانوں کے خلاف اسرائیل کی حکومت، عوام اور نوآباد کاروں کی دہشت پسند سرگرمیاں ساری دنیا پر واضح ہیں۔ 9 دسمبر 1987 کو فلسطین کے مسلمانوں نے اسرائیلی قبضے کے خلاف انتفاضہ کی تحریک کا آغاز کیا۔ 31 دسمبر 1991 تک شہید کئے جانے والے مسلمانوں کی کل تعداد ایک ہزار دو تھی۔ ان مسلمانوں کو جن طریقوں سے ہلاک کیا گیا اس کی تفصیل یوں ہے۔

مارنے والے	گولی سے شہید کئے گئے فلسطینی	تشدد کے ذریعے	آنسو گیس سے
باوردی فورسز	709	49	90
بغیر وردی فورسز	75	0	0
آبادکار/اسرائیلی شہری	49	13	0
جاسوس/مخبر	14	2	1
	847	64	91

دسمبر 1992 میں اسرائیلی حکومت نے "حماس" کے 416 ارکان کو جنوبی لبنان کے برف پوش علاقے میں دھکیل دیا۔ اس کے وزیر خارجہ نے اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اسرائیل پر دہشت گردی کا الزام لگا کر پابندیاں لگانے کا سوچ رہی تھی ہم نے دہشت گردوں کو نکال کر جواز ختم کر دیا ہے۔ دوسرا عذر یہ پیش کیا کہ محض پابندیوں کو روکنا ہی کام نہیں تھا بلکہ ہم انتفاضہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی مزاحمتی تحریک ہے آخر ان دہشت گردوں کو کوئی تو سزا دے گا تیسرا عذر پیش کرتے ہوئے کہا گیا کہ اقوام متحدہ کی طرف سے پابندیاں لگانے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ امن تباہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے ایسے اقدام سے عربوں کو ایسی سرگرمیوں کے لیے حوصلہ ملے گا۔ پابندیاں اسرائیل کے لیے سزا ہیں ان سے دہشت گردی نہیں رکے گی۔ اسرائیل وزیر

خارجہ کے بیان سے ہی واضح تھا کہ جن فلسطینیوں کو نکالا گیا ان کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ انتفاضہ کی قیادت کرنے والے اسلامی مزاحمتی گروپ حماس کے ارکان تھے۔

اسرائیل کے اس موقف کی تائید میں امریکہ نے حماس کو دہشت گرد تنظیم قرار دینے کا عندیہ دیا۔ یہ عندیہ اس لیے دیا گیا چونکہ پی ایل او کے ساتھ اسرائیل کے مذاکرات جاری تھے امریکہ پی ایل او کو تسلیم کرنا چاہتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ فلسطینیوں کو دباؤ میں رکھنے کے لیے حماس کو دہشت گرد قرار دیا جائے۔ حماس نے اس پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

"ہم مغرب کے ساتھ مکمل اور بھرپور مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔
تاکہ ہم اس پر اپنی تحریک کے اصل مقاصد اور عوامل واضح کر کے
اپنا مدعا بیان کر سکیں۔"۔ 13

مقبوضہ علاقوں سے نکالے گئے فلسطینیوں میں سے ایک مسلمان محمد تماری کی بیوی نے کہا کہ فوج نے اس کے شوہر کو دو سال کے لیے جلا وطن کیا ہے لیکن اسے جہاں بھیجا گیا وہ جیل نہیں ہے وہ تو موت ہے یوں لگتا ہے کہ انہوں نے میرے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔ ہم نہ اس کے پاس جاسکتے ہیں نہ اس کا ننھا سا بیٹا بسان اس سے مل سکتا ہے۔ اس کے والد عبداللہ تماری نے ایک اخبار نویس سے پوچھا کہ اس کے بیٹے کا جرم کیا تھا۔ تماری کی بیوی نے کہا کہ اس کا شوہر مسلمان تھا یہی اس کا جرم ہے لیکن اسرائیلی کہتے ہیں وہ بنیاد پرست تھا وہ جنونی تھا وہ دہشت گرد تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے دوزخ کے حوالے کر دیا ہے۔

ایک اور جلاوطن کئے جانے والے فلسطینی کتب کی بہن نے کہا ہم سمجھے کہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔ عیسائیوں کی کرسمس سے پہلے مسلمانوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے کیونکہ اسرائیلی ہر اس شخص کو گرفتار کر لیتے تھے جو کرسمس کی تعطیلات کو خراب کر سکتا ہو۔ میرا بھائی ان کے ریکارڈ پر تھا اسے تین بار پہلے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اسے لبنان جلاوطن کر دیا جائے گا۔ وہ گرفتاری کے وقت 104 درجے بخار میں پھنک رہا تھا۔

فلسطین سے نکالے جانے والے ان مسلمانوں کو بیابان میں بھی دہشت گردی کا سامنا رہا۔ انہیں برف پوش پہاڑوں کے درمیان رہتے ہوئے دوسرا ہفتہ تھا جب اسرائیلی توپ خانے نے 155 ملی میٹر کی گنوں سے ان پر گولہ باری کر کے اپنا کیمپ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک بیمار جلاوطن مسلمان نے لبنان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو ایک طرف لبنان کی فوج حرکت میں آگئی اور اسے دوبارہ برف کے حوالے کر دیا جبکہ دوسری طرف اسرائیلی ٹینک حرکت میں آگئے۔ اسرائیل اور لبنان کے درمیان یہ جنگ جاری رہی کہ ان فلسطینی جلاوطن مسلمانوں کو کھانا اور ادویات کس طرف سے دی جائیں گی۔ دونوں ممالک ریڈ کراس کو طبی مشن لے کر جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

اس دوران میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ اسرائیل کے ان اقدامات کا مقصد خطے میں بنیاد پرستی کے بڑھتے ہوئے خطرات کو روکنا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق

> "اسرائیل کے نکتہ نظر کے مطابق اسلامی بنیاد پرستی نے مشرق وسطیٰ' شمالی افریقہ اور وسطی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور جلد ہی مغربی زیر اثر دور دراز علاقے بھی اس کی زد سے نہ بچ سکیں گے کیونکہ مسلمان اکیسویں صدی کو اسلام کی صدی بنانے پر تلے ہوئے ہیں"۔ 14

اسحاق رابن نے 21 دسمبر 1992 کو اسرائیلی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کے قاتلانہ دہشت گردی پر مبنی رویوں کے خاتمے کے لیے دنیا کو جگانا ہو گا جو ابھی تک خواب غفلت میں گم ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی ایک سنگین خطرہ ہے۔ جو آنے والے سالوں میں دنیا کے امن و امان کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ موت آپ کے قدموں پر دستک دے رہی ہے۔ اس تقریر کے فوراً بعد اسرائیل کے فوجی ذرائع نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا جس میں کہا گیا تھا کہ اسلامی بنیاد پرستوں نے عرب دنیا کو بدامنی کا شکار بنانے اور ان کی حکومتیں گرانے کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے۔

415 فلسطینیوں کو جلاوطن کرتے ہوئے ایک اسرائیلی فوجی کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ اس سارے معاملے پر روشنی ڈالتے ہوئے لاس اینجلس ٹائمز کے مائیکل ڈاکس نے

ایک تفصیلی فیچر لکھا اور ثابت کیا کہ حماس کا اسرائیلی فوجی کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسرائیل کے اس غیر منصفانہ اقدام کی وجہ سے مقبوضہ علاقوں میں شدید رد عمل ہوا اور مظاہروں میں شدت آگئی جن کو سختی سے کچلتے ہوئے کئی درجن فلسطینی مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ایک اسرائیلی افسر نے فیچر نگار کو بتایا کہ اسرائیلی فوجی کے قتل کو ایک چیلنج سمجھا گیا تھا چنانچہ حماس کے تمام اہم لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں جلاوطن کر دیا گیا بعد کی تحقیقات نے ثابت کیا کہ یہ سب کچھ غلط تھا۔ اسرائیلی فوجی کو قتل کرنے والے چار نوجوانوں کا حماس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اسرائیلی افسر کے مطابق فوجی کو اشتعال میں آکر قتل کیا تھا۔

اسرائیل کے تحفظ اور استحکام کے لیے مغربی دنیا اور امریکہ سرگرم عمل ہیں۔ اسلام کو مشترکہ دشمن قرار دے کر مغربی دنیا اسے بدنام کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ عربوں کو خوفزدہ رکھنے کے لیے اسلامی تحریکوں کے خلاف پروپیگنڈہ بھی اسی پالیسی کا ایک حصہ ہے جس میں یورپ اور امریکہ کے اہم اخبارات اور رسائل و جرائد بھی شریک ہیں۔ کسی ایک یورپی کے قتل یا گرفتاری پر چیخ پا ہونے والے مغربی تہذیب کے پیروکاروں کو 415 فلسطینیوں کے لق و دق میدانوں میں دھکیلے جانے پر انسانی حقوق کی پامالی کا خیال تک نہیں گزرا۔ بلکہ انہیں برف پوش علاقوں میں بھی دہشت گرد کے طور پر ہی پیش کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں قرآن پاک کے نسخوں تک کو ہدف تنقید بنایا گیا انہیں بنیاد پرست کہہ کے اسلام کی توہین کی گئی۔

نیوز ویک نے THE WRATH OF ISLAM کے نام سے ایک فیچر میں لکھا کہ " ---- (اسلامی تحریک) کسی کو دہشت گرد بناتی ہے تو کسی کو امید دلاتی ہے یہ تحریک الجزائر، کشمیر اور مصر سمیت دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو آہستہ آہستہ تبدیل کر رہی ہے اس کی قوت کے بارے میں مبالغہ نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کے پاس اس قدر صلاحیت ہے کہ یہ مضبوط ایمان داروں کو تشدد کی کارروائیوں کے لیے تیار کر سکتی ہے۔ اس کے لیے وہ کبھی براہ راست حکم جاری کرتی ہے تو کبھی بالواسطہ ---- اس تحریک کو ایک تنظیم کہنا یا ایک تنظیم کے طور پر اس کے ساتھ معاملہ کرنا درست نہیں ہو گا۔ قاہرہ کے ایک سابق سفارت کار اور سکالر تحسین بشیر کا کہنا ہے کہ یہ دراصل ایک چھتری ہے جس کے نیچے اختلافات کا

سمندر رواں دواں ہے۔ یہ پرجوش جنونیوں اور ٹھنڈے دماغ والے دانشوروں کا ملغوبہ ہے۔ کبھی یہ تشدد کا راستہ اختیار کرتی ہے تو کبھی جمہوریت کا' کوئی ایک بھی ملا ایسا نہیں ہے جو ان سارے ایمان والوں کی قیادت کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ اس تحریک کے بعض اہم حصے جانے پہچانے ہیں۔ ان میں 1928 میں مصر میں قائم ہوئے والی اخوان المسلمون' حال ہی میں وجود پانے والی مقبوضہ علاقوں کی حماس اور ایران میں آیت اللہ خمینی کی تحریک بھی ہے۔ اس تحریک کے کارکن شیعہ اور سنی فرقوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں بعض لیڈر ذاتی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اور آمریت مسلط کر دیتے ہیں۔ ایران کے راہنماؤں کی طرح جغرافیائی حد بندی کر کے مذہبی جوش کو تیز کرتے ہیں۔ ان سب کا مشترکہ نقطہ یہ ہے کہ وہ قرآن کو بنیادی قانون بنانے کا عہد کرتے ہیں جو ریاست اور معاشرے کو کنٹرول کرے گا۔ وہ اسے کھانے سے لے کر لباس تک اور سود خوری سے برات سے لے کر سزائے موت دینے تک راہنما قرار دیتے ہیں۔ بعض اس عمل میں اپنا غصہ بھی شامل کر دیتے ہیں۔

امریکہ پر مسلم بنیاد پرستوں کے حملوں کی کیا وجوہات ہیں؟ اس کی فہرست لمبی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ ایک مسلمان ملک عراق کو بموں کے ذریعے تباہ کر دیا گیا ہے اور اب وہ مغرب کی متحدہ قوت کے سامنے سرنگوں کھڑا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ایک صیہونی اسرائیل مسلمانوں کی سرزمین پر مسلط کر دیا گیا ہے اور امریکی قوت اس کی محافظ ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حماس کے راہنماؤں کو ان کی اپنی سرزمین سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اب وہ جنوبی لبنان میں شدید مشکلات کا شکار ہیں۔" 15

اسلامیان مقبوضہ کشمیر مسلمانان فلسطین کی طرح اسلامیان مقبوضہ کشمیر بھی اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ جس طرح فلسطین کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کی قراردادیں موجود ہیں اور مسلمانان فلسطین کو اس بات کا قانونی جواز فراہم کرتی ہیں کہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کریں اسی طرح مقبوضہ کشمیر کے مسلمان بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں۔ اس حق کے حصول کے لیے انہوں نے پرامن احتجاج سے جہاد کا جو راستہ اختیار کیا ہے اسے دہشت گردی قرار دینا خود اقوام متحدہ

کے طے کردہ اصولوں اور حریت آزادی کی تحریکوں کے راستے سے یکجہتی کے خلاف ہے۔ اسلامیان کشمیر پر بھارتی حکومت کے مظالم اور ریاستی دہشت گردی کی ساری دنیا مخالفت کر رہی ہے۔ لیکن آج بھی امریکی اور یورپی پالیسیوں میں وہاں کے آزادی پسند مسلمانوں کو بنیاد پرست دہشت گردوں کے لقب سے ہی پکارا جاتا ہے۔ پاکستان میں امریکی سفارت خانے کے ترجمان "خبرونظر" نے نواز شریف حکومت کی تعاون پر مبنی کشمیر پالیسی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"14 جولائی (1993) کو سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ترجمان مائیکل میک کری نے بتایا کہ تمام حقائق اور قانون کا جائزہ لینے کے بعد امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کرسٹوفر نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والے ممالک کی فہرست سے فی الحال پاکستان کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔

انہوں نے کہا کہ اس موضوع پر دستیاب اطلاعات سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ پاکستان نے بین الاقوامی دہشت گردی کی حمایت میں بار بار اقدامات کئے ہوں۔

میک کری نے کہا کہ کرسٹوفر اس نتیجہ پر اس لیے پہنچے کہ پاکستان نے متعدد ایسے اقدامات کئے ہیں جو بظاہر جنگی کارروائیوں میں شامل ان کشمیری اور دیگر گروپوں کے بارے میں ہماری تشویش کے جواب میں کئے گئے جو تشدد کی کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ ترجمان نے بتایا کہ امریکہ صورت حال کا بغور جائزہ لیتا رہے گا اور یہ کہ وزیر خارجہ کو قانون کے تحت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مرحلہ پر کسی ملک کو اس فہرست میں شامل کر لیں۔

گذشتہ چھ ماہ کے دوران پاکستان کی جانب سے بڑھتے ہوئے تعاون کا ذکر کرتے ہوئے ترجمان نے کہا ہے کہ

- ان کی (پاکستان کی) جانب سے اس مسئلہ پر ہمارے ساتھ مشترکہ کارروائی کی خواہش موجود ہے۔
- انہوں نے ہماری جانب سے اٹھائے جانے والے بعض معاملات کو حل کرنے کے لیے کارروائی کی ہے۔
- دہشت گردی کے بارے میں اپریل میں جاری کی جانے والی سالانہ رپورٹ میں ہم نے جن مسائل کی نشان دہی کی تھی ان کے بارے میں ہمیں مزید معلومات فراہم کرنے میں

وہ ہم سے تعاون کر رہے ہیں۔ 16

حکومت پاکستان کی اس کمزور پالیسی کے علی الرغم بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں ریاستی دہشت گردی کے لیے ہر راستہ اختیار کئے رکھا ہے۔ بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" نے شیوسینا کے کارکنوں پر مشتمل سات مراکز ڈل گیٹ' نہرو رپورٹ' شالیمار' بادامی باغ' ستمور ہوٹل' جہانگیر ہوٹل اور لال چوک میں قائم کر رکھے ہیں۔ جبکہ جموں کے رہائشی علاقوں گاندھی نگر اور راجوری کے جواہر نگر میں بھی ایسے مراکز قائم ہیں۔ شیوسینا کے ان کارکنوں کو "را" کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس کی کشمیر شاخ' نیشنل کانفرنس اور کشمیر ہندو یوتھ کے ارکان' سابق فوجیوں اور ریٹائرڈ کمانڈوز کی خدمات بھی حاصل ہیں۔ ان کے ذمے مقبوضہ علاقوں میں دہشت گردی کی کارروائیاں کرنا' لوگوں کو اغوا کرنا' بنک ڈکیتی' ہندو مسلم فساد کرانا' شیعہ سنی فساد کرانا' عورتوں کی عصمت دری کرنا اور صحافیوں کو دہشت کا نشانہ بنانا شامل ہیں۔ یہ کام اس طرح کیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ مجاہدین کی کارروائی ہے اس طرح عوام کو مجاہدین سے برگشتہ کرنا اور مجاہدین کی صفوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا بھی ان کا مقصد ہے۔

کشمیر کے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے بھارت نے سری نگر میں سونوار باغ' (SONWAR) راجہ باغ' باغ مہتاب' بادامی باغ کے آرمی کیمپ' پرانے ائیرپورٹ کے آرمی کیمپ' ٹینہ چوک گورنمنٹ ڈگری کالج' سری نگر کے تمام پولیس تھانوں میں ٹارچر کیمپ قائم کر رکھے ہیں۔ اسی قسم کے کیمپ بارہ مولا میں پٹن آرمی کیمپ گلمرگ آرمی کیمپ' دو آب گاہ' دودرہ کالج سوپور' گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور' سندوائی باندی پورہ' ددار گریز' سنگھ پور بارہ مولا آرمی کینٹ اور تمام پولیس تھانوں میں بنائے ہوئے ہیں۔ جبکہ بڈگام کے کیمپ پیر باغ' ادم پورہ' کاکاؤ ریٹی چراری شریف' خان صاحب آرمی کیمپ' چندپورہ' بڈگام ٹاؤن ہال' ربند کوٹ اور پولیس تھانوں میں مسلمانان کشمیر کو تشدد کا نشانہ بنانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اسلام آباد اننت ناگ میں قائم ان کیمپوں میں شاہ آباد آرمی کیمپ' خندو آرمی کیمپ' خندبل پولیس لائن' بنی بال براہ' بیج بہارہ آرمی کیمپ اور تمام پولیس تھانوں میں ٹارچر سیل قائم ہیں۔ پلوامہ کے ٹارچر سیل میں کاکا پورا' بالیوگنڈ' شوپیاں' پولیس لائن' بونارا آرمی کیمپ' اوانتی پورہ آرمی کیمپ اور ترال آرمی کیمپ شامل ہیں۔ کپواڑہ ضلع

میں کالی مٹی' بڈگام' ترن گام آرمی کیمپ' کرناہ ریسٹ ہاؤس' پولیس لائن' چوکی بال آرمی کیمپ اور ڈرگ گمولا آرمی کیمپ میں ٹارچر سیل قائم ہیں۔ جنوری 1992 سے دسمبر 1992 تک بھارتی مسلح دستوں کے ہاتھوں 1770 شہری شہید' 1642 زخمی اور 9359 گرفتار کئے گئے۔ گھر گھر تلاشی کے دوران میں 734 گھر جلائے گئے۔ 882 مسلمان خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ بھارت نے بمباری کر کے آزاد کشمیر کے 12 شہری شہید اور 37 زخمی کر دیئے۔ اس ایک سال کے دوران میں 770 مجاہدین شہید' 604 زخمی کئے گئے اور 2084 گرفتار کئے گئے۔

ان مظالم کے رد عمل میں مجاہدین کے حملوں میں 1245 بھارتی فوجی ہلاک 1297 زخمی ہوئے۔ بھارت کی مسلح افواج نے 44 سپاہیوں کو گرفتار کیا مجاہدین نے 153 افراد کو مخبری کے الزام میں ہلاک اور 124 کو زخمی کیا۔ کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و تشدد پر رد عمل کو مغربی دنیا دہشت گردی قرار دیتی ہے حالانکہ اقوام متحدہ کی قرار دادیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے جس کے باشندوں پر بھارت نے اپنی مرضی بزور قوت مسلط کر رکھی ہے۔

مسلمانان اراکان (روہنگیا) برما میں بسنے والے ارکانی مسلمانوں پر ظلم و تشدد بھی اس عالمی تحریک دہشت گردی کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کو آزادی اور خود شناسی کی خواہش رکھنے اور اس کے لیے جدوجہد کرنے کی سزا دیتا ہے۔ پاکستان میں اراکانی مسلمانوں پر اردو زبان میں پہلی اورجامع کتاب "اراکانی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی" کے مصنف نے ان مظالم کو بھی قلم بند کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

" (برما کی) نئی فوجی حکومت نے ستمبر ۱۹۸۹ میں اراکان میں مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ایک حکمت عملی شروع کی جس کے تحت مسلمانوں کی زرعی پیدا وار پر بھاری ٹیکس عائد کر دیا گیا اور اپنی ضروریات کے لیے مسلمان کاشتکار جو غلہ ذخیرہ کر لیتے تھے وہ بھی حکام اب ان سے چھیننے لگے۔ مسلم علاقوں میں متعین مسلح افواج نے مسلمانوں کی غلہ کی دکانوں' مویشیوں' پرندوں اور سبزیوں کے کاروبار کرنے والوں کو بے تحاشا لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ حکام بھوکے مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں سے جبری مشقت لینے لگے ہیں جو بوڑھے اور

کمزور لوگ جبری مشقت نہیں کر سکتے ہیں انہیں بری طرح مارا پیٹا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سڑکوں پر ہی مرجاتے ہیں۔

اراکان کے لیے غلہ اور اجناس کی فراہمی رکوا دی گئی جس کے نتیجے میں اراکان میں مصنوعی قحط کی حالت پیدا کر دی گئی۔ اور ۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ تک ۱۵۰ کے لگ بھگ مرد' عورتیں اور بچے بھوک سے ہلاک ہو گئے۔

برمنائزیشن پالیسی کے تحت بو تھیڈانگ کے قبرستان پر قبضہ کر لیا گیا اور بعد ازاں اسے ہموار کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو اس امر کا علم اس وقت ہوا جب وہ ایک میت کو دفنانے کے لیے قبرستان گئے۔ قبرستان پر قابض فوجیوں نے میت کو دفنانے سے بزور روک دیا اور ایک فوجی افسر نے میت کے ساتھ آنے والے مسلمانوں کو دھمکی آمیز لہجے میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"اگر مسلمان برما میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے طور طریقوں اور مذہب کو خیرباد کہنا ہو گا اور بدھ اکثریت کی طرح اپنے مردوں کو دفن کرنے کے بجائے نذر آتش کرنا ہو گا۔"

برمیوں کے بقول مردوں کو دفنانے سے بہت قیمتی زمین ضائع ہو جاتی ہے جو کہ قومی دولت کا زیاں ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ برما میں لاکھوں ایکڑ زمین بغیر کاشت کے بنجر پڑی ہے۔ اور مردوں کو جلاتے وقت ٹنوں کے حساب سے قیمتی ایندھن ضائع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو بے گھر کرنے اور ہجرت کر جانے پر مجبور کرنے کی غرض سے موجودہ فوجی حکمران بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ وسط دسمبر ۱۹۸۹ کی ایک صبح اکیاب شہر کی سب سے بڑی اور قدیم تاریخی مسلم بستی چاکی پاڑہ سے اچانک مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کرنا شروع کر دیا گیا بغیر اطلاع اور بغیر وجہ کے بری فوج' مقامی پولیس اور سرکاری کارندوں نے بڑی تعداد میں چاکی پاڑہ پر ہلہ بول دیا۔ اور پھاوڑوں' کدالوں اور بلڈوزروں کی مدد سے مسلمانوں کے رہائشی مکانوں' دکانوں اور مدارس و مساجد کو مسمار کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ۲۷ دسمبر ۱۹۸۹ تک دو ہزار سے زیادہ قدیم عمارتیں زمین بوس کی گئیں اور سو سے زائد مساجد اور دینی مدارس بھی اس کارروائی کی زد میں تھے۔ موسم کے سرد ترین ایام میں لوگ بے سرو سامانی کے عالم میں کھلے آسمان تلے ٹھٹھرتے رہے اور بہت سے افراد سردی کی

شدت سے ہلاک ہو گئے۔"ے 17

برما کی قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں مسلمانوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بناتی ہیں۔ اراکان کے روہنگیا مسلمان اس مشق ستم کا خصوصی ہدف ہوتے ہیں۔ ظلم و تشدد کے بہت سے واقعات عالمی پریس کی نظروں سے بھی اوجھل رہتے ہیں اور حکمران کونسل بھی ان کا نوٹس نہیں لیتی۔ برما اور بنگلہ دیش کے سرحدی علاقوں پر فوجی گشت میں اضافہ کر دیا گیا تاکہ ظلم و بربریت کی اس حکمرانی سے تنگ آئے ہوئے مسلمانوں کو سرحد عبور کر کے ہجرت کرنے کے عمل سے روکا جائے۔ تقریباً دس لاکھ مسلمان ان سرحدی پابندیوں سے قبل ہجرت کر کے بنگلہ دیش اور دیگر ہمسایہ ممالک میں داخل ہو گئے یا چلے گئے۔ بنگلہ دیش نے اپنے ملک میں آنے والے مسلمانوں کی واپسی کی کوشش کی خود بنگلہ دیش کے سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال اس قدر بڑا بوجھ اٹھانے کی متحمل نہیں تھی اور نہ بنگلہ دیش کے ماحول میں ان مہاجرین کو جذب کرنے کی صلاحیت تھی۔ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں مہاجر کیمپوں میں مقیم اراکانی مسلمانوں کو واپس بھیجنے کے لیے بنگلہ دیش برما کے مابین 1992 میں معاہدہ ہوا ان مسلمانوں کی عظیم اکثریت واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ جو لوگ واپس جا رہے تھے ان کی واپسی بری حالت خراب موسم اور سہولتوں کی بالکل عدم فراہمی کی مرہون منت تھی۔ اقوام متحدہ کے مہاجرین کے ہائی کمشن کی زیر نگرانی نومبر1993 تک صرف 36, 207 مسلمان رونگی کھائی، ناؤپورا اور تجار پورا کے راستے واپس گئے۔ اراکانی مسلمان واپسی کی اس سست رفتار پر اس لیے شکوہ نہیں کرتے تھے چونکہ انھیں علم تھا کہ برما واپس جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برما کی حکمران کونسل مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن PYI THAYA کے نام سے شروع کر چکی تھی۔ جس کے ذریعے مسلح افواج کے دستوں کو مسلم آبادیوں پر حملوں اور انھیں خوفزدہ اور دہشت زدہ کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے والی فوج ان سے اسلامی تہذیب سے برات کا اظہار کرنے کا مطالبہ کرتی تھی یہ مسلمانوں کے خلاف صریح اعلان جنگ تھا اس آپریشن کا مقصد ایک جملے میں یوں بیان کیا جاتا تھا کہ "اسلام کو ترک کر دو یا ملک چھوڑ جاؤ" جب اس آپریشن میں شدت آئی تو یہ مقصد یوں بیان کیا جانے لگا کہ اسلام کو ترک کر دو یا ختم ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مسلمانوں کو ایک بار پھر کاشتکاری

سے منع کر دیا گیا۔ مسلم خواتین کو حکم دیا گیا کہ وہ پردہ نہ کریں اور حجاب کا استعمال بند کر دیں۔ داڑھی والے مسلمانوں کو دوران سفر اور کاروبار مسلح فوجی دستوں کے ہاتھوں سخت مار پیٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس طرح ان کی نقل و حرکت مکمل طور پر روک دی جاتی تھی۔ جو خواتین حجاب اوڑھتی تھیں انہیں تنگ کیا جاتا گرفتار کرکے خصوصی تفتیشی مراکز میں لے جا کر ذلیل و رسوا کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ اپنی نوخیز بچیوں کی شادیاں غیر مسلم سے کریں جس سے ان کا مقصد نام نہاد یکجہتی اور ہم آہنگی کا حاصل کرنا تھا۔ 1993 کے دوران بے شمار لڑکیوں کی بدھ افسروں سے زبردستی شادیاں کرائی گئیں ان کے والدین کو ٹارچر سیلوں میں لے جا کر تشدد کے ذریعے زبان بند رکھنے کا حکم دیا گیا۔ جن میں بیس افراد ہلاک بھی ہوئے۔ دیکھا جائے تو ریاستی دہشت گردی کے اعتبار سے برما میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا سلوک بھی ایک خوف ناک مثال ہے جس پر اسلامی بنیاد پرستی روکنے کے پردے میں عمل جاری ہے

انگش مسلمان اس تباہی کا تصور کرنا بھی مشکل ہے جو انگش مسلمانوں پر اکتوبر 92 کے آخری ہفتے میں مسلط کر دی گئی تھی۔ ان کے تمام دیہات تباہ کر دیئے گئے۔ اس زبردست تباہی کے برپا کرنے کے لیے روسی فوجوں نے ٹینکوں' بکتر بند گاڑیوں اور بلڈوزروں کی مدد حاصل کی تھی اب بھی وہاں مکانوں کے تباہ شدہ سلسلے کھنڈرات کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ان کے مکین تفقاز کے پہاڑی سلسلوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے۔ انگش مسلمانوں کی داستان غم 1940 سے شروع ہوتی ہے۔ سٹالن نے شمالی اوسیتیا کے مسلمانوں کو زبردستی غلام بنا لیا تھا پھر علاقے کو روسی فیڈریشن کا حصہ قرار دے دیا گیا۔ انگشیا شمالی اوسیتیا کے زیر اثر آ گیا۔ جون 1991 میں روسی پارلیمان نے اعلان کیا کہ انگش عوام کو اپنی خود مختار ریاست کا حق حاصل ہے۔ اس سے انگش اور اوسیتیا نے یہ سمجھا کہ سرحدوں کے از سر نو تعین کی بات کی گئی ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ تصادم کے لیے راہیں ہموار کی جا رہی ہیں جس کے بعد ان کی سرکوبی کی خطرناک مہم شروع ہو گی۔ اوسیتیا کی فوجوں نے اکتوبر کے آخر میں خونریز حملے کر کے انگش مسلمانوں کو شہید کرنا شروع کر دیا۔ انگش مسلمانوں نے اپنے دیہات کی طرف آنے والے راستوں میں رکاوٹیں کھڑی کر کے ان

حملوں کو روکنا چاہا۔ لیکن انگش مسلمان خود کو اوسیتیا کی تربیت یافتہ افواج اور ان کے جدید اسلحہ کی ہلاک خیزی سے نہ بچا سکے اور انکے متعدد گاؤں صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔

اگر اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انگش کے مسلمانوں نے جارحیت میں پہل کی تھی۔ یہ وہ موقف ہے جسے روس نے بڑی کامیابی سے دنیا میں پیش کیا۔ اوسیتیا نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔ دونوں نے کہا کہ یہ کارروائی اوسیتیا کو بچانے کے لیے کی جا رہی ہے روسی فوجیں علاقے میں یہ کہ کر داخل ہو گئیں اوسیتیا اور انگش فوجوں کو الگ الگ کرنا مقصود ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ انگش مسلمانوں کا مسئلہ یہ تھا کہ نہ تو ان کے پاس سیاسی اور فوجی قیادت تھی اور نہ ہی ان کی کوئی باقاعدہ فوج تھی۔ چنانچہ چند دنوں کے اندر اندر قتل و غارت' تباہی و بربادی اور ظلم و ستم کا بازار گرم کیا گیا پچاس ہزار مسلمان اپنا گھربار چھوڑنے اور پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے۔ ان گھروں کو لوٹنے کے بعد آگ لگا دی گئی اور یہ گاؤں کئی دن جلتے رہے۔ اس دوران میں تین سو سے زیادہ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ سیاحوں نے انگش مسلمانوں کی بہت سی ایسی لاشیں بھی دیکھیں جنہیں قتل کرنے کے بعد چیر پھاڑ دیا گیا تھا۔ لندن کے انگریزی جریدے اکانومسٹ کے نمائندے نے پہاڑوں کا دورہ کیا اور ایک تنگ سی جگہ پر بیس پناہ گزینوں کو دیکھا اس کو ایک روسی فوجی نے بتایا کہ اس نے مردوں اور عورتوں کے ایک بہت بڑے قافلے کو ان پہاڑوں میں منتقل ہونے میں مدد دی تھی جن میں سے بعض پہاڑوں سے پھسل کر ہلاک ہو گئے۔

ایک معذور مسلمان ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے اپنی وہیل چیئر پر ہی فرار ہونا پڑا۔ روسی فوجوں نے اسے کسی قسم کی ادویات یا رقم ساتھ لینے سے زبردستی روک دیا اس کی بیوی دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئی اس کے سات میں سے تین کم سن بچے اس کے ہمراہ رہ گئے اسے یہ علم نہیں ہو سکا کہ اس کے بقیہ چار بچے کہاں اور کس حال میں ہیں؟

پناہ گزینوں نے نمائندے سے کہا کہ روسی فوجی ان کی تباہی کے ذمہ دار ہیں ان کے اس بیان کو روسی افسروں کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ روس اوسیتیا کی حمایت کر رہا ہے حقیقت یہ تھی کہ روس عملی طور پر اور انگش مسلمانوں کے قتل عام میں حصہ لے رہا تھا۔ ایک روسی صحافی کو اس بارے میں ساری صورت حال بیان کرنے سے روک

دیا گیا۔ روس کے فوجیوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ قفقاز کے پہاڑی سلسلے میں مسلمانوں کی فیڈریشن کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ روس سے آزادی کی قیمت اسی شکل میں ادا کرنا ہو گی۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ روس سے الگ ہونے والی اور الگ تشخص رکھنے کی خواہش مند تمام ریاستوں کو مطلع کر دیا جائے کہ ان کا حشر بھی اسی طرح ہو سکتا ہے۔

تاجکستان کے مسلمان تاجکستان میں اسلامی حکومت کا راستہ روکنے کے لیے ازبکستان، قازقستان اور روس نے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی اور اسلامی حکومت کا تختہ الٹنے سے لے کر سابق کیمونسٹوں کو دوبارہ برسر اقتدار لانے کے عمل میں تیس ہزار مکان اور دیگر عمارتیں جلا دی گئیں اور تباہ کر دی گئیں۔ تقریباً" اسی ہزار مسلمان شہید ہوئے جبکہ ایک لاکھ سے زیادہ تاجک مسلمانوں کو افغانستان میں پناہ لینا پڑی۔ 6 اگست 93 کو روسی فوجوں نے تاجک افغان سرحد پر حملہ کرکے سو سے زیادہ مسلمانوں کو شہید اور ہزاروں کو زخمی کر دیا اور ہزاروں تاجک پھر سے افغانستان کے اندر پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے۔ 7 اگست روس کے صدر بورس یلسن نے تاجکستان میں مزید فوجیں بھیج دیں جس سے صورت حال مزید خراب ہو گئی۔ اس فیصلے کے لیے روس کے صدر بورس یلسن نے ہنگامی طور پر بلائی گئی ایک سربراہی کانفرنس میں قازق صدر نور سلطان نظربائیوف' کرغیرستان کے صدر اسکر اور ازبکستان کے صدر اسلام کریموف کو بھی اعتماد میں لیا۔

روسی فوجوں کو تاجکستان میں داخل کرنے کے لیے روس تاجک معاہدہ کرایا گیا جس کے بعد روسی فوجیں تیزی سے اس مسلم ملک میں داخل ہونے لگیں۔ ملک میں خونریز تصادم کرائے گئے۔ ستمبر1992 میں بورس یلسن نے کہا کہ وہ افغانستان سے آنے والے "دہشت گردوں " کے حملوں سے تاجکستان کو بچانے کے لئے اپنا کردار ادا کریں گے۔ کرغیرستان اور روسی صدور نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ اس امر میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیے کہ تاجکستان کو اسلامی بنیاد پرستی سے لاحق خطرات سے بچانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جائیں گے۔ تاجکستان میں حرکت نہضت اسلامی کے قائد شریف ہمت زادہ نے اپنے دورہ پاکستان کے دوران میں کہا کہ یہ جنگ "اسلامی بنیاد پرستی" کے خلاف نہیں بلکہ اسلام کے خلاف ہے۔

بھارت کے مسلمان بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک دردناک باب ہے۔ جس پر علیحدہ سے ایک جلد کی ضرورت ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف تشدد کی کارروائیوں کی ایک نامکمل تصویر یوں بھی بن سکتی ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے ہریجنوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کی ایک مختصر سی کہانی بھی مہذب دنیائے نوٹس میں لانا ضروری ہے۔ انڈیا ٹوڈے کی ۳۰ جون ۱۹۹۱ کی ایک رپورٹ میں صرف اترپردیش صوبہ میں ہریجنوں کے خلاف جرائم کی سال وار تفصیل دی گئی ہے۔

سال	قتل	شدید زخمی	عورتوں کی عصمت دری	نذر آتش	دیگر سنگین جرائم	عام نوعیت کے جرائم
1985	223	582	177	408	2745	12500
1986	270	754	229	489	2955	13382
1987	235	806	208	404	2695	12776
1988	267	817	228	315	3128	13559
1989	279	886	252	362	3425	13378

ایم وی کامتھ نے ڈیلی پائنیر لکھنؤ کی ۱۴ جون ۱۹۹۱ کی اشاعت میں لکھا کہ

"مسلسل قتل و غارت گردی نے ہمارے قومی کردار کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے تشدد کی کوکھ سے تشدد جنم لے رہا ہے۔ بمبئی میں شیو سینا کے لیڈر نے "تعمیری تشدد" کے لئے ایک مسلح ہندو سینا بنانے کی دھمکی دی ہے لیکن یہ کسی نے نہیں بتایا کہ تشدد اور تعمیر کا کیا جوڑ ہے؟"

اسی طرح ہندوستان ٹائمز کے ۳۰ جون کے شمارے میں شیلیش کمار سنگھ نے لکھا کہ

"اس وقت پورے ملک میں دہشت گردی تشدد وغیرہ موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کے قتل نے ہمارے ذہنوں میں ایک پھر گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے قتل کی یاد تازہ کر دی ہے حالانکہ ان تینوں گاندھیوں کے قتل کے اسباب بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاہم آزادی کے بعد سے تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے تو ان کا سیدھا سا تعلق ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ گاندھی جی اور اندرا گاندھی کے قاتلوں کو ایک طبقہ نے ہیرو کا درجہ دے رکھا ہے اس سلسلہ میں میرا

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا موجودہ جمہوری نظام تشدد اور بدعنوانیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہا ہے؟ ہندوستانی سیاست میں جرائم پیشہ افراد کا عمل دخل شروع ہو گیا ہے رائے دہندگی ایک بے معنی سی شے بن کے رہ گئی ہے انتخابات کے نتائج کو تشدد اور ہنگامہ آرائی کے بل بوتے پر اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے سیاسی پارٹیاں ٹکٹ کی تقسیم بھی زور بازو کا اعتبار کرتے ہوئے کرتی ہیں"

"اجودھیا میں مسجد مندر جھگڑے کو استعمال کر کے بھارتیہ جنتا پارٹی نے دراصل قوم پرستی اور مذہبی تبادل پر مبنی کانگریس آئی کے خلاف اپنا پروگرام عوام کے سامنے رکھا۔ لال کرشن ایڈوانی نے اس ہندو جاتی اتحاد کے پلیٹ فارم سے اعلان کیا کہ وہ ایک ہندو ریاست کے قیام کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یہ ریاست رام چندر کے نام پر قائم کی جائے گی۔ اس نے ہندوؤں کے اس خوف کا فائدہ اٹھایا کہ مسلمانوں میں "اسلامی بنیاد پرستی" کو فروغ مل رہا ہے۔ اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندو حکمرانوں سے ناراض ہیں جو بعض مواقع پر 12 کروڑ مسلمانوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کرتے ہیں (حکومت نے مسلمانوں کو روائتی اسلامی اصولوں کے مطابق شادی' طلاق جائیداد کے معاملات نپٹانے کی اجازت دے دی تھی)۔ 1990 میں بھی ایڈوانی نے ہندوؤں کو گرم کرنے کے لیے ایک کارواں کی قیادت کی تھی اور اجودھیا گیا تھا۔ اسے اجودھیا میں داخلے سے پہلے روک دیا گیا تھا۔ جس سے مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے جن میں ایک ہزار افراد مارے گئے۔ اس کی قیادت میں بی جے پی نے انتخابی کامیابی حاصل کی تھی"

(21 دسمبر 1992)

پروفیسر رانجی کٹھاری نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"کانگریسی حکومت نے اجودھیا میں مسجد کو شہید ہونے سے بچانے میں جس قدر سستی اور نا اہلی کا مظاہرہ کیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت بحرانی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے درکار صلاحیت اور عزم سے مکمل طور پر خالی ہے۔ بھارت کی حکمران جماعت میں اعتماد ختم ہو رہا ہے۔ یہ اعتماد اس وقت مزید کم لگتا ہے جب اس کا موازنہ اس اعتماد سے کیا جائے جو دہشت گردوں اور بنیاد پرستوں کو حاصل ہے"

(نیوز ویک۔ 21 دسمبر 1992)

مائیکل ایس سپرل نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ

"ہندو انتہا پسندی اور تشدد کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ انتہا پسند 19 صدی سے بابری مسجد کے خلاف حالت جنگ میں تھے۔ وہ اس کی موجودگی کو رام کی توہین قرار دیتے تھے۔ رام ان کے لیے اوتار کا درجہ رکھتا ہے۔

(ٹائم- 21 دسمبر 1992)

ہندو تجزیہ نگاروں نے کہا بھارت نے پہلے بھی اس قسم کے شدید دھچکے کھائے ہیں اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے اب بھی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ان تجزیہ نگاروں کا یہ رویہ بہت سی ان کہی باتیں بھی کہتا ہے۔ ہندو ازم کے احیاء کے بارے میں سٹیون سٹراسر نے لکھا کہ

"ہندو ازم کا جدید ایڈیشن خود کو جنگجو کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سیاسی ونگ کے نائب صدر کے آملکانی کا کہنا ہے "دنیا سوچتی ہے کہ بھارت ایک عدم تشدد کا پرچار کرنے والا ملک ہے یہ درست نہیں ہے۔ ہمارا کوئی دیوتا بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ ایل کے ایڈوانی نے نیوز ویک کے نمائندہ سے کہا کہ مذہبی فخر سے قوم مضبوط ہو گی اگر ایک سو اسی افراد بھی ہماری اس کوشش سے لسانی' ذاتی اور علاقائی وابستگیاں چھوڑ دیں اور ایک ہو جائیں تو ہم اسے ہندو جاتی کے اتحاد کا ایک عامل تصور کریں گے۔"

(نیوز ویک- 26 اپریل 1993)

12 مارچ 1993 کو بھارت کے شہر بمبئی میں پے درپے بم دھماکے ہوئے تو ان کا الزام مسلمانوں کے ایک خاندان پر لگایا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس کا تعلق پاکستان سے جوڑا اور مطالبہ کر دیا کہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دیا جائے۔ اس پر بھارت کے ایک ماہنامے نے اپنے ادارتی نوٹ میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"بمبئی کے بم دھماکوں کے بعد سب سے دلچسپ رول بھارتیہ جنتا پارٹی اور سنگھ پوار کا ہے ان دھماکوں کے معاً بعد بی جے پی نے اس کے تانے بانے پاکستان سے جوڑتے ہوئے اپنے دیرینہ مطالبے کو دھرایا ہے کہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دے دیا جائے۔ اگر کوئی ملک واقعی کھلم کھلا امن و آشتی کو درہم برہم کرنے میں ملوث پایا جاتا ہے تو یقیناً اس کے ساتھ عالمی سطح پر کارروائی ہونی چاہیے۔ لیکن اس کا مطالبہ بی جے پی کے پلیٹ فارم سے

آنا حیرت انگیز ہے۔ جو پارٹی خود ملک کو فاشزم کی راہ پر دھکیل چکی ہو اور جس نے گذشتہ تین ماہ کے دوران میں ملک میں ہزاروں معصوم جانوں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ لیا ہو وہ خود اس بات کی مستحق ہے کہ اسے دہشت گرد پارٹی قرار دے دیا جائے۔"

(افکار ملی۔ اپریل 1993)

بھارتی سیکولرازم کے اقدامات سے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ اس فضا سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ہنگاموں' تشدد اور لوٹ مار کے لیے تیار رہتی ہے۔ دہشت گردی کی ایک مستقل تلوار مسلمانوں کی گردن پر لٹکتی رہتی ہے جو کسی بھی وقت ہندو انتہا پسند راہنماؤں کے حکم پر گرتی ہے اور مسلمانوں کو خاک و خون میں تڑپتا چھوڑ کر کوئی اور گردن تلاش کرتی ہے۔ ان فسادات میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بھی اپنا حصہ ادا کرتے ہیں بابری مسجد کے بعد کے واقعات میں باقاعدہ مشاہدے میں ایسے حالات آئے جب آر ایس ایس کے لوگ مسلمانوں کو کرفیو کے دنوں میں گھروں سے باہر نکالتے اور ان پر حملہ آور ہوتے اور ان کے پیچھے پیچھے بھارتی فوج اور نیم فوجی دستے کرفیو بحال رکھنے کی آڑ میں ان کا بے دریغ قتل عام کرتے رہے۔

مسلمانان بوسنیا پر کیا گذری؟ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد روس نے جغرافیائی اور سیاسی مفادات کے لئے سربیا کو جنگ بلقان شروع کرنے کا اشارہ دیا تھا تاکہ ایک طرف عظیم تر سربیا کے لیے راہ ہموار ہو سکے اور دوسری طرف یورپ میں جنگ کے ذریعے وہ مقاصد حاصل ہو سکیں جو پر امن حالات میں ممکن نہیں تھے۔ بوسنیا کے خلاف یہ جنگ اہل یورپ کی مشترکہ جنگ میں تبدیل ہو گئی جس کے ذریعے یورپ کے اندر ایک اسلامی ریاست کے قیام کے امکانات کا خاتمہ کرنا تھا۔ بوسنیا کے مسلمانوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ انسانی زندگی کے لیے ضروری ہر شرط کو فراموش کر دیں۔ انہیں گھاس ابال کے کھانے' لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہ کر پانی لینے پر اس حالت میں مجبور کر دیا گیا کہ کسی بھی وقت کسی مارٹر کا گولا' نقاب پوش سربوں کا حملہ انہیں تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ سرائیوو کے کئی دنوں سے بھوکے مسلمانوں کو یہ کہہ کے ایک میدان میں جمع کیا گیا کہ ان کے لیے ڈبل روٹی آئی ہے۔ جب وہ بد قسمت اکٹھے ہوئے تو مشین گنوں کے بھیانک فائروں نے انہیں زندگی کی قید سے ہی آزاد کر دیا۔ ان تمام حالات کے باوجود بوسنیائی عوام نے مسلسل مزاحمت جاری

رکھی اور سخت ترین ناسامد حالات کا سامنا کیا۔ انہوں نے لڑے بغیر سربوں اور کروٹوں کی وحشیانہ غلامی قبول کرنے سے انکار کیا اور اس پر قائم رہے۔ ان کی اس حالت زار پر اقوام متحدہ نے قرار دادیں پاس کیں۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم بھی قرار دادیں پاس کرتی رہی امریکہ سربوں کو فضائی حملوں کی دھمکیاں دیتا رہا۔ نیٹو بمباری کے لیے نقشے تیار کرتا رہا۔ تھیچر کارٹر' ریگن اور شلز جیسے لیڈر فوجی کارروائی کا مطالبہ کرتے رہے۔ لیکن دنیا بزدلوں کی طرح تماشا دیکھتی رہی۔ دنیا کہتی رہی نسلی صفائی ہو رہی ہے۔ اجتماعی عصمت دری ہو رہی ہے۔ کیمپوں میں انسان ذبح کئے جا رہے ہیں لیکن مغرب کی نظروں میں شاید یہ دہشت گردی نہیں تھی اور نہ ہو گی۔

"سرب اب اس حقیقت کو خفیہ رکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ بوسنیا کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا منصوبہ بن چکا ہے۔ سرب حکومت کے ایک حامی اخبار اپوخا " EPOKHA" کا اعتراف بہت اہم ہے کہ سربوں کے لیڈر اس بات پر کھلے عام فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے بوسنیا کے ایک بڑے علاقے کو مسلمانوں کی اکثریت اور کروٹوں کی اقلیت سے صاف کر دیا ہے۔

نازی طرز کے موت کے کیمپوں کی خبروں نے دنیا بھر میں انسانوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے جس سے مجبور ہو کر حکومتوں نے چند آنسو مگرمچھ کے ضرور بہائے ہیں۔ وہ ادھر ادھر کی ہانکتے' امدادی سرگرمیوں اور مہاجرین کے حق میں بولتے ہیں لیکن مسئلے کی اصل بنیاد کو حل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ یورپ کو یہ خیال ہے کہ بوسینا کے مسلمانوں کی عدم موجودگی میں وہ زیادہ امیر بن جائے گا"۔

"یہ بہت دلچسپ صورت حال ہے اگر چہ یورپی برادری نے اس بحران میں بہت کم یورپی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یورپی ملکوں کے نام نہاد اختلافات اس طرح کے نہیں ہیں جو یہ فیصلہ نہ کرنے دیں کہ بوسنیا کے لوگوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔ برادری کے ارکان کو سب سے زیادہ تشویش تو اس بات پر ہے کہ مہاجرین کی وسیع پیمانے پر نقل و حرکت کے فوری نتائج کیا نکل سکتے ہیں۔ کون کتنی تعداد میں مہاجر لے گا اور ان کے اخراجات کون ادا کرے گا؟ اس کے علاوہ یورپی برادری یا یورپ کو اس

معاملے سے کوئی سروکار نہیں وہ نہیں چاہتے کہ سابق یوگو سلاویہ میں پر امن اور منظم صورت حال آئے وہ صرف امن اور سکون کی باتیں ہی کرتے رہیں گے۔ یوں لگتا ہے کہ یورپ کی پالیسی وہی ہے جو اس وقت برادری کے برطانوی صدر نے بیان کی ہے اس وقت اصل خطرہ تو اسلامی بنیاد پرستی سے ہے۔ مسلم سے مراد بنیاد پرست ہے اور بنیاد پرست تو جنونی ہوتا ہے"

سرب لوگوں کو شکست کے اس گہرے احساس نے گھیر رکھا ہے جو صدیوں قبل انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی اور بہتوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جنوبی سلاف نسل موجودہ بوسنیا کو انارکی کا سبب قرار دے کر ختم کرنا چاہتی ہے۔ ان کے خیال میں "بوسنیائی نسل" وہ نسل ہے جس کی مکمل صفائی ہی دلی تسکین کا سبب ہے۔ صرف اسی پالیسی سے ان 65 فیصد بوسنیائی علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے حیوانی سلوک کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے جن پر سربوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ہزاروں مسلم نوجوانوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ اکثر اب بھی کیمپوں میں موت و زیست کی جنگ میں مصروف ہیں۔ ان قیدیوں کی باقی ماندہ مسلم آبادی کو دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ان پر مظالم اس قدر کئے جاتے ہیں جن کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں زبردستی گھربار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

کنسنٹریشن کیمپ اب کوئی راز نہیں رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے میز پر مئی کی ایک رپورٹ موجود ہے جو اقوام متحدہ کی حفاظتی فوج نے تیار کی ہے۔ اس کے مندرجات اب (اگست میں) لوگوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ ان کیمپوں میں قابل رحم حالت میں رہنے والوں کے حالات سب سے پہلے امریکہ کے ایک روز نامے نیوز ڈے نے 2 اگست 92 کی اشاعت میں بیان کئے تھے۔ جن میں اومار سکا کیمپ سے نجات پانے والے ترپن سالہ ایلینا لو زیدوچ نے اخباری نمائندوں کو بتایا تھا کہ صرف اس کیمپ میں مئی کے وسط سے لے کر جون کے وسط تک 350 انسانوں کو ہلاک کیا گیا تھا۔ ایک اور قیدی تریسٹھ سالہ میہو کا کہنا ہے کہ سرب روزانہ 10 سے پندرہ مسلمانوں کے گروپ کو ایک ندی کے کنارے لے جا کر ہلاک کر دیتے تھے۔

ایسے مواقع بھی آئے کہ ان کیمپوں میں رہنے والوں کو کئی کئی دن کھانے کے لیے کچھ

نہ دیا گیا بہت سے بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گئے دوسروں نے گھاس کھا کر جان بچائی۔ دوسرے صحافیوں کی رپورٹنگ سے پتہ چلا کہ نیوز ڈے میں جو کچھ شائع ہوا وہ بوسنیا کے مسلمانوں پر توڑنے جانے والے ظلم کے پہاڑ کا ایک ہلکا سا اشارہ تھا۔ یہ نام نہاد کیمپ دراصل موت کے کیمپ تھے بوسنیا میں اب بھی سرب فوجیں ایسے 57 کیمپ قائم رکھے ہوئے ہیں جن میں ستر ہزار بوسنیائی قید ہیں ان میں چند کروٹ بھی ہیں"۔ 18

عورتوں کے ساتھ ہونے والے جرائم کے بارے میں 28 ستمبر 1992 کو وومن گروپ نے زغرب میں جو رپورٹ شائع کی اس میں کہا گیا تھا کہ

"جس وقت دنیا نازی سٹائل کے موت کے کیمپوں کے واقعات پڑھ اور سن رہی تھی اور مظالم کی شدت سے کانپ کانپ جاتی تھی ہم بوسنیا ہرزی گووینا اور کروشیا کے مقبوضات میں عورتوں اور بچوں کے لئے قائم کئے گئے موت کے کیمپوں اور اجتماعی عصمت دری کے مراکز کی تحقیقات کر رہے تھے........ اجتماعی آبروریزی اور موت کے کیمپوں کے بارے میں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ انہیں ایک "حتمی حل" کے طور پر وسیع پیمانے پر قتل عام کے ذریعے کے طور پر اختیار کیا گیا........ بوسنیا میں ان کیمپوں کو محض آبروریزی اور جنسی تشدد کے کیمپوں کے طور پر ہی نہیں لیا جا سکتا بلکہ ان کی ایک اور حیثیت یہ تھی کہ یہاں سے "نسلی صفائی" کے کام کو منظم کیا جائے تاکہ مسلم اور کروٹ قوموں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ جدید انسانی تاریخ میں کسی قوم کو ختم کرنے کے اس طریقے کی پہلی مثال صرف نازی دور میں ملتی ہے۔

سربوں کا منصوبہ تھا کہ نسلی صفائی کے اجتماعی آبروریزی کے طریقے سے یورپی نسل تبدیل کی جائے جس کے لیے بوسنیا میں سو کے قریب کیمپ قائم کئے گئے اور پندرہ لاکھ مسلمانوں کو بوسنیا چھوڑنے پر مجبور کرنا بھی ایک ہدف تھا۔ بوسنیا کے تمام علاقوں سے ایک لاکھ بیس ہزار افراد کو ان کیمپوں میں لایا گیا جو کہ سرب جنگ منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

گرفتار شدگان کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا پہلے گروپ میں ان لوگوں کو رکھا گیا تھا جو اہم افراد کے طور پر یا مقامی طور پر اقتدار میں رہنے والے افرد کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ دوسرے گروپ میں اہم دانش ور شامل کئے گئے تیسرے گروپ میں وہ افراد یا

شہری تھے جن سے زیادہ "خطرہ" نہیں تھا۔ پہلے اور دوسرے گروپ کے افراد کو تشدد کر کے ختم کر دیا جاتا تھا کیوں کہ وہ ان نسلی گروپوں کے زیادہ اہم اور ممتاز افراد اور تعلیم یافتہ لوگ تھے جو اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے ان کا خاتمہ نسلی صفائی کے لیے لازمی شرط تھا۔ ایک قوم کی نسلی، تہذیبی اور قومی حیثیت کے خاتمے کے لیے ان دانشوروں کا وجود ختم کرنا ضروری تھا۔ تیسرے گروپ کے لوگ زیادہ تر دیہی علاقوں کے شہری تھے۔ ان میں سے بہت سے ناموں سے عالمی تنظیموں کو آگاہی ملی ہے تاہم ان قیدیوں میں سے ایک بہت بڑی تعداد خواتین کی تھی جن میں سے ایک بڑی تعداد کا علم نہیں کہ وہ کہاں گئی۔"

برطانیہ کے سابق وزیر دفاع ایلن کلارک نے اس جارحیت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا کہ

"اسے تضاد فکر کہیے کہ بوسنیا کے لوگ آخر کار یورپی تھے سلاف تھے لیکن وہ ترکی النسل ہرگز نہیں تھے۔ ترکی بہت محتاط تھا اس لیے کہ بعض حصوں نے بوسنیا کے لوگوں کو مغرب میں "بنیاد پرست" قرار دے دیا تھا ایسا اس لیے کیا گیا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے یورپی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ اپنی مملکت کی یکجہتی اور خود مختاری پر کوئی سودے بازی کے لیے تیار نہیں تھے اور اس طرح تیسرے درجے کے شہری بن کے نہیں رہنا چاہتے تھے۔" 20

انہوں نے مزید کہا کہ بوسنیا پر اب انکشاف ہوا ہے کہ عالم اسلام کی حکومتیں اخلاقی زوال کے انتہائی نچلے درجے تک جا چکی ہیں۔ اس میں خلیجی جنگ کے بعد تیزی آئی ہے۔

-1

"Terrorism and the Warfare of the Weak"

Martin Wollacott- The Guardian, 7 Nov. 1993

2- "دہشت پسندی" ______ افکار ملی - دہلی ستمبر 1993

-3

"The Message" International, October 1993

Lethal Weaponry by Omar Afzal

-4 نیوز ویک 12 جولائی 1993

-5

"Trade Centre Bombing - "Strategy of Tension"

Executive Intelligence Review (EIR)

-6

"Stepping up the Terror"

Newsweek - 30 August 1993

-7

"The Dark side of Islam"

Bruce W. Necan

Time - 4 October 1993

-8 ایضاً

-9 ایضاً

-10

"Waging War in the Workplace"

Newsweek - 19 July 1993

-12

"Striking the Past Itself"

Robert Huges

Time - 7 June, 1993

13- The News - 3 January, 1993

14- Dawn - 4 January, 1993

15- نیوز ویک 15 مارچ 1993ء

16- خبرو نظر 15 جولائی 1993ء

17- "اراکانی مسلمانوں کی جدوجہد آزادی"

محمد الیاس انصاری صفحہ 144-145

18-

"Genocide In Broad Day light"

Impact International, London

14 August, 1992

19- "EIR" - 15 January 1993

Pages - 35-36

20- The Guardian - 14 August 1992

آخری بات

"بنیاد پرستی اور تہذیبی کشمکش" میں جن پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور جن حالات پالیسیوں اور نکتہ ہائے نظر کو بیان کیا گیا ہے وہ سب بہت وسیع' بہت اہم اور دور رس نتائج کے حامل موضوعات ہیں۔ ان پر مسلسل کام کرنے' انسانی زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لینے' بدلتے حالات کے مطابق لائحہ عمل ترتیب دینے کے لئے کوئی نظام وضع کرنے کی ضرورت ہے اسلام ایک زندہ نظام ہے' ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں جاہلیت' عدم رواداری اور عدم مساوات ایسے منفی رویوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ علم و عمل' تحمل و برداشت' مساوات' انصاف اور انسانی مسائل کے بروقت حل سے متعلق رویوں کو مثبت تعمیری اور مستقل بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اس میں زمانہ جاہلیت کی پرستش کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اسلام آنے کے بعد انسان کے لئے لازمی ہے کہ وہ اسے ضابطہ حیات' قرآن حکیم کو الہامی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسوہ حسنہ مانے اور اس پر عمل پیرا ہو تاکہ اس کی زندگی اعتدال کی زندگی بنے' وہ انتہا پسندی سے بچ سکے اور اللہ کی راہ میں آگے بڑھے۔

یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ بنیاد پرستی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ ایک تہذیبی حملہ ہی نہیں بلکہ ایک بدعت ہے جو اسلام کو اس کے خوبصورت حوالوں سے محروم کر کے شکوک و شبہات کی راہیں کھولنا چاہتی ہے۔

اس سے مسلسل کشمکش رکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے یہ رویہ غیر اسلامی ہے اور اسے اسی تناظر میں رکھنا چاہیے کوئی مسلمان بنیاد پرست نہیں ہوتا وہ فقط مسلمان ہوتا ہے عقیدہ اور عمل اس کے لئے معیار ہیں جبکہ اس کے ایمان کی کیفیت کا اصل علم صرف اللہ کو ہے اگر کوئی مسلمان یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ بنیاد پرست کہلوا کر خود کو زیادہ سچا مسلمان قرار دلوا سکتا ہے تو اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ اسلام کے اصل مقصود کو وہ نہیں پا سکا ہے اس کا کام اسلام کے اصولوں کے مطابق عمل کرنا ہے اسلام یا اس کے پیروکاروں کے لئے قانون وضع کرنا نہیں ہے۔ یہ طے کرنا اس کا کام نہیں کہ کس کا ایمان کس درجے کا ہے یہ اللہ کا کام ہے جس میں مداخلت انسانی حق نہیں ہے۔

مجھے امید ہے کہ میری کاوش مثبت مباحث کا سبب بنے گی اور ان کے ذریعے امت مسلمہ بالعموم اور اردو دان طبقہ میں بالخصوص سوچ کی راہیں تلاش کرنے اور مسلمانوں کو اغیار کی صف بندی سے آگاہ کرنے میں مدد مل سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کے کام کے لئے صحیح راہنمائی فراہم کرتا ہے دعا ہے کہ وہ آئندہ بھی یہ راہنمائی ہمیں عطا کرتا رہے۔ (آمین)
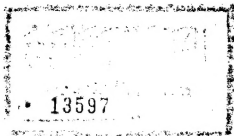
ہماری دیگر مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
سرورِ عالمؐ کی چند انقلاب آفریں آیتیں	محمد کلیم ارائیں	-/۵۴
معجزاتِ سرورِ عالمؐ	ولید الاعظمی، ترجمہ حافظ محمد ادریس	-/۴۸
رسولِ رحمتؐ تلواروں کے سائے میں (مجلد)	حافظ محمد ادریس	-/۷۵
وفودِ عرب بارگاہِ نبویؐ میں (مجلد)	طالب الہاشمی	-/۶۹
سیرت حضرت ابوہریرہ رضؓ (مجلد)	؍؍	-/۸۴
حضرت عثمان غنی رضؓ محافظِ اُمت	ابن عبد الشکور	-/۴۰
حضرت علیؓ فاتحِ خیبر	علی اصغر چودھری	-/۳۶
حضرت عبد اللہؓ بن عمرو بن العاص	ابن عبد الشکور	-/۲۰
سیرت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ	علی اصغر چودھری	-/۲۱
سیرت حضرت بلال رضؓ	؍؍	-/۲۷
سیّد الانبیاءؐ کے والدِ گرامی		-/۳۶
اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ	ثریا بتول علوی	-/۵۴
اسلام میں خواتین کا کردار	عاصم نعمانی	-/۱۸
انسانیت کی تلاش	عبد الحمید صدیقی	-/۳۶
کارکن کی یادداشتیں (مجلد)	شفیق الاسلام فاروقی	-/۱۲۵
مسلمان قاضیوں کا بے لاگ عدل	سید عبد الصبور طارق	-/۴۵
جدید فقہی مسائل	مولانا سیف اللہ رحمانی	-/۶۶
سید مودودی پرُعزم زندگی گمنام گوشے	محمد حسین	-/۳۶
اسلام جس سے مجھے عشق ہے	عبد اللہ اڈیار (بھارتی نومسلم)	-/۱۲
اجتہاد اور اوصافِ مجتہد	مولانا گوہر رحمٰن	-/۱۸
عظمت کے مینار	شفیق الاسلام فاروقی ؍؍	-/۴۲